فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (16)

سندھ نمبر

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

مشاورتی بورڈ

پروفیسر حمزہ علوی

قاضی جاوید

ڈاکٹر سید جعفر احمد

سعود الحسن خان
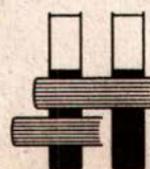
مجلّہ ''تاریخ'' کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف- برج کالونی۔ لاہور کینٹ

فون: 6665997

ای میل: lena@brain.net.pk.

خط و کتابت (برائے سرکیولیشن)

فکشن ہاؤس

18-مزنگ روڈ، لاہور

فون 7249218-7237430

قیمت فی شمارہ 100 روپے

سالانہ 400 روپے

قیمت مجلد شمارہ 150 روپے

بیرون ممالک 2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)

رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

اہتمام ظہور احمد خاں/ رانا عبدالرحمٰن

معاون ایم سرور

کمپوزنگ فکشن کمپوزنگ سنٹر، لاہور

پرنٹرز زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت جنوری 2003ء

فہرست

دیباچہ		5

مضامین

خطبہ استقبالیہ	ڈاکٹر مبارک علی	9
سندھ کی تاریخ نویسی: ایک تجزیہ	ڈاکٹر مبارک علی	13
وادی سندھ کی تہذیب: معاشرت	محمد ادریس صدیقی	30
عربوں کی فتح سندھ	ڈاکٹر مبارک علی	50
عہد قدیم سے آغاز اقتدار مغلیہ تک		
سندھ کی تجارت کا مختصر جائزہ	سی ایل ماڑی والا	55
علاقائی تعلق سے سندھ کی معیشت اور معاشرہ	کلارڈ مارکووٹس	80
سندھ 1690 سے 1760 تک مغل جھرمٹ کی جگمگ	ایچ۔ ٹی۔ سورلے	113
سندھ میں ولندیزی تجارت: تاریخی پس منظر	مظہر یوسف	147
سندھ میں سمہ دور: عروج اور زوال	ڈاکٹر تنویر جونیجو	158
سکھر بیراج کی تعمیر اور اس کی اقتصادی اہمیت	پروفیسر اعجاز قریشی	179
الکزنڈر ہملٹن کے مشاہدات سندھ	الکزنڈر ہملٹن	195
سندھ دربار	ٹی پوسٹن	205
سندھی و مہاجر شناخت: تضادات و اشتراک	ڈاکٹر مبارک علی	221

تحقیق کے نئے زاویے

وادی سندھ کی تہذیب — ڈاکٹر مبارک علی — 229

نقطہ نظر

جلال الدین خوارزم شاہ: ہیرو یا لٹیرا — ڈاکٹر مبارک علی — 235

تاریخ کے بنیادی ماخذ

''چچ نامہ'' — 241

فارسی ترجمہ: علی کوفی

اردو ترجمہ: اختر رضوی

''تحفۃ الکرام'' — 251

مصنف: میر علی شیر قانع ٹھٹھوی

اردو ترجمہ: اختر رضوی

''تاریخ معصومی'' — 267

مصنف: میر محمد معصوم بکھری

اردو ترجمہ: اختر رضوی

اشاریہ: سہ ماہی ''تاریخ'' شمارہ 1 تا 15 — 280

دیباچہ

20 اکتوبر 2002ء میں سہ ماہی تاریخ کی جانب سے حیدرآباد سندھ میں ایک روزہ کانفرنس ''سندھ کی تاریخ'' پر سندھی لینگویج اتھارٹی کے ہال میں منعقد ہوئی۔ جس میں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کے انعقاد میں فکشن ہاؤس لاہور اور پروفیسر اعجاز قریشی کا تعاون تھا۔ جس کے لیے ادارہ تاریخ ان کا مشکور ہے۔

اس شمارہ میں وہ مضامین شامل ہیں کہ جو اس کانفرنس میں پڑھے گئے، مگر ساتھ ہی میں سندھ کی تاریخ سے متعلق دوسرے مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ سندھ کی تاریخ کے بارے میں واضح تصویر سامنے آ سکے۔ ادارہ اپنے ساتھیوں کا مشکور ہے کہ جو ہمارے لیے ترجمے کرتے ہیں اور تحقیقی کاموں میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

جنوری 2003ء

لاہور

مضامین

خطبہ استقبالیہ

ڈاکٹر مبارک علی

جب اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ تاریخ کیوں ضروری ہے؟ تو ذہن تھوڑی دیر کے لیے پریشان ضرور ہو جاتا ہے اور پھر اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور خود سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں تاریخ کا وہ کون سا کردار ہے جو اس نے اب تک ادا کیا ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اب تک تاریخ نے حکمراں طبقوں اور مراعات یافتہ لوگون کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اخلاقی و قانونی جواز فراہم کیے اور اسے نظریاتی بنیادیں فراہم کیں۔ ان طبقات نے تاریخ پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے خاندان' نسل' اور خون کی پاکیزگی کے نام پر لوگوں پر حکومت کی۔ ظاہر ہے کہ جب تاریخ کا یہ کردار ہو جائے تو اس تاریخ سے عام لوگوں کو کیوں دلچسپی ہو؟ ان کے لیے تاریخ اسی وقت کارآمد دلچسپ اور ضروری ہو سکتی ہے جب اس میں ان کا ذکر ہو اور تاریخ کی تشکیل میں ان کے حصہ و کردار کا بیان ہو۔

کیونکہ تاریخ میں دو کردار اہم ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تاریخ کی تشکیل میں عملی حصہ لیتے ہیں دوسرے وہ جو تاریخی عمل اور واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ اب تک تو یہی ہوتا رہا ہے کہ جب بھی تاریخ کی تشکیل میں کرداروں کا بیان ہوتا ہے تو ان میں حکمراں و سیاستدان سرفہرست ہوتے ہیں دانشور و مفکرین کو حاشیہ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے تو وہ تاریخ کے صفحات سے غائب ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب مورخ ہمارے ماضی کی تاریخ لکھتا ہے تو وہ ان ہی حکمراں اور بالادست طبقوں کی تاریخ لکھتا ہے۔ جب تاریخ کو اس نقطہ نظر سے پڑھا جاتا ہے تو یہ ایک

ایسے شعور کو پیدا کرتی ہے کہ جو نا پختہ اور سطحی ہوتا ہے۔ یہ وہ وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں تاریخ کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔

جمہوری معاشروں میں اب جو نئی تاریخ لکھی جارہی ہے وہ ان لوگوں کو تاریخ کا حصہ بنا رہی ہے جو اب تک معاشرے سے دور تھے۔ مگر جہاں جہاں ابھی آمرانہ طرز حکومت ہے' وہاں تاریخ ابھی بھی محدود ہو کر صاحب اقتدار طبقات کے لیے رہ جاتی ہے۔ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اس کی تاریخ شخصیتوں اور ان کے کارناموں تک محدود ہے۔ آمرانہ حکومتوں نے تاریخ کو محض اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے' اس لیے تاریخ سے لوگوں کا اعتبار ختم ہو گیا ہے۔

اب ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے کہ تاریخ کسی بھی معاشرے کے لیے کیوں ضروری ہے؟ تاریخ کی آگہی کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک واقعات کے بارے میں علم' دوسرا یہ کہ واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں کیا کہا جاتا ہے؟ ان کی تشریح اور توضیح کیسے کی جاتی ہے؟ اگر واقعات کو محض سنہ وار بیان کر دیا جائے تو اس سے تاریخ کے بارے میں معلومات تو مل جائیں گی۔ لیکن تاریخی شعور اس وقت تک نہیں پیدا ہوگا جب تک کہ ان کی تہہ میں ہونے والے اسباب' وجوہات اور عوامل کا تجزیہ نہیں کیا جائے۔ جب تاریخ کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیکھا جاتا ہے تو اس سے واقعات کے بارے میں صحیح آگہی پیدا ہوتی ہے اور ان سوالات کا جواب ملتا ہے کہ اس تاریخی عمل میں کن طبقات کے مفادات پوشیدہ تھے' اور کس نے اس عمل سے فائدہ اٹھایا اس موقع پر ہم تاریخ نویسی میں ان رجحانات کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ جو تاریخ کی تشکیل میں عمل پیرا تھے' مثلاً قوم پرستی' فرقہ واریت' سیکولرازم اور عوامی نقطہ نظر سے لکھی جانے والی تاریخ اس تناظر میں ہم یہ بھی تجزیہ کر سکتے ہیں کہ اہل یورپ کیوں اپنی تاریخ ''یورپی مرکزیت'' (Eurocentrism) کے نقطہ نظر سے لکھ رہے ہیں۔ کیونکہ یورپ کو اس وقت جو برتری حاصل ہے اس کا اظہار ان کی تاریخ نویسی میں موجود ہے' وہ اپنی ترقی اور نسلی برتری کو ''یورپی معجزہ'' اور ''یورپی کردار کی خصوصیات'' کو قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل ہے کہ یورپی تاریخ خط مستقیم ہے جب کہ مشرقی تاریخ ایک ہی سرکل میں محو گردش ہے۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یورپ تبدیلی کو قبول کرتے ہوئے برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ جب کہ مشرق کی تاریخ ایک ہی سرکل میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اس لیے ان کے ہاں ترقی نہیں ہے بلکہ ایک دائرہ ہے کہ جس میں وہ

متحرک ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ مشرق اسی وقت ترقی کر سکتا ہے کہ جب وہ یورپ کے ماڈل کو اختیار کرے اور اپنی حرکت کی سمت کو تبدیل کرے۔

کیا یہ نقطہ نظر صحیح ہے؟ یہ مشرق کے مورخوں کے لیے ایک چیلنج ہے۔اس کا جواب دوسرے ملکوں کے مورخوں نے تو دیا ہے' مگر پاکستانی مورخوں سے ہمیں اس سوال کے جواب کا انتظار ہے۔

تاریخ کی تشکیل میں دو اہم عناصر کام کرتے ہیں: خیالات و افکار اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرگرم گروہ اور جماعتیں۔اس لیے تھیوری اور عمل دونوں کے اشتراک سے تاریخ تبدیل ہوتی ہے اور آگے کی جانب بڑھتی ہے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دانشور اور مفکر معاشرے کی تبدیلی کے لیے ایک لائحہ عمل اور منصوبہ پیش کرتے ہیں مگر اس کو عملی شکل دینے والے نہیں ہوتے تو یہ منصوبہ یوٹوپیا بن کر رہ جاتا ہے۔اسی طرح اگر کارکن اور متحرک گروہ تبدیلی کے لیے جدوجہد یا بغاوت کرتے ہیں یا آواز اٹھاتے ہیں۔مگر ان کے عمل سے جڑا کوئی منصوبہ اور فکری سرمایہ نہیں ہوتا ہے تو یہ محض انتشار اور افراتفری پیدا کر کے ختم ہو جاتا ہے۔تبدیلی کی کامیابی کا انحصار فکر اور عمل دونوں کے ملاپ میں ہے۔

اس لیے مورخوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کا تجزیہ کریں کہ معاشرے میں تبدیلی کے ایجنٹ کون سے گروہ اور جماعتیں ہیں۔کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ صاحب اقتدار طبقے تبدیلی کے سب سے بڑے مخالف ہوتے ہیں اور حالات کو ایک ہی شکل میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں' کیونکہ تبدیلی ان کی حیثیت اور مراعات کو متاثر کرتی ہے۔اس لیے معاشرہ میں تبدیلی کے ایجنٹ وہ ہوتے ہیں کہ جن کا تعلق محروم طبقوں سے ہوتا ہے اگر انہیں ایک لائحہ عمل دیا جائے اور اس بات پر متحرک کیا جائے کہ تبدیلی ان کی محرومیوں کا ازالہ کر سکتی ہے تو پھر یہی گروہ اور جماعتیں تاریخی عمل کو آگے کی جانب بڑھاتی ہیں۔تاریخ میں بغاوتوں کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ان بغاوتوں کے پس منظر میں تبدیلی کی زبردست خواہش ہوتی ہے۔یہ معاشرہ میں قدیم اور جدید کے درمیان تصادم کا اظہار ہوتی ہے۔تاریک کا یہ وہ اہم پہلو ہے کہ جس کو بیان کرنے اور جس اہمیت کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔یہ اپنی ناکامی اور شکست کے باوجود معاشرے کی ساخت کو تبدیل کرتی ہے۔

یہاں پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ فراموش شدہ اور محروم لوگوں کی تاریخ کیسے لکھی

جائے؟ ان کی سرگرمیوں کا مواد نہ تو سرکاری دستاویزات میں ہوتا ہے اور نہ ہی ہم عصر تاریخوں میں۔ اس کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے مورخوں نے اس کا حل ''زبانی تاریخ'' میں نکالا ہے۔ لوگون سے بات چیت گفتگو اور انٹرویوز کر کے ان واقعات کو از سر نو دریافت کیا جاتا ہے کہ نسل در نسل عام لوگوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں فوک ادب' داستانیں' قصہ کہانیاں اور دیومالائی واقعات معاون ثابت ہوتے ہیں۔ زبانی تاریخ کے ذریعہ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایسے گروہوں' قبیلوں' جماعتوں اور لوگوں کی تاریخ تشکیل دی جائے جو اب تک گمنامی میں تھی۔

پاکستان کے جہاں یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں اور جہاں تاریخ کو حکومتی اور نظریاتی نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے' ان حالات میں نجی تحقیقی اداروں کی ضرورت ہے کہ جو تاریخ میں ان پہلوؤں کو سامنے لائے کہ اب تک چھپے ہوئے ہیں۔ ایک ایسی تاریخ ہی معاشرہ میں حقیقی تاریخی شعور کو پیدا کر کے لوگوں میں اعتماد پیدا کرے گی۔

❁

سندھ کی تاریخ نویسی: ایک تجزیہ

ڈاکٹر مبارک علی

قوموں کو فاتحین کے ہاتھوں صرف میدان جنگ ہی میں شکست نہیں ہوتی ہے' بلکہ ان کی شکست فوجی سے زیادہ سماجی' ذہنی' تہذیبی اور معاشی طور پر ہوتی ہے جو ان کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اس ذہنی تبدیلی میں سب سے زیادہ اثر کرنے والا عنصر تاریخ نویسی کا ہوتا ہے جو اس انداز سے لکھی جاتی ہے کہ یہ مفتوح کو اس کی اپنی نظروں میں کم تر بنا دیتی ہے۔ فاتحین اپنی تاریخ نویسی میں مفتوح کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے کردار کو اپنے بنائے ہوئے فریم ورک میں ڈھال لیتے ہیں۔ اپنے حملے کے جواز میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں' ان میں فاتح انصاف پسند و عادل اور مفتوح ظالم و جابر ہوتا ہے' جب تاریخ کو اس طرح سے تشکیل دیا جاتا ہے تو فاتح مفتوحین کے لیے باعث رحمت بن جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ نہ صرف اپنے ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں۔ بلکہ اس پر شرمندہ بھی ہوتے ہیں۔

شکست کھانے کے بعد مفتوح کی جانب سے اپنے دفاع کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی ہے۔ اس لیے فاتحین جس تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں وہی تاریخ صحیح اور درست بن جاتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک عرصہ بعد اگر مفتوحین اپنے ملک کو آزاد کرا لیتے ہیں' تو وہ آزادی کے بعد اپنی تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل کرتے ہیں اور ان کا وہ ماضی جو کھو چکا تھا اس کی از سرنو دریافت کرتے ہیں' اس کے صحیح خدوخال سامنے لاتے ہیں' اپنے روایات و اقدار کو ابھارتے ہیں اور اس طرح اپنی قومی شناخت کو مضبوط کرتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس دوسری صورت بھی ہوتی ہے کہ شکست کے بعد مفتوح قومیں فاتحین کی

تہذیب وثقافت میں اس قدر ڈھل جاتی ہیں کہ اپنی اصلیت کو کھو دیتی ہیں اور ایک نئی شناخت کو پیدا کر لیتی ہیں۔ اس صورت میں فاتحین کی تاریخ ان کی اپنی ہو جاتی ہے اور بیرونی حملہ آور ان کے ہیرو ہو جاتے ہیں۔ جب یہ صورت حال ہو تو انہیں اپنے قدیم ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے وہ اسے فراموش کر کے اپنے رشتے اس دور اور عہد سے ملا لیتے ہیں کہ جب فاتحین نے ان کے ملک پر حملہ کر کے قبضہ کیا تھا۔

اس صورت حال میں معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: ایک وہ جماعت کہ جو فاتحین کی تہذیب وثقافت کو تسلیم نہیں کرتی اور اپنی قدیمی شناخت کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرتی ہے' دوسری وہ جو قدیم ماضی سے رشتہ توڑ کر فاتحین کی تہذیب میں خود کو ضم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فاتحین کی تاریخ نویسی کے بارے میں وضاحت کر دی جائے کہ اس کی تشکیل میں کون کون سے اہم عناصر ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر فاتح کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے حملہ کو جائز قرار دے۔ اس لیے اس کا حملہ کسی نہ کسی ''مجبوری'' یا ''ضرورت'' کے تحت ہوتا ہے تا کہ اس صورت میں حملہ کا اخلاقی جواز فراہم ہو جائے۔ جب بھی حملہ کے دلائل دیئے جاتے ہیں۔ تو حملہ آور اپنے معاشی و سیاسی مقاصد کو چھپاتا ہے اور حملہ کی وجہ مفتوح قوم کی نااہلی' بدعنوانی' یا غداری کو دیتا ہے۔

حملے کے دلائل میں عام طور سے جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ مفتوح ملک کے سربراہ' حکمراں یا حکومت اپنی رعایا کے لیے ظالم و جابر ہوتی ہے جس کی وجہ سے ملک میں بدامنی اور لاقانونیت کا راج ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں رعایا حملہ آوروں کا ساتھ دیتی ہے' اور اپنے حکمرانوں سے نجات حاصل کر لیتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ فاتحین کی تاریخ میں عوام ان کا خیر مقدم کرتے ہیں' فتح میں ان کی مدد کرتے ہیں' ان کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرتے ہیں' ان کی فوجوں کے ساتھ لڑتے ہیں اور اپنے ملک کو غاصبوں سے آزاد کراتے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ فاتحین کا ملک فتح کرنا' وہاں کے لوگوں کی نجات کے لیے ضروری تھا۔ اس ضمن میں اکثر مفتوح قوم اور ان کے معاشرے کو زوال پذیر بتایا جاتا ہے۔ کہ جس کی وجہ سے سیاسی استحکام نہیں رہا تھا۔ اور ملک و قوم کی حالت دگرگوں تھی۔ سیاسی طاقت کے کمزور ہونے کی وجہ سے ملک میں خلاء تھا' جسے حملہ آوروں نے پر کیا۔ اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہوں نے نہ

صرف ملک میں سیاسی استحکام پیدا کیا' بلکہ ملک کے معاشی حالات کو سدھارا' بدعنوانیاں ختم کیں۔ لاقانونیت کا خاتمہ کیا اور لوگوں کو سکون واطمینان اور امن دیا۔

اس تاریخ نویسی کی ایک خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں جہاں اپنی بہادری اور شجاعت کا ذکر ہوتا ہے وہاں مفتوحین کو بزدل قرار نہیں دیا جاتا ہے بلکہ ان کی بہادری اور دلیری کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ثابت کیا جائے انہوں نے ملک کو بغیر لڑے اور مزاحمت کے فتح نہیں کیا' بلکہ ان کی فتح سخت مزاحمت اور خون ریز جنگوں کے بعد ہوئی۔ کیونکہ اس صورت میں انہیں بطور فاتح ملک پر قبضہ کرنے کا جواز مل جاتا ہے۔ پرامن طریقہ سے قبضہ کی صورت میں ان کے قبضہ کا جواز کمزور ہو جاتا ہے۔

(2)

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم چچ نامہ کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ یہ تاریخ عربوں کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس میں سندھ کے مفتوحین کو عربوں نے اپنی نظر سے دیکھ کر ان کے بارے میں رائے دی ہے۔ اس میں عرب حملہ آوروں کے حملے کے جواز میں جو دلائل دیئے گئے ہیں ان میں اولیت اس دلیل کو ہے کہ چچ کے خاندان میں حکومت غاصبانہ طور پر آئی۔ چچ نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سازش کے ذریعہ تخت وتاج پر قبضہ کر لیا۔ اس دلیل کے تحت ایک غاصب حکمراں گھرانہ ملک کا جائز وارث نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر اس سے حکومت چھین لی جائے تو یہ اخلاقی طور پر درست اور صحیح ہے۔

راجہ داہر کی تصویر کشی اس طرح سے کی گئی ہے کہ اس کی شخصیت کو اخلاقی طور پر کمزور بتایا جائے۔ اس نے حکومت کی لالچ اور اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اپنی بہن سے شادی کر لی۔ لہٰذا ایک ایسے شخص کا حکمراں ہونا ملک کے لیے باعث شرم تھا۔ اس دلیل کے تحت اگر ایک ایسے بداخلاق شخص کو تخت وتاج سے محروم کر دیا جائے تو اخلاقی اقدار کی سب سے بڑی فتح ہے۔

چچ نامہ میں محمد بن قاسم کے حملے کی وجہ عورتوں اور بچوں کی گرفتاری بتایا گیا ہے کہ جنہیں داہر کے آدمیوں نے سمندر میں پکڑ لیا تھا' لیکن ان وجوہات کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ جو سندھ پر قبضہ کے سلسلہ میں ابتدائے اسلام سے ہو رہی تھیں۔ ان مقاصد میں بحر ہند پر عربوں کا

تسلط کرنا سب سے اہم تھا' تا کہ ان کی تجارت بحری قزاقوں سے محفوظ ہو جائے۔

چچ نامہ میں عربوں اور سندھیوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کو حق و باطل کے درمیان مقابلہ کہا گیا ہے۔ ایک طرف حق' سچائی' عدل وانصاف تھا' تو دوسری طرف ظلم و جبر اور ناانصافی۔ راجہ داہر کے لیے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں' ان میں اسے ''داہر کافر' اور داہر لعین'' کہا گیا ہے۔ عربوں کی نظروں میں وہ کفر' گمراہی اور ظلمت کی علامت تھا۔ لہٰذا اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ عربوں کو تائید الٰہی حاصل تھی' جب کہ کافر اس سے محروم تھے اس لیے جب کافروں نے لشکر اسلام کو دغا اور فریب سے ختم کرنا چاہا تو اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مثلاً جب سندھ کے ایک سردار کاکہ بن کوتل نے لشکر اسلام پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا تو وہ راستہ سے بھٹک گیا اور ساری رات ادھر ادھر آوارہ پھرتا رہا۔ جب اس نے عربوں سے صلح کر لی تو اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ''جب ہم نے (شبخون کی ناکامی) کا یہ معجزہ بھی دیکھا تو ہمیں یقین ہو گیا (یہ بھی) حکم الٰہی ہے۔ اور کوئی بھی (تم سے) فریب اور دغابازی سے مقابلہ نہ کر سکے گا۔'' (چچ نامہ (اردو ترجمہ) حیدر آباد 1963' ص167)

چچ نامہ میں مفتوحین جگہ جگہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کے نجومیوں اور معتبر لوگوں نے یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ ان کا ملک عربوں کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ لہٰذا اس قسم کی پیشن گوئیوں کے بعد لوگوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ فاتحین کی اطاعت قبول کر لیں۔ مثلاً سردار کاکہ نے کہا کہ: ''ہمارے نجومیوں اور معتبر لوگوں نے علم نجوم سے نتائج اخذ کر کے یہ حکم صادر کیا ہے کہ یہ ملک اسلامی لشکر کے قبضہ میں آئے گا'' (چچ نامہ۔167)

چچ نامہ میں بار بار ان افراد اور گروہوں کا ذکر ہے کہ جو راجہ داہر کو چھوڑ کر محمد بن قاسم کی مدد کرتے ہیں۔ مثلاً دیبل شہر کے اس برہمن کا لشکر اسلام کی مدد کرنا کہ جس نے قلعہ کی فتح کا راز بتایا۔ ''امیر عادل سلامت رہے! ہمارے نجوم کی کتابوں میں اس طرح حکم ہے کہ ملک سندھ لشکر اسلام کے ہاتھوں فتح ہوگا اور کافر شکست کھائیں گے'' (چچ نامہ۔39)

اس میں برہمن محمد بن قاسم کو ''امیر عادل'' کہہ کر مخاطب ہے۔ عربی لشکر کو لشکر اسلام اور سندھیوں کے لشکر کو کافروں کا کہہ رہا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ الفاظ ایک موقع پرست اور خوشامدی کے ہیں یا مصنف نے اپنی طرف سے اس برہمن سے یہ کہلوایا ہے۔

چچ نامہ میں یہ بھی بار بار کہا گیا ہے کہ لشکر اسلام کو تائید الٰہی حاصل تھی۔ حجاج بن یوسف کے ایک خط کا حوالہ ہے کہ:

> دریا عبور کرو اور تائید الٰہی کی التجا کرتے رہو اور اس کی رحمت کو اپنی پناہ جانتے رہو ایک دوسرے کے مد مقابل ہونے کے وقت رضائے الٰہی پر اعتماد رکھتے ہوئے اپنی پوری شجاعت اور ہمت کا مظاہرہ کرنا کیونکہ فتح اور تائید (الٰہی) تمہارے ہمرکاب اور قدرت تمہارے ساتھ اور مددگار ہے اور فرشتوں کی امداد اور مسلمانوں کی تلوار تمہاری طرف سے ان (مخالفوں) پر مسلط ہے۔ خدائے عزوجل ان کی خبیث ذات کو مسلمانوں اور فرشتوں کی تلواروں اور نیزوں کی خوراک بنائے گا۔ غضب الٰہی (کا دروازہ) ان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے پورے انتقام اور عبرتناک انجام کے سزاوار ہوں گے۔ (چچ نامہ۔ 195)

لہٰذا عربوں کی فتح خدائی مرضی اور تائید سے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ملک خدا نے انہیں بخش دیا۔ جو ملک خدا کی مدد سے ملا ہو اس پر قبضہ کرنے اور اس کا مال غنیمت حاصل کرنا اور اس پر حکومت کرنا اخلاقی و مذہبی طور پر جائز ہو جاتا ہے۔ راجہ داہر کی شکست اور اس کا قتل اس تائید الٰہی کا مظہر تھا۔ (چچ نامہ۔ 201)

راجہ داہر سے جنگ کرنے کے لیے جب محمد بن قاسم دریا پار کر کے دوسری طرف جاتا ہے تو اپنے لشکر کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

> اے لشکر اسلام! اب مہران کا پانی تمہاری پشت پر ہے اور کافروں کا لشکر تم سے مقابلہ کے لیے آئے گا۔ جس کے دل میں واپس جانے کا خیال ہو وہ یہیں سے واپس چلا جائے کیونکہ (جسوقت) دشمن سامنے آئے گا اور جنگ شروع ہوگی اگر اس وقت کسی شخص نے منہ موڑا تو لشکر دل شکستہ ہو کر راہ فرار اختیار کرے گا۔ جس کی وجہ سے دشمن ہم پر غالب ہو جائے گا (اور یہ ہمارے لیے) بڑا ننگ ہوگا۔ بھاگنے والا حرام موت مرے گا۔ اور پھر آخرت کے عذاب میں گرفتار (ہوگا) (چچ نامہ۔ 219)

یہ تقریر اس واقعہ سے ملتی جلتی ہے کہ جس میں طارق بن زیاد نے کشتیاں جلا کر اپنی فوج کی ہمت افزائی کی تھی۔

چچ نامہ سندھ کی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ موجودہ دور میں مورخوں نے اس کا جو تجزیہ کیا ہے اور اس سے جو نتائج نکالے ہیں۔ ان کی روشنی میں اس کے بارے میں یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ یہ تاریخ اور دیومالائی واقعات کا مجموعہ ہے۔ چونکہ اس کا فارسی ترجمہ 1216ء میں ہوا' لہٰذا اس میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کا تعلق عربوں کے عہد سے نہیں بلکہ بعد کے دور سے ہے۔ مثلاً شحنہ کی اصطلاح سلجوقیوں کے دور سے شروع ہوئی اقطاع آل بویہ کے عہد سے مستعمل ہوا۔ گائے کی کھال میں مجرم کو سلوانے کی روایت منگولوں کی تھی۔

چچ نامہ کا ہیرو محمد بن قاسم 1920ء کی دہائی میں ایک بار پھر بحیثیت ہیرو کے اس وقت ابھرا کہ جب ہندوستان میں فرقہ واریت کا زور تھا۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کی جانب سے سندھ ''باب الاسلام'' بن گیا اور محمد بن قاسم نوجوان عظیم جنرل۔ 1947ء تک سندھ کی تاریخ کا یہی نقطہ نظر مسلمانوں میں مقبول رہا۔ یہ 1955ء میں ون یونٹ کے قیام اور سندھی نیشنل ازم کے ابھار کے بعد ٹوٹا۔ سندھ کی تاریخ نویسی میں سندھ کے ان مفتوحین کی آواز کو زندہ کیا گیا کہ جو عربوں کی فتح کے بعد سے خاموش تھی۔ اب محمد بن قاسم جارح اور حملہ آور ہو گیا اور داہر ہیرو۔ سندھ کی تاریخ کی یہ تشکیل نو اس لیے اہم ہے کہ اب یہ تاریخ 12-711 کے بجائے وادی سندھ کی تہذیب سے شروع ہونے لگی ہے۔ سندھ کا وہ قدیم ماضی جو باعث عبرت و شرم تھا' اب وہ قابل فخر ہو گیا ہے۔

(3)

سندھ کی تاریخ پر دوسری اہم کتاب میر محمد معصوم بکھری کی ''تاریخ معصومی'' ہے۔ میر معصوم اکبر بادشاہ کے امراء میں سے تھے۔ جو آخر عمر میں آ کر بکھر (سکھر) میں رہائش پذیر ہوئے' جہاں ان کی تعمیر کردہ عمارات اور ان کا مقبرہ ہے۔

ان کی تاریخ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کو عربوں کی فتح سندھ سے مغلوں کے فتح سندھ تک ایک تسلسل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ سومرا اور سمہ دور کے بارے میں بقول ان کے' مواد نہ ملنے کی وجہ سے وہ ان کی مکمل اور تفصیلی تاریخ نہیں لکھ سکے۔ جیسا کہ اس وقت تاریخ نویسی کا

دستور تھا، مورخ پچھلے عہد کے واقعات ہم عصر تاریخوں سے لے کرانہیں اپنی زبان میں ایک نئے اسلوب سے بیان کر دیتا تھا، وہ ان تمام واقعات کو جو ان ماخذوں میں تھے انہیں چیلنج نہیں کرتا تھا اور نہ ان کے بارے میں تصدیق کرتا تھا۔ اس لیے جو غلطیاں ہم عصر مورخوں کے ہاں ہوتی تھیں، وہ بعد کے مورخوں کی کتابوں میں بھی اسی طرح سے درج ہو جاتی تھیں، جیسے کہ محمد بن قاسم کو گائے کی کھال میں سلوانے والا واقعہ، جو بغیر تحقیق کے لکھ دیا گیا ہے۔ اس صورت میں تاریخ کا وہ حصہ اہم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے عہد کے بارے میں لکھا ہو۔ اس میں وہ واقعات کا اکثر خود شاہد ہوتا تھا یا راویوں کی زبانی سنے ہوئے حالات کو بیان کرتا تھا۔

میر معصوم کی تاریخ کا جب اس نقطہ نظر سے تجزیہ کیا جاتا ہے تو اس میں عربوں کی فتح سندھ کے سلسلہ میں وہی رائے نظر آتی ہے کہ جو چچ نامہ کے مصنف کی ہے یعنی عربوں کی جنگ کفر اور اسلام کی جنگ تھی، اور جس کی کامیابی حق کی باطل پر فتح تھی۔

کتاب کا دوسرا اہم حصہ ارغونوں اور ترخانوں کا دور حکومت ہے۔ ارغونوں نے سندھ پر حملہ کر کے جو قتل و غارتگری کی، شہروں کو لوٹا اور باشندوں کو ذلیل کیا۔ ان واقعات کا ذکر تو میر معصوم نے کیا ہے، مگر اس کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگوں اور ان کے نتیجہ میں ہونے والی تباہی اور لوٹ مار کو عام سمجھتا ہے، اس لیے ان پر تنقید نہیں کرتا ہے، بلکہ شاہ بیگ ارغون کے لیے لکھتا ہے کہ وہ فطری طور پر رحمدل اور طبعی لحاظ سے مہربان تھا۔ شاہ حسن ارغون کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ "کسی بھی آدمی پر ظلم اور زیادتی کا ہونا ناممکن بنا دیا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ہمدردی ارغونوں کے ساتھ تھی۔ انہوں نے سندھ پر جو جارحانہ حملے کیے، اسے فتح کیا، اور اس کا استحصال کیا، وہ اس کے نزدیک حکومت و آئین جہاں بانی کے مطابق تھا۔

اگرچہ اس نے بکھر میں آنے والے مغل گورنروں کی بدعنوانیوں کے بارے میں لکھا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر بادشاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے فوراً اس کا تدراک کیا۔ مغلوں کے ہاتھوں سندھ کی فتح میں وہ خود بھی شریک تھا، اس لیے اس نے حملہ کی وجہ کو محض یہ بتایا ہے کہ جانی بیگ اکبر کے دربار لاہور میں حاضر نہیں ہوا جسے اکبر نے نافرمائی خیال کرتے ہوئے سندھ کی فتح کا ارادہ کیا۔ مغلوں کے سندھ پر حملہ کی یہ وجہ محض ایک بہانہ تھی۔ کیونکہ جانی بیگ ایک خود مختار حکمران تھا اور اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ شاہی دربار میں حاضری دے۔ اس کے

پس منظر میں اکبر کی سامراجانہ پالیسی تھی کہ جو اپنے اردگرد کسی بھی خود مختار سلطنت کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری سندھ کی فتح سیاسی اور تجارتی طور پر مغلوں کے لیے ضروری تھی تاکہ افغانستان تک ان کے راستے محفوظ رہیں۔ اس لحاظ سے میر معصوم کی تاریخ مغل دورِ حکومت اور اس سے ہونے والے نتائج کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتی ہے۔

مغل منصب دار کی حیثیت سے میر معصوم مغلوں کی جانب سے جنگ میں حصہ لیتا رہا' اس لیے اس کی کتاب میں جنگوں کے بارے میں تفصیلاً ذکر ہے' مگر انتظام اور لوگوں کی سماجی و معاشرتی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے عہد میں انتظامی امور اور معاملات سے زیادہ امراء اور حکمراں طبقہ کو جنگوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔

اس کی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امراء کا طبقہ علماء اور صوفیاء کا احترام کرتا تھا کیونکہ ان لوگوں میں جو عزت تھی اس کے ذریعہ وہ اپنے سیاسی مفادات حاصل کرتے تھے۔ اکثر علماء نے فاتحین کا ساتھ دیا' اور انہیں جو جاگیریں اور وظیفے ملے اس کے سہارے پرامن زندگی گزارتے رہے۔

(4)

تاریخ سندھ میں تیسری اہم کتاب میر علی شیر قانع کی تحفتہ الکرام ہے۔ میر علی شیر قانع کو اپنے وقت کا ایک عالم و فاضل کہا جاتا ہے کہ جنہوں نے شعراء' صوفیاء' علماء اور معاشرے کی اہم شخصیات پر لکھا۔ ان کی کتاب تحفتہ الکرام سندھ کی تاریخ ہے' جو عربوں کی فتح سے لے کر ان کے اپنے عہد یعنی کلوڑا دور تک آتی ہے۔ میر علی شیر قانع کا تعلق سادات سے تھا اور ان کا خاندان سندھ میں آ کر آباد ہوا تھا۔ جیسا کہ اس دور میں دستور تھا' حکمراں سادات سے تعلق رکھنے والوں کو جاگیریں اور وظائف دیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کا نقطہ نظر حکومت کے ساتھ ہمدردانہ ہوتا تھا۔ ان کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک میں حکمرانوں کی تفصیل ہے' اور دوسرے میں صوفیاء و علماء کی۔ یعنی سندھی معاشرہ ایک طرف حکمرانوں کے تسلط میں تھا جو سیاسی طور پر ان کے حاکم تھے دوسری طرف صوفیاء و علماء نے انہیں اپنے روحانی غلبہ میں لے رکھا تھا۔ لیکن اس تاریخ میں سندھ کے معاشرے کے ثقافتی و سماجی پہلو غائب ہیں۔ اسی طرح اس کتاب میں سلطنت کے

نظم وضبط یا قوانین کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں۔

عرب، سومرہ، سمہ، ارغون وترخان اور مغل دور حکومت کے بارے میں ان کی معلومات کا ذریعہ قدیم ماخذ ہیں، جیسے چچ نامہ، میر معصوم کی تاریخ سندھ، محمد طاہر نسائی کی تاریخ طاہری اور ارغون نامہ وترخان نامہ۔ اس مواد پر لکھی گئی تاریخ میں نہ حالات وواقعات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور نہ کوئی نئی معلومات دی گئیں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ محض تاریخی معلومات میں جو تاریخی شعور و آگہی پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔

بحثیت تاریخ نویس کے مصنف نے اپنے عہد یا اپنے سے پہلے مورخوں کی تحریروں سے بھی کچھ زیادہ نہیں سیکھا۔ واقعات کی حقیقت اور ان کا تجزیہ کرنے کے بجائے انہوں نے تحریر کو دلچسپ بنانے کی خاطر مافوق الفطرت کہانیاں اور قصے بیچ میں ڈال دیئے ہیں۔ جو شاید اس وقت کے قارئین کے لیے تو باعث دلچسپ ہوں، مگر تاریخ کے طالب علم کے لیے یہ الجھنوں کا باعث ہیں۔ اگر اس تاریخ سے واقعات کا انتخاب کیا جائے اور ان کے اردگرد جو کہانیاں ہیں، انہیں دور کیا جائے تو اس وقت اس تاریخ کی کوئی اہمیت ہوگی۔

اگرچہ وہ خود کلہوڑہ دور میں تھا اور میاں غلام شاہ کلھوڑا کے کہنے پر تاریخ لکھنی شروع کی تھی، اس لیے توقع یہ کی جاتی تھی کہ مورخ اپنے عہد کی تاریخ کو تفصیل سے اور واقعات کو چھان بین کے بعد لکھے گا، مگر اس سے یہ توقع بھی پوری نہیں ہوئی، اس میں بھی اس کے ہاں کوئی خاص بات نہیں ملتی ہے۔

مصنف نے تاریخ میں جگہ جگہ لوک کہانیاں اور داستانیں دے دی ہیں، اگرچہ یہ بیانیہ ہیں اور مصنف نے جو ان کے بارے میں پڑھا یا سنا ہوگا اسے بیان کر دیا ہے۔ تاریخ کا طالب علم ان لوک داستانوں سے اس عہد کے معاشرہ کی ذہنیت کا تجزیہ کر سکتا ہے کہ جو ان داستانوں میں موجود ہے۔ جو داستانیں اس کتاب میں ہیں اور شاید انہیں محض دلچسپی کی خاطر دیا گیا ہے، ان میں سسی پنوں، مارول (ماروی) عمر موہل میندھرا اور پہلا چنید شامل ہیں۔ ان داستانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تاریخ تو نہیں ہیں، مگر ان میں معاشرے کے رویے اور رجحانات ملتے ہیں۔ مثلاً ایک طرف پدرانہ نظام نے عورت کی حیثیت کو کمتر کر کے سے روایات میں قید کر دیا تھا، مگر ان داستانوں میں عورتیں معاشرے کی اخلاقی روایات اور قدروں سے بغاوت کرتی ہیں، یہ بغاوت ان کے اندر کی

توانائیوں کو ابھارتی ہے اور انسانی شناخت کو مکمل کرتی ہے۔ لیکن سیاسی بغاوتوں کی طرح یہ سماجی اور ثقافتی بغاوتیں بھی شکست سے دوچار ہوتی ہیں اور ان کا انجام ہمیشہ المیہ پر ہوتا ہے۔ مگر یہ المیہ اس قدر شدید اور گہرا ہوتا ہے کہ شاعر و داستان گو اسے اپنے بیان و کلام سے امر بنا دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں داستانوں کی عورتیں اہم بن کر ابھرتی ہیں اور یہ ایک ایسا روپ اختیار کر لیتی ہیں کہ جو آنے والی نسلوں کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ عورت کو جو مقام سیاسی تاریخ میں نہیں ملا اس کی کمی ان داستانوں نے کر دی ہے۔

لیکن جہاں ان عورتوں کی اخلاقی قدروں سے بغاوت ہے، اور عشق کے اظہار کا برملا اعلان ہے انہیں داستان گو اور شاعر ان کی پاک دامنی اور عصمت و عفت کو برقرار رکھتے ہوئے عورت کا وہ عکس باقی رکھتے ہیں کہ جو پدرانہ معاشرہ چاہتا ہے۔ عشق ہے گر جنسی بے راہ روی نہیں ہے۔ سندھ کے معاشرے میں عورت کا جو مقام ان داستانوں سے جھلکتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں برصغیر کی دوسری لوک کہانیوں میں بھی ہے۔

تاریخ نویسی میں ایک روایت چلی آ رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مورخ اپنے عہد کی تاریخ لکھتا ہے تو وہ محتاط ہوتا ہے کہ ایسی بات نہ لکھ دے کہ جو حکمراں یا حکمراں طبقوں کو ناگوار گزرے۔ خصوصیت سے اس زمانہ میں کہ جب بادشاہ مطلق العنان ہوتے تھے، ان کے درباری مورخوں کا فریضہ ہی یہ تھا کہ وہ اپنے سرپرست کی تعریف و توصیف کریں اور اس کے کارنامے بیان کریں۔ مگر وہ اس سلسلہ میں آزاد تھے کہ گزرے حکمرانوں پر تنقید کریں اور ان کے مظالم کو بیان کریں، کیونکہ اس صورت میں ان کی سرزنش کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ میر علی شیر قانع نے بھی اس روایت پر عمل کرتے ہوئے ماضی کے بادشاہوں کے مظالم کو بیان کیا ہے خصوصیت سے ارغونوں کی فتح سندھ اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے مصائب کا ذکر ہے کہ جو سندھ کے عوام نے جھیلے۔

اسلامی تاریخی روایات میں بادشاہوں کی اصلاح کے لیے ایک خاص ادب تخلیق کیا گیا کہ جس میں قابوس کا قابوس نامہ، نظام الملک کا سیاست نامہ، اور غزالی کی نصیحت الملوک اور ضیاء الدین برنی کی فتاوی جہانداری قابل ذکر ہیں۔ اس ادب کے ذریعہ قصہ، کہانیوں اور روایتوں کے ذریعہ حکمرانوں کی اصلاح مقصود تھی۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ جب مورخ پچھلے بادشاہوں کے مظالم کا تذکرہ کرتا تھا اور رعایا کی بے بسی و مجبوری اور لاچاری کی تصویر کھینچتا تھا تو اس سے اس کے

عہد کے حکمراں کتنا سبق سیکھتے تھے مگر یہ واقعات ایک لحاظ سے بادشاہوں کے لیے سبق آموز ضرور تھے۔

مثلاً وہ جب اروڑ شہر کی تباہی کے ذکر کرتا ہے' یا برہمن آباد کی ویرانی کا بیان کرتا ہے تو اس کا سبب وہاں کے حکمرانوں کو قرار دیتا ہے کہ ان کے افعال قبیحہ اور بدعنوانیوں کی وجہ سے یہ شہر برباد ہوئے۔ یہ وہ عہد تھا کہ جب شہروں اور ملکوں کی بربادی افراد کے اعمال سے ہوتی تھی' کیونکہ تمام اختیارات بادشاہ یا گورنر کے پاس ہوتے تھے۔ اگر بااختیار شخص میں خوبیاں ہوتی تھیں تو شہر اور ملک اور لوگ خوشحال و فارغ البال ہوتے تھے' اگر وہ ظالم و جفا جو و کینہ پرور اور بخیل ہوتا تھا تو اس سے شہر اور ملک کے عوام متاثر ہوتے تھے۔ اس لیے مفکرین اور دانشوروں کا طریقہ کار یہ تھا کہ ان شخصیتوں کو سدھارا جائے' ان کے کردار کو درست کیا جائے' اور ان میں رعایا کی محبت پیدا کی جائے تا کہ ملک یا شہر آباد رہے۔ اس مقصد کے لیے یہ کہانیاں اور داستانیں کارآمد ہوتی تھیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہم پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ افراد کے جو روحانی مشاغل میں مصروف تھے وہ روحانیت سے سیاست میں آئے اور اقتدار پر قبضہ کیا۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ سیاست سے افراد روحانیت کی طرف گئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روحانی خاندان کے لوگ اپنے مذہبی ریاضت و عبادت سے لوگوں کے دلوں میں احترام پیدا کر لیتے تھے۔ اس لیے جب یہ سیاست میں آتے تھے تو ان کے مریدان سے تعاون کے لیے تیار رہتے تھے۔ مگر جو صاحب اقتدار ہوتے تھے' ان کے لیے سیاست و حکمرانی چھوڑ خرقہ بزرگی پہننا مشکل ہوتا تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ایران میں صفوی حکمرانوں کی ابتداء پیری مریدی سے شروع ہوئی اور حکمران تک پہنچی۔ یہی صورت حال کلھوڑا خاندان کی تھی کہ جن کے بزرگوں نے پیری مریدی سے ترقی کرتے ہوئے اپنے مریدوں کی مدد سے زمینوں پر قبضہ کرتے ہوئے بالآخر مسند اقتدار تک جا پہنچے۔

جب میر علی شیر قانع سندھ کے قصبات و شہروں کے بزرگوں کا تذکرہ کرتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی تعداد میں یہ بزرگ سندھ میں کیسے پیدا ہو گئے؟ ان بزرگوں کے حالات اور ان کے شہروں و قصبوں کے بارے میں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک تو ان بزرگوں کی تھی کہ جو شہروں میں آباد تھے اور جن کی سرپرستی حکمراں اور امراء کرتے تھے۔ دوسرے وہ بزرگ تھے کہ جو شہروں سے دور ان قصبات اور گاؤں میں آباد تھے کہ جو دریا کے کنارے کنارے آباد تھے

اور جہاں زراعت و کاشتکاری ہوتی تھی کہ جس میں سے یہ اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ یا ان شہروں اور قصبوں میں کہ جو تجارتی گزرگاہوں پر تھے۔ ہمیں ایسے بزرگ۔ کم ہی ملیں گے کہ جو کوہستانوں یا بے آب و گیاہ میدانون میں جا کر آباد ہوئے ہوں۔ کیونکہ یہاں مریدوں کے پاس دینے کے لیے بہت کم ہوتا تھا۔ ان بزرگوں کے مرید کاشت کار اور مختلف قبائل کے لوگ ہوتے تھے جو انہیں نذرونذرانے دیتے تھے۔ اس کے عوض وہ اپنی کراماتوں اور روحانی طاقتوں سے ان کا تحفظ کرتے تھے۔ مثلاً اگر بارش نہ ہو تو اس کے لیے دعائیں کرنا' اگر قحط پڑ جائے تو اسے دور کرنے کے لیے خدا سے التجا کرنا' اگر دشمن حملہ کر دے تو اس سے صلح کر کے لوگوں کو تحفظ دلانا۔ اگر حکومت کے عہدیدار اور عمال بدعنوان ہوں تو ان کی شکایات حکمرانوں تک پہنچانا' وغیرہ۔ یہ بزرگ یہ سماجی خدمات سرانجام دیتے تھے کہ جس کی وجہ سے لوگوں کو ان کی ضرورت رہتی تھی۔ ان بزرگوں کی درگاہیں بھی لوگوں کے لیے زیارت گاہیں تھیں کہ جہاں وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔

اگر تحفۃ الکرام کا اس نقطہ نظر سے تجزیہ کیا جائے تو اس کے ذریعہ معاشرہ کی سماجی زندگی کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔

ان تینوں تاریخوں کے مطالعہ سے جو بات واضح ہو کر آتی ہے کہ اگر تاریخ کو فاتحین کے نقطہ نظر سے لکھا جائے تو مقامی آوازیں دب جاتی ہیں۔ خاص طور سے چچ نامہ کہ جس کے بارے میں اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کا نیا نام "فتح نامہ" زیادہ مقبول ہو۔ کیونکہ چچ نامہ میں پھر بھی چچ کے نام کی وجہ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ وہ اس ملک کا حکمراں تھا کہ جس کے خاندان کو حکمرانی سے محروم کیا گیا۔ چچ اس طرح سندھ کی علامت بن جاتا ہے' اگر اس کے برعکس "فتح نامہ" کیا جائے تو تاریخ پر پوری طرح سے عربوں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس سے ان کی برتری اور افضلیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ میر معصوم بھی سندھ کے باشندے سے زیادہ مغل دربار کے امیر و منصب دار کی حیثیت سے تاریخ کو دیکھتا ہے۔ میر شہر علی قانع کا خاندان اگرچہ سندھ میں عرصہ سے مقیم رہا' مگر اسے بھی اپنے خاندانی ہونے پر فخر ہے کہ جس کی جڑیں سندھ سے باہر تھیں۔ اس لیے عربوں کی فتح کے بارے میں وہ چچ نامہ کے نقطہ نظر کو دھراتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس کی تاریخ بہت کمزور ہے کیونکہ اس نے جگہ قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ قاری کو الجھا دیا ہے۔ شاید وہ اس طرح سے اپنی

کتاب کو دلچسپ بنانا چاہتا تھا' مگر اس سے تاریخی واقعات مجروح ہوئے ہیں۔

ان تینوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد سندھ کی تاریخ کے بارے میں جو تاثر قائم ہوتا ہے' اول تو یہ کہ جب بھی سندھ کی ایسی حکومت کا صوبہ رہا کہ جس کا مرکز دور تھا تو اس کے نتیجہ میں یہاں گورنروں اور صوبیداروں نے اپنی من مانی کارروائیاں کیں۔ چونکہ مرکز دور ہوتا تھا اور ان پر نگرانی کرنے والا یا ان کا احتساب کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا' یہ صورت حال عربوں اور مغلوں کے عہد میں بہت زیادہ ہوئی کہ جس کا تذکرہ ہم عصر تاریخوں میں ہے۔ سندھ میں مغل گورنروں کے بارے میں میر معصوم نے بھی لکھا ہے کہ انہوں نے بااختیار ہو کر جو چاہا وہ کیا۔ اگر مرکز تک ان کی بدعنوانیوں کی خبر پہنچی تو بہت ہوا تو یہ کہ ان کو معزول کر کے دوسرا صوبیدار بھیج دیا۔ مگر بدعنوانیوں کی وجہ سے سزا نہیں دی۔

دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ جب بھی غیر ملکی حملہ آور آئے تو ان کے ساتھ مقامی طور پر تعاون کرنے والے ان کا ساتھ دینے والے اور ان کی مدد کرنے والے سندھی معاشرے سے آئے جنہوں نے اپنے مفادات کی خاطر اپنے ہی ملک کی فتح میں ان کا ساتھ دیا۔ ان میں امراء' علماء اور قبیلوں کے سردار شامل ہوا کرتے تھے۔ ہم عصر تاریخوں میں تعاون کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے' ان پر کہیں غداری کا الزام نہیں لگایا گیا ہے۔

یہ تینوں تاریخیں جن کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے' سندھ کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔

(5)

قوموں کی تاریخ میں جنگ و جدل اور بیرونی حملہ آوروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اندرونی طور پر حکمراں خاندان اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ دوسرے علاقوں کی خودمختاری ختم کر کے اسے مرکزی حکومت کے ماتحت لے آئیں' اس سلسلہ میں خانہ جنگیں ہوتی تھیں۔ اگر مرکزی حکومت فوجی لحاظ سے مضبوط و مستحکم ہوتی تھی تو وہ علاقائی سرداروں اور حکمرانوں کو شکست دے کر انہیں ماتحت بنا لیتی تھی' ورنہ ملک سیاسی طور پر تقسیم رہتا تھا۔ یہ خانہ جنگیاں معاشرے کی توانائیوں کو ضائع کرتی تھیں۔ جنگوں کی وجہ سے نہ صرف جانی و مالی نقصان ہوتا تھا بلکہ لوگوں میں

عدم تحفظ کا احساس بھی پیدا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے لوگ ہجرت کر کے محفوظ علاقوں میں جاتے تھے۔ جو نہیں جا سکتے تھے وہ لاقانونیت اور بدعنوانیوں کے ہاتھوں برباد ہوتے تھے۔ ایک مستحکم سیاسی حکومت لوگوں کو نہ صرف امن و امان دیتی تھی بلکہ معاشرہ معاشی و سماجی طور پر بھی ترقی کرتا تھا۔ کیونکہ استحکام کی صورت ہی میں حکمراں اس قابل ہوتے تھے کہ وہ رعایا سے ٹیکس وصول کر سکیں اور اس کی آمدن سے وہ اپنے دربار کو شاندار بناتے تھے۔ شعراء و علماء کی سرپرستی کرتے تھے' دستکاروں اور ہنرمندوں سے اپنی ضروریات کی اشیاء تیار کراتے تھے۔ اس دور میں شہروں کی آبادی بڑھتی تھی اور شہری کلچر پیدا ہوتا تھا۔

دوسری صورت حال میں جس سے قومیں متاثر ہوتی تھیں وہ بیرونی حملہ آور ہوتے تھے۔ اگر وہ فتح یاب ہو جاتے تھے تو وہ ریاست کے پورے ڈھانچہ کو بدل دیتے تھے۔ حکومت کے اہم عہدوں پر ان کے ساتھ آنے والے غیر ملکی ہوتے تھے' اس صورت میں مقامی لوگ پس پردہ چلے جاتے تھے۔ سوائے اس جماعت کے کہ جو ان کے ساتھ تعاون کرتی تھی۔ اس نئے طرز حکومت میں حکمراں طبقوں اور عوام میں فاصلے بڑھ جاتے تھے۔ اس لیے عوام پر تسلط قائم کرنے کے لیے فوجی طاقت و قوت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگر ان کے خلاف بغاوت ہوتی تھی تو اسے سختی سے کچل دیا جاتا تھا۔ اگر کسان ریونیو دینے میں دیر کرتے یا مزاحمت کرتے تو اس کا سختی سے نوٹس لیا جاتا تھا۔

بیرونی حملہ آوروں کا دوسرا اثر مقامی کلچر پر ہوتا تھا۔ بیرونی حملہ آور اپنے ساتھ جو نئی ثقافت اور نئے رجحانات لاتے تھے ایک طرف تو وہ مقامی کلچر سے مل کر ایک ایسے کلچر کو پیدا کرتے تھے کہ جس میں توانائی ہوتی تھی' مگر دوسری طرف مقامی کلچر سرپرستی سے محروم ہو کر کمزور بھی ہو جاتا تھا اور سمٹ کے یہ شہرون کے بجائے گاؤں اور دیہاتوں میں پناہ لے لیتا تھا۔

سندھ کی تاریخ بھی ان دونوں عوامل سے گزری۔ آپس کے اختلافات نے بھی اس کے معاشرے کی تبدیلی میں حصہ لیا اور بیرونی حملہ اور بیرونی حکمرانوں نے بھی اس کے کلچر اور روایات کو بدلا۔ اور اس طرح اس شناخت بار بار تبدیل ہوتی رہی۔

جب شمالی ہندوستان میں مسلمان حکمراں خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں تو اسکے بعد سے سندھ کی تاریخ کو دہلی کے نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا۔ ارغونوں اور ترخانوں کی حکومت (1520

سے 1592) بیرونی حملہ آوروں کی حکومت تھی جنہوں نے سمہ خاندان کو بے دخل کر کے حکومت پر قبضہ کیا تھا۔ ترخانوں کی شکست کے بعد سندھ مغلوں کے تسلط میں آ گیا۔ اکبر اگرچہ ایک روشن خیال اور وسیع النظر حکمراں تھا مگر اسکے ساتھ ہی وہ اک بڑا امپریلسٹ بھی تھا کہ جس نے عظیم سلطنت قائم کرنے کی غرض سے چھوٹی ریاستوں کو اس میں ضم کر دیا۔ سندھ پر حملہ اس سلسلہ کی ایک کڑی تھا (1592) لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تصادم میں کس کو صحیح ٹھہرایا جائے؟ ارغون و ترخان بھی بیرونی حملہ آور تھے اور مغل بھی کہ جنہوں نے سندھ کو فوجی طاقت سے قبضہ میں لیا تھا۔ کیا اس صورت میں دونوں بیرونی حملہ آور قابل مذمت ہیں؟

اٹھارویں صدی میں جب مغل خاندان کے زوال کے ساتھ کلھوڑا خاندان (1700 سے 1782) برسر اقتدار آیا تو وہ بھی سندھ کو ایک خودمختار سلطنت قائم کرنے میں ناکام رہا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے اسے کابل کا باجگزار بنا دیا۔ یہاں تک کہ ٹالپروں عہد میں (1759-1843) میں سندھ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ اس بار سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی میں شامل کر کے اس کی خودمختار حیثیت کو ختم کر دیا گیا۔

اس تاریخی عمل نے سندھ کی تاریخ کو الجھا دیا ہے۔ یہ کبھی عربوں کے نقطہ نظر سے لکھی گئی تو کبھی ارغونوں اور ترخانوں کے اور کبھی مغلوں اور انگریزوں کے۔ اس لیے سندھ کی تاریخ کی تشکیل نو ایک ضرورت ہے جو تاریخ کو ان الجھنوں سے نکالے اور ایک واضح نقطہ نظر سامنے لائے۔

جب بھی کوئی خاندان حکومت پر تسلط قائم کرتا تھا تو تاریخ کو اپنے نقطہ نظر سے لکھواتا تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے شکست خوردہ خاندان یا قوم اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے جب ارغون اور ترخان حکمراں ہوئے تو سمہ خاندان تاریخ کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ اس کا دفاع کرنے والا کوئی مورخ نہیں رہا' یہی صورت حال ارغونوں اور ترخانوں کی حکومت کے خاتمہ پر ہوئی کہ تاریخ کو مغلوں کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ جب کلھوڑوں کا زوال ہوا اور ٹالپر حکمراں ہوئے تو ٹالپر دور کے مورخوں نے کلھوڑوں کو موردالزام ٹھہرایا کہ انہوں نے ٹالپر سرداروں سے غداری کی' ان کے خلاف سازش کی اور انہیں اس قدر ستایا کہ مجبور ہو کر انہوں نے کلھوڑوں کے خلاف جنگ کی۔ ٹالپروں کے دور حکومت میں سندھ کی وہ سیاسی وحدت ختم ہو گئی

کہ جو کلھوڑا دور میں تھی اب سندھ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا: حیدرآباد' میر پور خاص اور خیر پور۔ چونکہ ٹالپر سردار قبائلی ذہنیت رکھتے تھے' اس لیے انہوں نے ملک کو بھی اسی انداز سے چلایا۔ غیر بلوچوں کے ساتھ ان کا رویہ غیر ہمدردانہ تھا بلوچ سردار اب جاگیروں پر قابض ہو گئے۔ میروں نے جگہ جگہ زراعتی کھیتوں کی جگہ شکارگاہیں مقرر کر دیں' جس کی وجہ سے ملک کی آمدنی بھی متاثر ہوئی۔ جب انگریزوں سے سندھ پر قبضہ کیا تو انہوں نے اس دور کی تمام خرابیوں کو اجاگر کر کے اپنے قبضہ کا جواز پیش کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ ٹالپروں نے سندھ کو تقسیم کر کے اسے بے حد کمزور کر دیا اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزوں کو اس پر قبضہ کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

(6)

سندھ کی تاریخ میں ایک اور اہم پہلو ہے۔ اگرچہ سندھ پر 12-711ء میں عربوں نے قبضہ کر لیا اور عربوں کا سندھ پر تسلط ہباری خاندان (55-854 سے 11-1010) کے خاتمہ تک رہا۔ اس عرصہ میں سندھ کے عرب دنیا سے تعلقات بھی رہے۔ ایک بڑی تعداد عربوں کی سندھ میں آ کر آباد بھی ہوئی۔ مگر عربی اقتدار اور تسلط کے باوجود وہ اس علاقہ کو عربی تہذیب ثقافت میں ضم نہیں کر سکے جیسا کہ انہوں نے اپنے مغربی علاقوں میں کیا تھا (مصر' تیونس' الجزائر' مراقش وغیرہ) کہ جہاں عربی زبان اور عرب کلچر ان پر چھا گیا۔

جب شمالی ہندوستان میں سلاطین اور مغلوں کی حکومتیں قائم ہوئیں تو یہ لوگ ہندوستان میں ایرانی کلچر اور فارسی زبان کو ساتھ لائے۔ بعد میں یہی ایران کلچر اور فارسی زبان سندھ میں غالب آ گئی اور اس نے عربی کلچر کے تسلط کو ختم کر دیا۔ فارسی دربار کی زبان ہو گئی۔ وسط ایشیا اور ایران سے آنے والوں نے اس کلچر کے فروغ میں حصہ لیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ سندھ میں فارسی زبان و ادب کی ترقی ہوئی اور صوفیا کے نظریات کو مقبولیت ملی۔

چونکہ فارسی زبان و ادب نے عرب کلچر سے بغاوت کی اور ایران قومیت کو ابھارا اس لیے ان کے ہاں بغاوت اور انحراف کی روایات ہیں۔ مذہبی تنگ نظری اور عقائد کی انتہا پسندی کی جگہ روشن خیالی اور انسان دوستی کے جذبات ہیں۔ اس کلچر نے سندھ کے معاشرہ میں علماء کے اثر کو کمزور کیا

اور انہیں صوفیا کے زیر اثر لانے میں مدد کی۔ سندھ کے حکمرانوں نے بھی صوفیا کی سرپرستی کی اور علماء کو حاشیہ پر رکھا۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ سندھ نے عربی اور ایران ثقافتوں کے تسلط کے باوجود پنی مقامی شناخت کو برقرار رکھا۔ کیونکہ عربی اور فارسی عوام کی زبانیں نہیں بن سکیں۔ وہ دربار اور مذہبی اداروں تک محدود رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سندھ کی آبادی مختلف قبائل میں بٹی ہوئی دیہاتوں اور ریگستانوں میں بکھری ہوئی تھی کہ جہاں ان کا تعلق حکمرانوں اور امراء کے طبقوں سے کم ہی ہوتا تھا۔ ان میں سے جو قبائل خانہ بدوش تھے وہ حکومت کے تسلط سے تقریباً آزاد تھے اور متحرک رہنے کی وجہ سے وہ حکومت اور اس کے قوانین کی پرواہ نہیں کرتے تھے (اسی وجہ سے تاریخ مظہر شاہ جہاں میں انہیں لیٹرا' اور چور کہا گیا ہے) جن علاقوں میں زراعت ہوتی تھی' وہاں حکومت مقامی سرداروں یا زمینداروں کے ذریعہ ان سے معاملات طے کرتی تھی۔ اس لیے درباری اور امراء کے کلچر کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور انہوں نے اپنی مقامی کلچر کو زندہ رکھتے ہوئے اپنی شناخت کو برقرار رکھا۔ اس لیے تاریخ کے اس پیچ در پیچ عمل میں سندھی زبان اور کلچر کا تحفظ دیہات اور خانہ بدوش قبائل نے کیا۔ جب کہ شہر کے رہنے والوں نے خود کو بیرونی کلچر میں ضم کر دیا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے سندھ کی تاریخ کی تشکیل نو کی جائے تا کہ وہ لوگ جنہیں تاریخ میں نظر انداز کر دیا گیا ہے' اس کے کردار اور ان کے عمل کو اجاگر کر کے انہیں تاریخ میں جگہ دی جائے۔

❁

وادی سندھ کی تہذیب

محمد ادریس صدیقی

معاشرت

(یہ مضمون محمد ادریس صدیقی کی کتاب "وادی سندھ کی تہذیب" (1959) سے لیا گیا ہے)

مشرق قریب اور بالخصوص مصر کے قدیم باشندے جب اپنے مردوں کو سپرد خاک کرتے تھے تو ان کے ساتھ ہی کافی سامان زاد راہ آخرت کے طور پر دفن کر دیا کرتے تھے ماہرین آثار کو اس سامان کے ملنے سے ان لوگوں کے طرز زندگی کا اندازہ لگانے میں بڑی آسانی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے مثلاً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا لباس کیسا ہوا کرتا تھا' ان میں آرائش اور زیبائش کا کس نوعیت کا اور کس قدر ذوق تھا' ان کا مذہب کیا تھا اور ان کے اعتقادات کی نوعیت کیا تھی۔ اس زاد راہ آخرت کے علاوہ ان مقبروں کی دیواروں پر تصویر کشی کے ساتھ قدیم رسم الخط میں مختلف عبارتیں بھی کندہ کی گئی ہیں۔ جس سے اس عہد کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ان مقبروں سے دریافت شدہ باقیات اور ان کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ وہاں کے امراء اور سلاطین کی زندگی عوام سے بہت مختلف اور ممتاز تھی اور وہاں چھوٹے بڑے اعلیٰ و ادنیٰ اور حاکم و محکوم میں بہت نمایاں فرق تھا۔

وادی سندھ کے قدیم باشندوں نے نہ تو مقبرے چھوڑے ہیں نہ مقبروں پر بنی ہوئی تصویریں نہ ہی اب تک یہاں کی تحریریں ہی پڑھی جا سکی ہیں۔ یہاں مردوں یا زندوں سے متعلق ایسے نقوش جن کی مصر میں کثرت ہے دریافت نہیں ہوئے گویا یہاں موت و حیات کے درمیان بڑا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود یہاں

عالیشان مقبروں کی غیر موجودگی اور دریافت شدہ چند قبروں کی تعمیر میں کسی غیر معمولی اہتمام کا فقدان ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہاں کا عام آدمی اپنے ہمعصروں میں آزادی اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں نسبتاً مساوی حقوق کا مالک تھا۔ اور شاید یہاں کے سماج میں تکلیف دہ طبقاتی ناہمواریاں نہ تھیں بلکہ یہاں کے باشندے اطمینان آسائش اور فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ سماج نے کچھ قاعدے اور قوانین مقرر کئے تھے جن کی پابندی سب پر فرض تھی۔ یہاں ایک منظم اور معقول بلدیاتی نظام رائج تھا اور اس سلسلے میں شہر کو صاف رکھنے صفائی کی آسانی بہم پہنچائے حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ مختلف مکانوں کی نگہ داشت کے لئے چوکیداری کا انتظام' بڑے بڑے کاروانسرائے' رفاہ عام کے گودام' عوامی کنویں' تولنے اور ناپنے کے مختلف اور متوازن پیمانے ایک منظم سماجی زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ موہنجوداڑو میں شہر کے انتظامی معاملات میں موریہ عہد کے شورائی نظام یا گپتا عہد کی شہری کونسلی نظام کے اثرات ضرور موجود ہوں گے اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اگر موہنجوداڑو میں اشرافیہ یا عددیہ برسر اقتدار تھی تو یقیناً یہ تجارتی عددیہ رہی ہو گی۔

بلدیاتی نظام

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ گپتا عہد میں سب سے بڑے تاجر کے علاوہ جو ناظم بلدیہ بھی ہوا کرتا تھا کاروانی تجارت کے نمائندوں اہل حرفہ کے نمائندوں' اور اہل علم کا سماج میں خاص مقام ہوا کرتا تھا۔ موہنجوداڑو میں بھی اس قسم کے نظام کی موجودگی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ اس کی خوشحالی کا موجب اس کی داخلی اور خارجی تجارت تھی۔ دریائے سندھ کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے یہاں کشتیوں کے ذریعہ نہ صرف اندرون ملک سے ہی سامان آتا رہا ہو گا بلکہ مستولون والی سمندری کشتیوں کے ذریعہ دوسرے ملکوں سے بھی تجارت ہوتی ہو گی۔ اس کے علاوہ بلوچستان کے درون کے ذریعے یہ علاقہ ایران اور مشرق قریب کے دوسرے ملکوں سے خشکی کے راستوں سے بھی ملا ہوا تھا۔ اسی طرح کاٹھیاوار جنوبی

ہندوستان اور دوسرے علاقوں سے یہاں تجارتی مال لانے والے قافلے آتے تھے۔ گویا کراچی کی طرح موہنجوداڑو بھی ایک بین الاقوامی نوعیت کا شہر تھا جس کا مزید ثبوت ان مختلف قوموں اور نسلوں کے ڈھانچوں اور کھوپڑیوں سے ملتا ہے جن کے مالکوں نے اس سرزمین میں اقامت اختیار کی اور بالآخر یہیں مرے۔ اس کے برعکس مصر کے مقبروں میں ایک ہی نسل کے لوگوں کے ڈھانچے ملے ہیں۔ وادی سندھ کی تجارت اور دولت کے فروغ اور امن اور فراغت کی موجب یہی مختلف قومیں تھیں جنھوں نے اس کی ترقی کو چار چاند لگائے لیکن دور انحطاط میں یہ مختلف النسل آبادی اس تہذیب کی بربادی کا موجب بنی۔

زراعت و خوراک

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے موہنجوداڑو تجارت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ تجارتی منڈیاں اجاڑ اور بنجر علاقوں میں نہیں بنا کرتیں کیونکہ ان کی کثیر آبادی کی خوراک کے لئے نواح میں غلہ اور دوسری اشیائے خورد و نوش کی پیداوار لازمی ہے۔ چنانچہ موہنجوداڑو کے ابتدائی باشندے جب کبھی بلوچستان یا کسی دوسرے علاقے کی پہاڑیوں سے آئے ہوں گے تو انہوں نے وادی سندھ کی زرخیز اور سرسبز و شاداب سرزمین کی آغوش میں بڑی عافیت محسوس کی ہو گی۔ اور اس وقت اس کے دامن میں لہلہاتے ہوئے کھیت اور سونا اگلنے والی زمین اس تہذیب کے آغاز کا موجب بنی ہو گی۔ لیکن دریائے سندھ کی لائی ہوئی مٹی اور ریت کی تہوں نے ان ابتدائی کھیتوں اور آب رسانی کے انتظامات کے تمام نشانات مٹا دیئے ہیں اور اب ہم یہاں کی قدیم کاشتکاری اور فصلوں کا اندازہ دریافت شدہ باقیات سے ہی لگا سکتے ہیں یہاں گیہوں اور جو کے ایسے جلے ہوئے دانے ملے ہیں جو خود رو نہیں ہیں بلکہ اسی قسم کا گیہوں آج بھی پاکستان میں اگایا جاتا ہے۔ ایسا ہی جو مصر کے قدیم حکمرانوں کی قبروں میں بھی دستیاب ہوا ہے۔ یہ غلہ پتھر کی چپٹی یا گھوڑے کی زین جیسی شکل والی سلوں پر پیسا جاتا تھا کیونکہ اس وقت تک آٹا پیسنے والی دو پاٹ کی گول چکی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ پیسنے سے پہلے لکڑیوں کی بنی ہوئی

او کھلیوں میں غلہ کی بھوسی دور کی جاتی تھی۔

ہڑپہ میں مٹر کے جلے ہوئے دانے تربوز کے بیج اور تل دریافت ہوئے ہیں۔ موہنجوداڑو میں کھجور کی چند گٹھلیاں بھی ملی ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ خلیج فارس سے در آمد کی گئی ہوں۔ اسی طرح ہڑپہ سے دریافت شدہ ایک مہر پر ایک ایسی تصویر بنائی گئی ہے جس پر ناریل کے درخت کا گمان ہوتا ہے وادی سندھ میں اس درخت کے وجود کا ثبوت اس برتن سے بھی ملتا ہے جو اس کے سخت چھلکے کا بنا ہوا ہے۔ اسی طرح ایک مہر پر بنی ہوئی ایک تصویر پر انار کے درخت ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔

یہاں گیہوں اور جو کے علاوہ چاول اور دالیں بھی اوگائی جاتی ہوں گی اور ان کے ساتھ ساتھ ترکاریاں بھی زاید فصل کی حیثیت سے بوئی جاتی ہوں گی۔ دودھ کی فراوانی گائے اور بکری کی موجودگی سے ظاہر ہے۔ غلہ اور ترکاریوں کے علاوہ جانوروں کا گوشت بھی کھایا جاتا ہو گا۔ کیونکہ یہاں کی گلیوں' سڑکوں اور مکانوں میں گائے بیل بھینسے بکری دریائی اور سمندری مچھلی گھڑیال اور کچھوے کی لاتعداد ہڈیاں ملی ہیں۔

لباس

وادی سندھ کی سب سے اہم دریافت روئی کے بنے ہوئے کپڑے کا وہ ٹکڑا ہے جو تانبے اور چاندی کے ظروف کے ہمراہ پایا گیا ہے۔ یہ روئی کی قدیم ترین دریافت ہے۔ کیونکہ مصر جہاں آج کافی مقدار میں روئی پیدا ہوتی ہے پرانے زمانے میں روئی سے محروم تھا۔ روئی کے لئے سنسکرت میں لفظ "سندھو" مستعمل ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روئی عہد قدیم میں سندھ ہی میں پیدا ہوتی تھی اس طرح بابلی زبان میں روئی کے لئے لفظ سندھو اور یونانی زبان میں لفظ "سنڈن" بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ روئی سندھ سے ان ممالک میں خام پیداوار اور کپڑے کی شکل میں برآمد کی جاتی ہو گی۔ کپاس کے علاوہ کالی تلسی کا ریشہ بھی کپڑے بنانے کے کام آتا تھا کیونکہ مچھلی پکڑنے کے ایک کانٹے پر اس قسم کا دھاگا لپٹا ہوا پایا گیا تھا جو اس کے ریشوں سے بنایا گیا تھا۔

کپڑا زیادہ دنوں تک زیر زمین دفن رہنے پر دیمک اور دوسرے کیڑے مکوڑوں اور زمین کے کھار کی نظر ہو جاتا ہے چنانچہ وادی سندھ میں اوپر بیان کئے ہوئے ٹکڑے کے علاوہ کوئی اور کپڑا دریافت نہیں ہوا ہے۔ لیکن تقریباً ہر گھر سے سوت کاتنے کی تکلیاں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ تکلیاں قیمتی اشیاء سے لے کر مٹی اور گھونگھے تک کی ہیں۔ جس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ امیر و غریب سب فرصت کے اوقات میں سوت کاتا کرتے تھے۔ یہاں مختلف نسلوں کے لوگ رہا کرتے تھے۔ اور خیال ہے کہ ان کے لباس بھی مختلف رہے ہوں گے مگر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی باقیات اس سلسلے میں ہماری زیادہ مدد نہیں کرتیں صرف چند مجسّمے اور برتنوں پر بنے ہوئے نقوش ہی یہاں کے باشندوں کے طریق لباس کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ لباس کی ترتیب ڈیزائن سے یہ لوگ بیگانہ نہ تھے بالخصوص نسوانی مجسّمے اس قسم کے مطالعہ کے لئے زیادہ مفید ہیں جن سے لباس کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں مثلاً عورتیں عام طریقے پر ایک زیر جامعہ (تہ بند کی قسم کی چیز) پہنتی تھیں جس کو کمر پر منکے پروئی ہوئی کردھنی یا بٹی ہوئی ڈور یا کمر بند سے اس طرح باندھتی تھیں کہ سامنے کی طرف بروچ یا پھندے کی شکل بن جاتی تھی۔ یہ زیر جامے گھٹنے کے اوپر ہی ختم ہو جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عورتیں ناف سے اوپر کوئی کپڑا ہی نہ پہنتی تھیں جیسا کہ انڈونیشیا میں جزیرہ بالی میں ایک خاص قوم کی عورتیں آج بھی ناف سے اوپر کوئی کپڑا پہنا معیوب سمجھتی ہیں۔ مٹی کی ایسی لاتعداد نسوانی مورتیاں ملی ہیں جن کے جسم کے اوپر کوئی کپڑا نہیں البتہ ان کے گلے اور سینے پر لاتعداد ہار اور مالائیں پڑی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ان کے ہاتھ میں لاتعداد چوڑیاں ہیں لیکن یہ مورتیاں مادر ارض کا مجسمہ ہیں جن کی تقدیس ستر پوشی اور عریانیت کی قید و بند سے آزاد سمجھی جاتی ہو گی۔ اس کے علاوہ کانسے کے بالکل عریاں مجسّمے ملے ہیں جن کو رقاصاؤں کا مجسمہ کہا گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ قدیم مصر کی رقاصاؤں کی طرح بعض رقصوں میں وادی سندھ کی رقاصائیں رقص کے وقت برہنہ رہتی ہوں۔ لیکن ان مجسّموں کی روشنی میں یہاں کی عورتوں کی نیم عریانیت یا عریانیت کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

عورتوں کے مجسموں اور مہروں پر بنی ہوئی تصویروں کے سر پر پنکھے کی شکل کی ایک پوشش بھی نظر آتی ہے لیکن ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکا کہ یہ کس چیز کا بنایا جاتا تھا قیاس ہے کہ سوتی کپڑے کو کلف دے کر کسی سانچے پر منڈھ دیا جاتا ہو گا اسی طرح اکثر مجسموں کے دونوں کانوں کے پاس دو کٹوریاں جیسی لگائی گئی ہیں جو کافی وزنی ہوتی تھیں کیونکہ بعض بعض مجسموں میں ان کو سر سے اٹکا کر ان کی گرانباری کم کی گئی ہے۔ (پلیٹ نمبر18- الف) سر والی پنکھے کی شکل کی پوشش ہم کو مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے لیکن منگولیا کی چند قومیں آج بھی ایسی پوشش استعمال کرتی ہیں۔

مرد معمولی کپڑے پہنتے تھے رؤسا سوزن کاری کئے ہوئے نقش و نگار اور بیل بوٹے بنے ہوئے کپڑے استعمال کرتے تھے۔ لیکن عام پوشاک کے بارے میں اندازہ لگانا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ بعض مجسمے تو بالکل برہنہ ہیں اور بعض میں ستر پوشی کے لئے ایک پتلی پٹی سی نظر آتی ہے۔ بعض مجسموں سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک سادی یا سوزن کاری کی ہوئی چادر اس طرح اوڑھی جاتی تھی کہ بایاں بازو ڈھانکے ہوئے دائیں ہاتھ کی بغل سے گزر کر پیٹھ کی طرف مڑ جاتی تھی اس طرح سے دایاں بازو بالکل آزاد رہتا تھا۔ ایک مجسّمے میں بالکل ایسی ہی چادر گھٹنے تک لٹکتی دکھائی گئی ہے آج بھی ہندوستان میں پرانی وضع کے لوگ اسی طرح چادر لپیٹتے ہیں اور یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ یجروید میں اس طرح چادر پہننے کے طریقے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور اس کو یوپاویتا کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مہاتما گوتم بدھ کے پتھروں کے مجسموں میں بھی چادر اسی طرح لپٹی دکھائی گئی ہے۔

ایک مجسّمے میں کمر سے بندھی ہوئی ازار جیسی پوشاک دکھائی گئی ہے ہو سکتا ہے کہ یہ دھوتی ہو جس کو لپیٹ کر بنایا گیا ہو۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ عام طریقے پر تپتیا ڈیزائن کی شال اوڑھا کرتے تھے لیکن عام لوگ کمر سے اوپر کوئی کپڑا نہ پہنتے تھے صرف جسم کے نچلے حصے کو کسی کپڑے سے ڈھانک لیتے تھے یہ رواج آج بھی ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں موجود ہے۔

یہ لوگ سوتی کپڑے کے علاوہ کینوس کی طرح موٹے کپڑے پہننا بھی جانتے تھے کیونکہ اس قسم کے کپڑوں کی رگڑ کے نشانات مہروں پر ملتے ہیں البتہ کتان اور اونی کپڑوں کے استعمال کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اسی عہد میں ایلام اور سمیر میں کتان کا رواج تھا اور ہو سکتا ہے کہ وادی سندھ کے لوگ اسے درآمد کرتے اور استعمال کرتے ہوں اسی طرح اون کے استعمال کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہاں کی بھیڑ بکریاں اونی کپڑے کی تیاری کے لئے کافی خام مال فراہم کرتی ہوں گی اور وادی سندھ کے لوگوں نے تہذیب کے جو مدارج طے کر لئے تھے اس سے یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہو گا کہ شاید وہ اونی کپڑا تیار کرنا بھی جانتے تھے۔

آرائش گیسو

آرائش گیسو کے طریقوں کے بارے میں عورتوں کی بہ نسبت مردوں سے متعلق زیادہ شواہد دریافت ہوئے ہیں کیونکہ اوپر بیان کئے ہوئے سروں کی پوششوں کی وجہ سے عورتوں کے بال ڈھکے ہوئے ہیں۔ البتہ ایک مجسمے میں عورت کے گھنگریالے بال پیچھے کی جانب پڑے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور ٹوٹے ہوئے مجسمے کے بال بھی پیچھے پڑے نظر آتے ہیں۔

بعض نسوانی مورتیوں میں بالوں کو چوٹی گوندھ کر پشت کی جانب پھندا ڈال دیا گیا ہے۔ یہ طریقہ آج کل بھی رائج ہے۔ کانسے کی رقاصہ کے مجسمے کے بالوں کو یوں آراستہ کیا ہے کہ سامنے کی طرف ایک بل کھائی ہو اونچی لہر بن گئی ہے اور باقی بالوں کی چوٹی گوندھ کر دایاں کان چھپاتے ہوئے گردن اور شانے پر ڈال دیا گیا ہے عورتیں بالوں میں موباف اور کنگھی اڑستی تھیں۔

مردوں کے بال سنوارنے کے طریقے مختلف ہیں۔ راج پروہت کے بال پٹے نما ہیں ان کی پیشانی کے بیچ سے مانگ نکالی گئی ہے۔ اور زلفوں کو موباف سے کس کر باندھا گیا ہے۔ جیسا کہ سمیر میں بھی دستور تھا۔ ایک مجسمے کے بالوں کے جوڑے کے پیچ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بالوں کو گوندھ کر چوٹی بنائی جاتی تھی اور پھر اس چوٹی کو لپیٹ

کر جوڑا بنایا جاتا تھا مٹی کے چند مجسموں میں بالوں کا جوڑا سر کے اوپر جھلے کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ بالوں کے ایسے جھلے بھی بنائے جاتے تھے جو کانوں کو ڈھانپ لیتے تھے۔ ایک بچے کے مجسمے کے بال گھنگریالے دکھائے گئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے بال گھنگریالے ہوتے ہوں۔

وادی سندھ کے لوگوں میں داڑھی ترشوانے کے مختلف طریقے رائج تھے۔ بعض مجسموں کی داڑھیاں خشخشی دکھائی گئی ہیں بعض کے اوپری لب تراشیدہ ہیں جیسا کہ سمیر میں بھی دستور تھا لیکن ایسے مجسمے بھی ملے ہیں جن کی لبیں تراشیدہ نہیں ہیں۔ ایک مجسمے کی داڑھی چھوٹی اور باہر کی جانب نکلی ہوئی ہے اسی طرح مٹی کے ایک مجسمے کی داڑھی اندر کی طرف گھومی ہوئی ہے اور مصریوں کی باہر کی طرف نکلی ہوئی مصنوعی داڑھی کے بالکل برعکس ہے۔ ایک شبیہ کا پورا کلہ صاف ہے البتہ ٹھوڑی کے نیچے کچھ بال چھدرے چھدرے اگے ہوئے ہیں۔ ان مجسموں میں سب نہیں تو چند تو ضرور دیوتاؤں کے بت ہیں لیکن دوسرے تمام مجسموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے قدیم لوگوں کی داڑھیاں تراشیدہ اور چھوٹی ہوتی تھیں۔ اور سمیر کے لوگوں کی طرح لمبی اور گھنیری نہ ہوتی تھیں۔ کچھ لوگ گلمچھے بھی رکھتے تھے۔

زیورات

برصغیر ہند و پاکستان کی خواتین ہمیشہ سے زیورات کی دلدادہ رہی ہیں۔ وادی سندھ کی خواتین کا خمیر بھی اسی مٹی سے بنا تھا چنانچہ وہ بھی حسن و جمال کی آرائش کے لئے زیورات کثرت سے استعمال کرتی تھیں۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں سونے چاندی کی ملی جلی دھات' تانبا' کانسا' سیپ' گھونگھے' ہاتھی دانت اور کئی قسم کے قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں کے بنے ہوئے زیورات دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ زیورات چاندی تانبے یا کانسے کے برتنوں میں رکھے ہوئے پائے گئے ہیں کچھ زیورات متفرق طور پر بھی ملے ہیں۔ زیورات اکثر و بیشتر مکانوں کے فرش کے نیچے یا دیواروں کے اندر احتیاط سے دفن کئے ہوئے پائے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مالکوں نے کسی عارضی خوف

کی وجہ سے ان کو اس خیال سے دفن کر دیا تھا کہ اطمینان کے وقت نکال لیں گے لیکن شاید وہ وقت نہ آ سکا یہاں تک کہ ہزاروں سال بعد آثار قدیمہ کے ماہروں نے ان کو باہر نکالا۔

زیورات کی سب سے دلچسپ دریافت رائے بہادر دیا رام ساہنی کے نکالے ہوئے چند قیمتی ہار اور منکے ہیں جو چاندی کے ایک برتن میں رکھ کر دفن کئے گئے تھے جن کے قریب ہی کچھ زیورات زمین پر بکھرے ہوئے پائے گئے تھے۔ اس برتن کو اچھی طرح کپڑے میں لپیٹ کر دفن کیا گیا تھا اور اس کپڑے کا بہت چھوٹا سا ٹکڑا خاک ہو جانے سے بچ گیا تھا۔ اسی طرح مسٹر ڈیکسٹ کو چاندی کے برتن میں بہت خوبصورت ہار سونے اور چاندی کی کچھ چیزیں اور موباف وغیرہ ملے تھے۔ ہڑپہ میں مسٹر وتس کو ایک بیش قیمت ہار چاندی کے ایک ڈبہ میں رکھا ہوا ملا تھا اس ہار میں ہرے اور نیلے نیم قیمتی پتھروں کے منکے اور سونے کے گول دانے ایک ایسی لڑی میں پروئے ہوئے تھے جس کے بیچ میں عقیق اور یشب کے آویزے بھی ڈالے گئے ہیں۔ اس کی بناوٹ بڑی نفیس اور نہایت سبک ہے جو ان لوگوں کے جمالیاتی ذوق کی مظہر ہے اس ہار کے ہمراہ بہت سے کڑے اور انگوٹھیاں بھی ملی ہیں۔

ایک ایسے مکان کے فرش کے نیچے سے جس میں کچی اینٹیں جمع کی گئی تھیں تانبے کی ایک ڈھکنے دار ہانڈی برآمد ہوئی تھی جس میں سونے کی کیلوں کے علاوہ چاندی کے بندے دوسرے زیورات اور عقیق کے منکوں کی دو کردھنیاں ملی تھیں۔ ان کردھنیوں میں چھ چھ لڑیاں ہیں ہر لڑی میں لمبی ڈھولک کی شکل کے سرخ عقیق کے پانچ منکے پروئے گئے ہیں۔ ان منکوں کے دونوں سروں پر کانسے کے بنے ہوئے گول دانے پڑے ہیں ان دانوں کے درمیان کانسے کی ایسی کھڑی پٹیاں پروئی گئی ہیں جن میں چھ چھ سوراخ ہیں اور ہر سوراخ سے لڑیوں کی ڈوریاں گذرتی ہیں۔ اس تین فٹ چار انچ لمبی کردھنی کے دونوں سروں پر کانسے کی D شکل کے کون ہیں جن میں ایک طرف تو چھ سوراخ ہیں اور دوسری طرف ایک چنانچہ یہ لڑیاں ان چھ سوراخوں سے گذر کر ایک سوراخ سے باہر آتی ہیں اور آپس میں مل جاتی ہیں۔ عقیق کے منکوں کے اوپر اور

ان کے سوراخوں میں نہایت صفائی سے پالش کی گئی ہے اور خیال ہے کہ ان میں پتھر یا تانبے کے برموں سے سوراخ کئے گئے ہوں گے اور ان کو چمکانے اور پالش کرنے کے لئے سباذج کا سفوف استعمال کیا گیا ہوگا سستی اور معمولی کردھنیاں بھی ملی ہیں۔ جن میں عقیق کے بجائے پکائی ہوئی مٹی کے خوبصورت دانے پڑے ہیں لیکن ان کی وضع قطع قیمتی کردھنیوں کی سی ہے۔

ان کے علاوہ یہاں سے کئی قسم کے ہار بھی ملے ہیں۔ جن میں سے ایک انوکھی وضع کا خوبصورت ہار قابل ذکر ہے اس ہار میں صرف ایک لڑی ہے جس میں سبز نیم قیمتی پتھر کے ڈھول کی شکل کے منکے پروئے گئے ہیں۔ ان منکوں کے دونوں طرف ایک ایک گول دانہ پڑا ہے۔ ان دانوں کے بعد سونے کی چپٹی دو ورقی گول پتیاں ہیں جن کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ ان کے بیچ میں لڑی کی ڈور گذرنے کے لئے نالی رکھی گئی ہے۔ اس میں عقیق یمنی اور یشب کے سات آویزے پروئے گئے ہیں اور اس طرح یہ پورا ہار بڑا جاذب نظر دکھائی پڑتا ہے۔

دست بند، کنگن اور کڑے بھی کافی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔ ان کا بہترین نمونہ چھ لڑیوں والا وہ دست بند ہے جس میں سونے کے گول منکے پروئے گئے ہیں۔ سات سات منکوں کے درمیان سونے کی چھ چپٹی پتیاں لگائی گئی ہیں ہر پتی میں چھ سوراخ ہیں اور ہر سوراخ میں ایک لڑی گذرتی ہے۔ اس کے دونوں سروں پر D شکل کے کون لگائے گئے ہیں جن میں ایک طرف چھ سوراخ ہیں اور دوسری طرف صرف ایک۔ یہ لڑیاں ان سوراخوں سے گذر کر ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ ایسے سادے اور خوبصورت دست بند موہنجوداڑو میں کئی مقامات پر ملے ہیں۔

وادی سندھ کے قدیم باشندے بال باندھنے کے لئے موباف استعمال کرتے تھے یہ موباف عام طور پر نصف انچ چوڑی سونے چاندی اور دوسری دھاتوں کی بنی ہوئی پتلی پٹیاں ہوتی تھیں جن کی وضع سیدھی مخروطی یا محراب دار ہوتی تھی بعض بعض موباف 16 انچ تک لمبے ہوتے تھے اور ان کے کناروں پر سوراخ ہوتے تھے۔ جن میں دھاگا ڈال کر ان کو سروں کے گرد باندھا جاتا تھا بعض موباف پر کسی نوکیلی چیز سے نقطے ڈال

کر نقاشی کی گئی ہے۔ سمیر میں بھی ایسے موباف کثرت سے مستعمل تھے۔ پیشانی پر نوکیلے قسم کا جھومر استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسے جھومر مارواڑی عورتیں آجکل بھی پہنتی ہیں۔ کانوں میں بالیاں پہننے کے رواج کا اندازہ مجسموں پر بنی ہوئی نقاشی سے لگایا گیا ہے۔ لیکن بالیاں شاذ و نادر ہی دریافت ہوئی ہیں۔ سونے کی بنی ہوئی دندانے دار چند ایسی ٹکیاں ملی ہیں جن کے پیچھے کیل جڑی ہوئی ہے لیکن یہ ناک کی کیل کی بہ نسبت کانوں کے ٹاپس سے زیادہ مشابہ ہیں۔

ہاتھوں میں کنگن اور دست بند کے علاوہ چوڑیاں پہننے کا عام رواج تھا یہ چوڑیاں سونے چاندی، تانبے، کانسے ہاتھی دانت اور مٹی کی بنی ہوئی ہوتی تھیں سونے اور چاندی کی چند پولی اور کھوکھلی چوڑیاں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ غریب عورتیں مٹی کی چوڑیاں پہنتی تھیں۔ جو نہایت نفاست سے بنائی جاتی تھیں۔ بعض چوڑیوں پر تصویری نقاشی بھی کی گئی ہے۔ رقاصہ کے مجسمے کے بائیں ہاتھ میں کلائی سے بغل تک چوڑیاں ہی چوڑیاں نظر آتی ہیں سندھ اور گجرات (ہندوستان) میں آج بھی پورے پورے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنی جاتی ہیں۔ خیال ہے کہ رقاصہ کے ہاتھ کی چوڑیاں یا تو ہاتھی دانت کی تھیں یا سنکھ کی کیونکہ اگر یہ کسی دھات یا مٹی کی بنی ہوئی ہوتیں تو ان کے بوجھ کی وجہ سے ہاتھ اٹھانا بھی مشکل ہو جاتا۔ شیشے کی چوڑیاں موہنجوداڑو میں دریافت نہیں ہوئی ہیں اور نہ ہی شیشے کی کوئی دوسری چیز ملی ہے۔

انگلیوں کی زیبائش انگوٹھیوں اور چھلوں سے کی جاتی تھی ان انگوٹھیوں میں بعض بالکل سادہ گول یا چپٹے تار کے چھلوں جیسی ہیں۔ بعض ایک ہی تار کو کئی بار چھلوں کی شکل میں موڑ کر بنائی گئی ہیں۔ اس طرز پر بنے ہوئے چھلوں میں سات سات پھیر ہیں۔ عام طور پر انگوٹھیاں تانبے یا کانسے کی بنائی جاتی تھیں۔ چاندی کی صرف ایک انگوٹھی ملی ہے جس میں ایک چپٹے تار کے اوپر نگ رکھنے کی جگہ چپٹے چوکور ماتھے پر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے خطوط کھینچے گئے ہیں۔

پیروں میں کڑے پہننے کا رواج تھا۔ مٹی کے چند مجسموں کے پیروں میں کڑے پائے گئے ہیں۔ کانسے کے ایک مجسمے کے پیروں میں بالکل اسی قسم کا کڑا پڑا ہے جیسا کہ

آج بھی شملہ (ہندوستان) کی پہاڑی عورتیں پہنتی ہیں۔ اسی قسم کے کڑے کریٹ میں بھی پہنے جاتے تھے۔

بالوں میں کنگھا لگایا جاتا تھا۔ ایک دہرے وندانے والا ہاتھی دانت کا بنا ہوا کنگھا جس کے دونوں طرف گول دائروں کی نقاشی کی گئی ہے ایک نوجوان خاتون کے کاسہ کے قریب ملا تھا۔ ایک اور V شکل کا کنگھا بھی دریافت ہوا ہے۔ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ایک خوبصورت کنگھی بھی ملی ہے جس میں موجودہ کنگھیوں کی طرح دونوں طرف وندانے ہیں۔

تانبے کانسے اور چینی کے گول بٹن بھی دریافت ہوئے ہیں۔ یہ شکل و صورت میں عام طور پر مالٹا، پرتگال اور جنوبی فرانس کے بٹنوں سے مشابہ ہیں جو وضع میں سادہ ہیں اور ان کے پشت کی جانب تاگا پرونے کے لئے دو سوراخ بنائے گئے ہیں۔ کانسے کے بٹن گھنڈی نما ہیں اور ان میں اوپری جانب دو سوراخ ہیں۔

سنگھار

وادی سندھ کی عورتیں سنگھار کی دلدادہ اور مشاق تھیں اور افزائش حسن کے لئے سرمہ اور غازہ استعمال کرتی تھیں۔ چنانچہ سرمہ دانیاں اور سلائیاں کثیر تعداد میں پائی گئی ہیں ان کی اس کثرت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً مرد اور عورتیں دونوں سرمہ لگاتے تھے۔ آجکل بھی سندھ میں سرمہ عام طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سرمے کے علاوہ گھونگھے اور سیپ کی ڈبیوں میں سرخ رنگ کا سفوف بھی ملا ہے جو غالباً غازے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایسی ہی ڈبیوں میں اسی قسم کا غازہ کش اور ار کے مقبروں سے بھی دریافت ہوا ہے۔

ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں سیسے کا کاربونیٹ بھی ملا ہے جو شاید چہرے کو سفید کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ اس کے علاوہ تزئین کے لئے شنگرف بھی مستعمل تھا۔ ایک قسم کا ایسا سبز مادہ بھی دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں مسٹر میکی کا خیال ہے کہ وہ شاید کاجل کی طرح استعمال کیا جاتا ہو جیسا کہ مصر میں ملاکیٹ! مستعمل تھا۔

تانبے کے گول آئینے بھی ملے ہیں جن کے کنارے جلا محفوظ رکھنے کے لئے ابھرے رکھے جاتے تھے۔ پیروں کو صاف کرنے کے لئے مٹی کے جھانوے استعمال کئے جاتے تھے۔

کھلونے

وادی سندھ کے قدیم بچے اس کے موجودہ بچوں کی طرح کھلونوں کے معاملے میں خوش قسمت تھے۔ یہاں لاتعداد کھلونے ملے ہیں جن سے یہ بھی اندازہ لگتا ہے کہ اس عہد کے والدین اپنے بچوں کی دلچسپی اور ان کے کھیل کود پر کتنی توجہ دیتے تھے یہاں مٹی، سیپ، پتھر اور ہاتھی دانت کے ہر قسم کے کھلونے پائے گئے ہیں جو اس صنعت کی ترقی کے مظہر ہیں (پلیٹ نمبر 16-17) خیال ہے کہ لکڑی کے کھلونے بھی بنائے جاتے ہوں گے جو تلف ہو گئے البتہ مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بکثرت ملی ہیں جو وضع قطع میں ان بیل گاڑیوں سے ملتی جلتی ہیں جو آجکل بھی شمالی سندھ کے دیہاتوں میں سڑکوں پر چلتی نظر آتی ہیں۔ ان سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ موہنجوداڑو کے لوگ مسافرت اور بار برداری کے لئے بیل گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔ چند گاڑیوں کے ساتھ ساتھ مٹی کے بنے ہوئے بیل بھی ملے ہیں۔ یہاں ایسے رتھ دریافت نہیں ہوئے ہیں جو عام طریقہ پر میدان جنگ میں کام آتے تھے۔

کھلونوں میں وہ جھنجھنے خاص طور پر دلچسپ ہیں جو گیند کی طرح گول اور اندر سے کھوکھلے ہیں ان کے اندر چھوٹی چھوٹی کنکریاں پڑی ہوئی ہیں جن کے ہلنے سے آواز پیدا ہوتی ہے یہ کھلونے بچوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ ایسی چڑیاں بھی ملی ہیں جو کھوکھلی ہیں جن کی دم کے پاس ایک سوراخ ہے۔ یہ بچوں کی سیٹیاں تھیں۔ ان کی دم کے سوراخ میں پھونکنے پر آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کئی قسم کی بنی ہوئی چڑیاں ملی ہیں ایک چڑیا چونچ کھولے ہوئے دکھائی گئی ہے گویا چوں چوں کر رہی ہے۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں چڑیوں کے پنجرے بھی ملے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چڑیاں پالی بھی جاتی تھیں۔

ایک پنجرے کی کھڑکی سے ایک چڑیا باہر نکلتی ہوئی دکھائی گئی- بانس پر چڑھتے ہوئے بندر، یا کسی دوسرے جانور کے بھی بہت سے نمونے ملے ہیں- ان کے علاوہ چھوٹے سینگوں والے بیل گینڈے، بھینس، شیر، سور، بندر، کتا، خرگوش، بکری، آبی جانوروں میں مچھلی مگرمچھ اور کچھوا پرندوں میں مرغی، طوطے اور فاختہ کے بھی چھوٹے چھوٹے مجسّے دریافت ہوئے ہیں- ترازو کے چند چھوٹ چھوٹے پلڑے بھی دریافت ہوئے ہیں جن میں ڈوریاں ڈالنے کے سوراخ بھی ہیں- پلڑے بہت بھدے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں نے بنائے ہیں- اسی طرح گھروں میں برتنے والے برتنوں کی وضع کے چھوٹے چھوٹے مٹی کے کھلونے بھی پائے گئے ہیں اور ان میں سے بعض بعض پر تو بچوں کی ننھی ننھی انگلیوں کے نشان بھی ہیں- عہد طفولیت کی معصوم مشغولیت کے یہ نشان کتنے دلچسپ ہیں!

اعلیٰ قسم کے بنے ہوئے کھلونوں میں ایسی قسم کے جانور ہیں جن کے سر دھڑ سے الگ بنائے گئے ہیں- یہ سر کھوکھلی گردن میں ایک ہک کے ذریعے پھنسائے جاتے تھے اور کوہان میں ایک سوراخ کر کے اس کے اندر سے ایک ایک ڈور گذار کر ان سروں میں باندھ دی جاتی تھی- اس طرح ڈور کھینچنے پر یہ سر ہلتے تھے اسی طرح بندر کی ہمشکل ایک جانور ملا ہے جس کے ہاتھ ہلتے ہیں- ایسے کھلونے بھی ملے ہیں جن میں اس حکمت سے سوراخ کئے گئے ہیں کہ ان میں تاگا ڈال کر حسب دلخواہ رفتار سے اوپر نیچے دوڑایا جا سکتا ہے- لیکن بدقسمتی سے لڑکیوں کا محبوب ترین کھلونا یعنی گڑیا کہیں نہیں ملی- یہ کپڑے یا لکڑی کی بنائی جاتی تھی اس لئے امتداد زمانہ سے تلف ہو گئی ہو گی-

تفریح

پانسہ----- برصغیر ہند و پاکستان کی ابتدائی تاریخ میں پانسہ کو بڑا دخل رہا ہے- اسی کی بدولت یدھسٹر راج پاٹ دھن دولت حتیٰ کہ اپنی رانی دروپدی تک سے ہاتھ دھو بیٹھا اسی طرح راجہ نل کا قصہ بھی زبان زد خاص و عام ہے اور آج بھی پانسہ اور کوڑیاں کھیلنے والے راجہ نل کی دہائی دیتے ہیں- رگ وید میں بھی اس کھیل کا کئی

مقامات پر ذکر ہے لیکن یہ کھیل اس عہد سے بھی بہت قدیم ہے اور وادی سندھ کے لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وادی سندھ کے پانسے مٹی اور پتھر کے بنے ہیں ان کی چھ سمتوں میں مختلف تعداد میں گول نشان بنے ہیں۔ یہ نشان ایک سے چھ تک ہیں اور اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک کے بالمقابل دو ہے تین کے بالمقابل چار اور پانچ کے مقابل چھ۔ اس قسم کا مٹی کا بنا ہوا ایک پانسہ موصل کے قریب ٹیپ گوارا کی چوتھی تہ سے ملا ہے جو تقریباً 2355 سال قبل مسیح کا بنا ہوا ہے۔ بعض پانسوں کے کونے گھسے ہوئے ہیں غالباً ان کو کسی نرم چیز پر پھینکا جاتا ہو گا۔ بعض چوکور پانسوں میں جو عام طور پر ہاتھی دانت کے بنائے گئے ہیں تین سمتوں میں تو ایک دو اور تین نشانات ہیں اور چوتھی سمت میں لمبے لمبے خطوط کھینچے گئے ہیں۔ کچھ پانسوں کے ہر جانب مختلف تصویری تحریر ہے جو ابھی تک پڑھی نہیں جا سکتی۔ ایسے کندہ پانسے بھی دریافت ہوئے جنہیں نجومی قسمت کا حال بتانے میں استعمال کرتے ہیں۔

موجودہ شطرنج کے پیادوں کی طرح مٹی پتھر اور یشب کے لاتعداد مہرے ملے ہیں ان میں سے بعض بہت خوبصورت ہیں۔ یہ جسامت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ بات یقینی طور سے نہیں کہی جا سکتی کہ واقعی شطرنج کے مہرے ہی ہوں گے۔

موہنجوداڑو سے ایک ایسی اینٹ بھی دریافت ہوئی ہے جس پر چار چوکور خانوں کی تین قطاریں کھدی ہوئی ہیں ان میں سے ایک خانہ میں متوازی الاضلاع اور اس کے وتر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بنائے گئے ہیں۔ گویا اس کی شکل کی طرح کی ہے۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ چوسر کی بساط کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس اینٹ کے ساتھ ہی اس قسم کی اور اینٹیں ہوں گی جس سے تین خانوں کی دس قطاریں ہوں گی اور ان پر مصریوں کی طرح دسی کھیلی جاتی تھی اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس میں چھبیس خانے تھے جو اس طرح بنائے گئے ہوں گے کہ ایک طرف تین قطاروں میں بارہ خانے دوسری طرف دو قطاروں میں بارہ خانے اور ان دونوں کے بیچ میں دو خانے ہوں تو یہ سر وولی کی ار سے دریافت کی ہوئی سمیری بساط سے مماثلت رکھتی ہو گی۔ یہ اینٹ ایک فرش

سے دستیاب ہوئی ہے اور یہ کھیل فرش پر بیٹھ کر ہی کھیلے جاتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی اینٹیں ملی ہیں اور یہ قیاس صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ چوسر اور سر بگھی کے قسم کے کھیل یہاں کھیلے جاتے ہوں گے۔ البتہ ان کا نام کچھ اور رہا ہو گا۔ اور کھیلنے کے طریقے بھی مختلف ہوں گے۔ یہاں مٹی اور پتھر کی بہت سی گولیاں بھی ملی ہیں۔

ایک مہر پر دو پرندے ایک دوسرے پر جھپٹتے دکھائے گئے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پرندے بازی بھی یہاں کا محبوب مشغلہ تھا اور جس طرح آج کل بلبل، مرغ، تیتر اور بٹیریں لڑائی جاتی ہیں اسی طرح وادی سندھ کے لوگ بھی پالیاں بدلتے ہوں گے۔ بیلوں کی لڑائی ہوتی ہو گی۔ مرغ لڑتے ہوں گے۔ بہرحال یہ تفریحیں نئی نہیں ان کا وجود کریٹ کی پرانی تہذیب میں بھی ملتا ہے۔

شکار

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وادی سندھ کے لوگ گوشت خور تھے وہ پالتو جانوروں کے علاوہ جنگلی جانوروں کو شکار کر کے بھی گوشت فراہم کرتے تھے۔ ایک مہر پر دو آدمیوں کو تیر کے ذریعہ ہرن کا شکار کرتے دکھایا گیا ہے دوسری مہر پر جنگلی بکری کو ہدف بنایا گیا ہے۔ اسی طرح موہنجوداڑو کے ایک مقام سے بہت سے تیر ملے ہیں جن کو شکار میں استعمال کیا جاتا ہو گا۔ یہاں کی تصویری تحریر میں بھی تیر کمان کے نشان ملتے ہیں ان کے علاوہ مٹی کی پختہ گولیاں یا غلے بھی ملے ہیں جن سے کمان کی شکل کی غلیل کے ذریعہ چڑیوں کا شکار کیا جاتا تھا۔ چوہوں کے پکڑنے کے لئے مٹی کے پھندے یا چوہے دان استعمال کئے جاتے تھے۔ اس قسم کے چوہے دان موہنجوداڑو میں دریافت ہوئے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کے سینکڑوں کانٹے اور جال کے ڈبونے کے لئے استعمال کی جانے والی گولیوں کی دریافت اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہاں مچھلی کے شکار کا بھی عام رواج تھا۔ مٹی کے بنے ہوئے چند ایسے کتے بھی ملے ہیں جو شباہت میں شکاری کتوں سے ملتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کتے جانوروں کے شکار میں استعمال کئے جاتے

ہوں۔

پالتو جانور

وادی سندھ کے باشندے جانوروں کے گوشت ہی کے شائق نہ تھے بلکہ وہ جانوروں کو پالتے بھی تھے ان پالتو جانوروں کی اقسام کچھ کم نہ تھیں۔ چنانچہ کھدائی میں کوہان والے بیل یا سانڈ' بھینسا' بھیڑ' ہاتھی' سور اور مرغ کے ڈھانچے اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ پالتو جانوروں کے بارے میں بچوں کے کھلونے اور مہروں پر نقش کی ہوئی تصویریں بھی ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھینسے' بندر' کتا' بلی' طوطا' مور اور مرغ سے اچھی طرح واقف تھے۔ گدھے کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا اور محققین میں اس بارے میں کافی اختلاف ہے کہ آیا وادی سندھ کے لوگ گھوڑے سے بھی واقف تھے۔

وادی سندھ میں سانڈوں کے ڈھانچے بڑی کثرت سے ملے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیلوں کی نسل لینے کا اچھا انتظام تھا۔ یہ بیل سندھ' شمالی گجرات اور راجپوتانہ کے موجودہ شاندار بیلوں سے کلی طور پر مشابہ تو نہیں البتہ ان چھوٹے کوہان والے بیلوں سے بالکل مختلف ہیں جو آجکل وسط ہند اور دکن میں عام طور سے پائے جاتے ہیں ان کے علاوہ سندھ اور بلوچستان میں بغیر کوہان اور چھوٹی سینگوں والے بیل بھی ہوتے تھے۔

اس سلسلے کی سب سے دلچسپ دریافت ایک ایسی پختہ اینٹ ہے جس پر ایک کتے اور بلی کے پیروں کے نشان بنے ہیں۔ قیاس ہے کہ یہ نشان اس وقت پڑے ہوں گے جب گیلی مٹی کی اینٹیں سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھی گئی ہوں گی کسی کتے نے بلی کا پیچھا کیا ہو گا اور بلی ان اینٹوں کے اوپر سے بھاگی ہو گی کتا بڑی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑا ہو گا۔ یہ نشان کافی گہرے ہیں اور اس طرح سے بنے ہیں کہ تیز دوڑنے کے علاوہ کسی اور طرح نہیں پڑ سکتے۔ یہ تیز بھاگنے والی بلی اور اس کا پیچھا کرنے والا کتا تو نہ

جانے کب کے خاک ہو چکے لیکن اینٹوں پر پڑے ہوئے نشان زبان حال سے جہد بقا کی مسلسل اور مستقل داستان سنا رہے ہیں۔

جنگلی جانور

ان جانوروں سے قطع نظر جن کا ذکر شکار یا پالتو جانوروں کے ضمن میں کیا گیا ہے یہاں ایسے جانوروں کی موجودگی کا سراغ بھی ملتا ہے جو گھروں میں آیا جایا کرتے تھے جسے نیولا اور سیاہ چوہا ان کے علاوہ خرگوش بھی موجود تھا۔ شیر' ریچھ' ہاتھی اور گینڈے جیسے وحشی جانور عام تھے۔ ہرن چار قسم کے ہوتے تھے۔ 1۔ کشمیری بارہ سنگھا 2۔ سانبھر 3۔ چیتل اور 4۔ پاڑہ ہرن۔ ان ہرنوں کے صرف سینگ ہی پائے گئے ہیں۔ ممکن ہے یہ سینگ دواؤں میں استعمال کئے جانے کے لئے دور دور سے منگائے گئے ہوں' کشمیری بارہ سنگھا آجکل صرف کشمیر اور ہمالیہ کے نواح میں ملتا ہے۔ چیتل آجکل نہ سندھ میں پایا جاتا ہے اور نہ پنجاب میں۔ اسی طرح سانبھر بھی سندھ راجپوتانہ اور پنجاب میں نہیں ملتا پاڑہ ہرن اب بھی سندھ میں ملتا ہے۔

رقص و سرود

موہنجوداڑو کے لوگ رقص و سرود کے بڑے شائق معلوم ہوتے ہیں اس کا ثبوت رقاصہ کا کانسہ کا بنا ہوا مجسمہ ہے۔ اسی طرح ہڑپہ سے پتھر کا ایک اور مجسمہ بھی دریافت ہوا جو عالم رقص میں ہے۔

رقص قدیم ہندوستان کی مذہبی رسوم میں ایک اہم مقام رکھتا تھا اور پرستش کا ایک خاص جزو ہوتا تھا۔ معلوم نہیں موہنجوداڑو میں اس کو مذہبی حیثیت حاصل تھی یا محض تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ تھا۔ ناچ کے ساتھ گانے بجانے کا انتظام ایک فطری امر ہے اور اس کا وجود ڈھولک کی اس تصویر سے ثابت ہوتا ہے جو ایک مہر پر کندہ ملی ہے اسی طرح ایک اور مہر پر ایک مردانی شبیہ کی گردن میں ڈھولک یا مردنگ لٹکا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ناچنے والے کو تھاپ دینے کے لئے کھڑتال بھی مستعمل تھی جس کے

چند نشانات پائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ وادی سندھ کی تصویریں تحریر میں ایسے بہت سے نقوش ملے ہیں جن کو بربط اور چنگ کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے ساز سمیر میں بھی مستعمل تھے۔

حکمت

اس قسم کے شواہد بہت کم دریافت ہوئے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وادی سندھ کے لوگ طب، نجوم اور علم الحساب سے بھی واقف تھے۔ البتہ یہاں سمندری جھاگ اور بارہ سنگھے کے سینگ کے ٹکڑے دریافت ہوئے ہیں۔ جن کی موجودگی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ چیزیں ضرور یہاں کے ویدوں کے نسخوں کا جزو ہوں گی۔ ایک ایسا سیاہ مادہ بھی ملا ہے جس کو سلاجیت تجویز کیا گیا ہے۔ سلاجیت ذیابیطس اور جگر کے امراض اور گھٹیا وغیرہ کے لئے اکسیر ہے اسی طرح مٹی کی ہانڈیوں میں وہ شاخہ یا استخوان ماہی رکھی ہوئی ملی ہے یہ بھوک بڑھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہو گی اور بیرونی طور پر کان آنکھ گلا اور جلدی امراض میں استعمال کی جاتی ہو گی۔ مونگے اور نیم کی درخت کی پتیاں بھی احتیاط سے رکھی ہوئی پائی گئی تھیں اور ادویات کے طور پر کام آتی ہوں گی ان تمام چیزوں سے یہ عام اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس تہذیب میں "ایور ویدک" طریق علاج ابتدائی دور میں تھا۔

صحیح سمتوں میں باقاعدہ ترتیب سے بنے ہوئے مکانات اور سڑکوں سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ سماوی اثرات کے قائل تھے اور علم نجوم سے بھی شغف رکھتے تھے۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ یہاں کے لوگوں کا سال شمسی حساب سے تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا گیا ہے کہ دریائے سندھ میں برسات کے خاص مہینوں میں طغیانی اور اسی طرح مقررہ مہینوں میں جاڑے اور گرمی کے موسم آتے ہوں گے اور موسموں کی یہ تبدیلی سورج کے عمل کے تابع ہے۔ چنانچہ قیاس کیا گیا ہے کہ یہ لوگ چاند کی کی بہ نسبت سورج سے زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ اس کا مزید ثبوت

سواستکا کے بہت سے نشانات کا پایا جانا بھی ہے جن کو سورج کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

پیشے

جو باقیات اب تک دریافت ہوئی ہیں۔ ان سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں کے ارباب علم پروہت' وید' جوتشی اور ساحروں پر مشتمل تھے۔ حکام میں حکومت کے عمال اور بلدیہ کے ملازمین تھے۔ یہاں ایک تجارت پیشہ قوم آباد تھی بیشتر لوگ صنعت کار اور اہل حرفہ میں سے تھے اور کاشتکار مچھیرے' ملاح بھیڑوں اور گایوں کے چرواہے' گاڑی بان' گھریلو نوکر' زرگر' عقیق اور ہاتھی دانت کے کاریگر' کمہار کھلونے ساز' ٹھٹھیرے' راج' معمار' مکان بنانے والے مزدور' لکڑ ہارے' سنگ تراش اور مہر تراش تھے اور ان تمام پیشہ وروں کی موجودگی کے کچھ نہ کچھ شواہد ضرور ملتے ہیں۔

❋

عربوں کی فتح سندھ

ڈاکٹر مبارک علی

اسلام کے ابتدائی زمانے میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں سندھ پر حملے ہوئے لیکن حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت کی سیاسی فضا بھی اس کے لیے مناسب نہیں تھی۔ مسلمانوں کی فوجیں دوسرے اہم محاذوں پر برسرپیکار تھیں۔ سندھ کے بارے میں ان کی معلومات محدود تھیں۔ اور ایسی دور دراز مہم پر فوج کو بھیجنا اس کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت تک سندھ کی اہمیت بھی واضح نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ جب سندھ کی سرحدیں ان کی سرحدوں سے ملیں' سیاسی حالات بدلے' تو اس وقت ایسے حالات پیش آئے جن کی وجہ سے سندھ کی فتح مسلمانوں کے لیے ناگزیر ہوگئی۔

فتح سندھ

سندھ کی فتح میں کون سے عوامل کام کر رہے تھے' سیاسی یا اقتصادی؟ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمانوں کی فتوحات جہاں ان کے سیاسی تسلط کو وسعت دے رہی تھیں وہاں مال غنیمت' جزیہ اور خراج سے ان کی خوشحالی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فاتح' مفتوح علاقوں میں آباد ہو کر وہاں کی زمینوں اور وسائل دولت سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ سندھ کی فتح کا زمانہ خلیفہ ولید (715-705) کا زمانہ ہے جب کہ خلافت کے مشرقی صوبوں کا گورنر حجاج ثقفی تھا۔ اس کے نزدیک اموی خاندان کا استحکام اور ان کی قوت و طاقت میں اضافہ سب سے بڑا مقصد تھا۔ وہ انتہائی کامیابی کے ساتھ وسط

ایشیا میں مہمات کی نگرانی کرر ہا تھا۔ اور اس کے نزدیک خلافت بنی امیہ کی وسعت ہر اس علاقہ میں ضروری تھی۔ جہاں مسلمان قوت و طاقت کے ذریعہ کامیابی حاصل کرسکیں' ساتھ ہی یہ بھی اس کا کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے علاقہ میں امن وامان قائم رکھا اور ہر طبقہ کے مفادات کا تحفظ بھی کیا۔

سندھ پر حملے کی وجوہات میں' البلاذری نے فتوح البلدان میں اور چچ نامہ کے مصنف نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو دیبل میں پیش آیا۔ مسلمانوں کے تجارتی جہاز' جن میں عورتیں اور بچے بھی سوار تھے' سراندیب (سیلون) سے آتے ہوئے دیبل کے مقام پر جو راجہ داہر کا علاقہ تھا لوٹے گئے۔ جب عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا گیا تو اس وقت ایک لڑکی نے حجاج سے مدد مانگی۔ حجاج کو اس کی اطلاع ملی تو اس سے متاثر ہوا اور فوراً سندھ کی فتح کے لیے مہمات بھیجنی شروع کیں۔ (1)

البلاذری اور چچ نامہ کے اس واقعہ کو بعد کے آنے والے مورخین نے اسی طرح سے نقل کیا ہے' اور اسے سندھ پر حملہ کرنے کی وجہ بتایا ہے۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے ''آئینہ حقیقت نما'' میں جہاں سندھ کی فتح کے دوسرے اسباب پر روشنی ڈالی ہے وہاں اس واقعہ کو سندھ کی فتح کا سب سے اہم جواز بتایا ہے۔

''اب ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے حملہ آوری کا استحقاق پیدا ہو گیا تھا یا نہیں' اگر اب بھی اسلامی لشکر حملہ آور ہونے سے تامل کرتا' اور اپنے قیدیوں کو چھڑانے اور راجہ داہر کو سزا دینے میں تساہل سے کام لیتا تو اس سے بڑھ کر سلطنت اسلامیہ کے وقار کو نقصان پہنچانے والی دوسری بات نہیں ہو سکتی تھی۔'' (2)

اگر اس واقعہ کا جائزہ لیا جائے اور حجاج کی شخصیت کو سامنے رکھا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر سندھ کے راجہ داہر کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی خرابی کی وجہ صرف یہ واقعہ ہوتا اور دوسرے سیاسی اسباب نہیں ہوتے تو کیا صرف ایک لڑکی کی فریاد حجاج کو اس قدر متاثر کر سکتی تھی کہ وہ سندھ پر ایک بڑی فوج خلیفہ کی مرضی کے خلاف اور مالی مشکلات کے باوجود بھیجتا۔ حجاج ایک زبردست سیاستدان تھا اور سیاست میں جذبات کی رو میں بہہ کر خطرناک کام نہیں کیے جا سکتے۔ حجاج نے اپنے دور حکومت میں جس طرح لاکھوں افراد کو جیل میں ڈالا اور ہزاروں لوگوں کو قتل کرایا۔ اس کے لیے ایک لڑکی کی فریاد کی کیا اتنی اہمیت ہو سکتی ہے؟ لیکن حملہ کی سب سے بڑی

وجہ اسی واقعہ میں ہے اور یہ وجہ مسلمان عورتوں اور بچوں کی حفاظت یا انسانی جذبات نہیں بلکہ سیاسی واقتصادی ہے۔ یہ تجارتی جہازوں کی لوٹ ہے جو حملے کا محرک ہوئی۔ مسلمان تاجر اس وقت تک تجارت کی غرض سے ہندوستان کے سواحلی علاقوں تک آتے جاتے تھے اور جگہ جگہ ان کی نوآبادیاں واقع تھیں۔ جزیرہ سراندیب میں بھی ان کی نوآبادی تھی اور تجارتی تعلقات قائم تھے۔ تجارتی جہازوں کو سمندر میں لوٹ لینے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد یہ بات یقینی ہے کہ مسلمان تاجروں میں زبردست پریشانی اور ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور اس بات کا خطرہ حکومت کے سامنے آیا ہوگا کہ اگر سمندری راستے کی حفاظت نہیں کی گئی تو ان کی تجارت پر اس کا اثر ہوگا۔ حجاج نے بھی ایک سیاستدان کی حیثیت سے اس بات کا اندازہ لگایا ہوگا' اس لیے اس نے راجہ داہر سے خط وکتابت کر کے جہازوں کی لوٹ کے بارے میں استفسار کیا' لیکن راجہ داہر نے سرے سے اس بات ہی سے انکار کر دیا کہ یہ جہاز اس کے اشارے پر لوٹے گئے۔(3) اس لیے حجاج کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ سندھ پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لے تاکہ دیبل کی بندرگاہ اور سمندر کا راستہ مسلمان تاجروں کے لیے محفوظ ہو جائے۔

مسلمان عورتوں اور بچوں کی گرفتاری' ایک لڑکی کی فریاد ایک ایسا واقعہ تھا جس سے مسلمان عوام کی اکثریت کو قومی جوش دے کر فوج میں شامل ہونے کی تلقین کی جا سکتی تھی۔ اور اس واقعہ کی تشہیر سے ان میں راجہ داہر کے خلاف جوش اور نفرت بھی پیدا کی جا سکتی تھی۔ اس لیے اس واقعہ کو اس قدر اہمیت دی گئی اور بعد میں آنے والے مورخین نے اسے سندھ کی فتح کا سب سے بڑا اور اہم جواز سمجھا لیکن حالات کے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے پس منظر میں تجارتی مقاصد تھے' جو سندھ کے فتح ہونے کے بعد ہی پورے ہو سکتے تھے۔ سندھ کی فتح کے بعد کے حالات نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اس سے مسلمان تاجروں کو جو تحفظات ملے' ان سے ان کی تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ اور دیبل کی بندرگاہ اور بحری راستہ کے محفوظ ہونے کے بعد وہ بلاخوف وخطر ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں آتے جاتے رہے۔

سندھ میں اسلام پھیلنے کی وجہ

سندھ میں اسلام جس قدر تیزی کے ساتھ پھیلا' یہ بھی مورخین کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ

ہے۔اس لیے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجوہات تھیں۔ جب کہ محمد بن قاسم سے لے کر دوسرے گورنروں اور بعد میں خودمختار حکمرانوں کے زمانہ تک مسلمانوں کا مقصد سندھ میں سیاسی طور پر قبضہ کرنا اور حکومت کرنا تھا۔ محمد بن قاسم نے سندھ کی فتح کے بعد نہ تو کسی کو بجبر مسلمان کیا اور نہ ہی حکومت کی جانب سے کوئی تبلیغی کام ہوا لیکن اس کے باوجود لوگ کثرت کے ساتھ مسلمان ہوئے۔

اس کے مقابلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں جہاں صدیوں تک اسلامی حکومت رہی وہاں اسلام کا غلبہ نہیں ہوا اور صوفیہ کی تبلیغ' حکومت کے اثر اور سیاسی وجوہات سے بہت کم لوگ مسلمان ہوئے۔ سندھ اور شمالی ہندوستان میں اسلام کے بارے میں یہ دو متضاد تصویریں سامنے آتی ہیں۔

سندھ میں اسلام پھیلنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں مسلمانوں کی آمد کے وقت اکثریت بدھ مذہب کو ماننے والی تھی۔ بدھ مذہب ایک فلسفیانہ طرز کا مذہب ہے' جس میں وسعت و کشادگی اور رواداری ہے۔ اس کے مقابلہ میں شمالی ہندوستان میں ہندو مذہب کا زور تھا' جسے صدیوں کی روایات نے انتہائی پختہ بنا دیا تھا۔ اس لیے اس کے عقائد میں سختی اور شدت تھی۔ یہ اس کے پیروؤں کے ذہن و دماغ میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھا' جو ہر نئی چیز سے دور بھاگتے تھے۔ اس لیے شمالی ہندوستان میں اسلام' سیاسی طاقت کے باوجود' غلبہ نہیں پا سکا۔

سندھ اور شمالی ہندوستان میں ایک فرق یہ تھا کہ سندھ میں قبائلی نظام تھا' جس میں برہمن ذات کو تسلط اور غلبہ حاصل نہیں تھا' اس لیے جب قبیلہ کا سردار مسلمان ہو جاتا تھا تو اس کے ساتھ پورا قبیلہ بھی اسلام قبول کر لیتا تھا۔ چچ نامہ میں اس کی بہت سی مثالیں دی گئیں ہیں۔ اس کے مقابلہ میں شمالی ہندوستان ذات پات کا معاشرہ تھا کہ جہاں سماج پر برہمن طبقہ کا پورا پورا تسلط تھا۔ جس نے مذہبی رسومات اور رویوں کے ذریعہ ہر ذات پات والے کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا' اس لیے اس ماحول میں اسلام وہاں پیش رفت نہ کر سکا۔ جب کہ سندھ کے ایک کھلے معاشرے میں کہ جہاں سماجی بندھن اس قدر مضبوط نہیں تھے اور مذہبی طبقے کی بالادستی نہیں تھی وہاں اسلام کو داخل ہونے میں دقت پیش نہیں آئی۔

سندھ اور عربی زبان

سندھ کی فتح، سندھ میں عربوں کی آمد، ان کی حکمرانی اور ان کے تسلط کے ساتھ ساتھ یہاں عربی زبان بھی یقیناً آئی ہوگی، لیکن یہ کیا وجہ تھی کہ سندھ کے عوام میں عربی زبان مقبول نہیں ہوئی اور یہاں کی اکثریت نے اپنے علاقے کی زبان کو ترک نہیں کیا۔ جبکہ شمالی افریقہ اور اسپین تک کے علاقے جو عربوں نے فتح کیے تھے انہوں نے وہاں تہذیبی و ثقافتی طور پر اس قدر اثر ڈالا کہ ان کی قومی زبانیں ختم ہوگئیں اور عربی کا رواج ہوا اور ان کی مادری زبان عربی ہوگئی۔

اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے جب ہم مسلمانوں کی شمالی علاقہ میں فتوحات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی فتوحات کے ساتھ ساتھ عربی زبان عراق تک آتی ہے لیکن ایران، خراسان اور وسط ایشیا کے علاقوں میں عربی زبان مقبولیت حاصل نہیں کرسکی اور قدیم فارسی زبان یا دوسری زبانیں قائم رہیں۔ عربی زبان کی اہمیت مسلمان ہونے کے بعد ان علاقوں میں صرف مذہبی زبان کی تھی۔ سندھ میں عربی زبان بھی اس وجہ سے نہیں آسکی، اس کا عرب علاقہ سے بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے یہاں کی مقامی زبان عوام میں باقی رہی۔ اس ضمن میں ایک دوسرا سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ سندھ میں جو مسلمان آباد ہوئے اور جن کی وجہ سے سندھ کی تہذیبی و ثقافتی زندگی متاثر ہوئی ان میں اکثریت عربوں کی تھی یا غیر عربوں کی؟ سندھ میں عربی زبان کے عوامی زبان نہ ہونے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان نوآبادکاروں میں اکثریت غیر عرب مسلمانوں کی تھی۔

حوالے

1- البلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر۔ فتوح البلدان، اردو ترجمہ ابوالخیری مودودی، کراچی 1962ء ص 618

2- اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔ آئینہ حقیقت نما۔ کراچی 1958ء ص 104

3- ایضاً۔ ص 104

❁

عہد قدیم سے آغاز اقتدار مغلیہ تک
سندھ کی تجارت کا مختصر جائزہ

سی ایل ماڑی والا/سعود الحسن خان

دنیا کی مختلف اقوام کا عہد عیسوی کے آغاز سے قبل کا مستند تاریخی ریکارڈ بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ اس کے بعد کا بھی جو مواد ملتا ہے اس میں زیادہ تر شاہی شان وشوکت اور دکھاوے کی اشیاء ملتی ہیں۔ ان حالات میں کوئی بھی شخص ان باتوں پر غور نہیں کرتا جن کا تعلق دوسرے امور سے ہو کاروبار کے حوالے سے کوئی بھی معلومات ہمیں براہ راست شہادت سے نہیں ملتی بلکہ ان شہادتوں سے قائم کیے جانے والے استنباط سے نکالنی پڑتی ہیں۔ ابتدائی ریکارڈ میں تجارت کے حوالے سے کوئی شہادت سامنے نہیں آتی۔ اگر تمام شہادتیں اکٹھی کی جائیں تو بہت ہی مجموعی باتیں سامنے آتی ہیں ایک اور مشکل جو کسی عالم کو سندھ جیسے ایشیائی ممالک کے بارے میں تحقیق کرنے میں پیش آتی ہے وہ عہد عیسوی کی ابتدائی چند صدیوں کے حوالے سے قابل اعتماد تاریخی مواد کی عدم موجودگی ہے۔

سندھ کی سب سے پرانی تاریخ یعنی چچ نامہ میں چھٹی صدی عیسوی سے تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس طرح سے سندھ کے قدیم حالات کے بارے میں جو کچھ بھی ملے گا وہ دوسری اقوام کے حالات میں بیان کردہ سندھ کے مختصر ذکر سے ہی تلاش کیا جا سکے گا۔ ان ابتدائی مشکلات کی وجہ سے سندھ میں عہد قدیم سے عہد مغلیہ کے آغاز تک تجارتی تاریخ کو رقمطراز کرنا کافی مشکل ہے۔

صوبہ سندھ۔ ''سپتا سندھو' سندھو دیش'' کا نام ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ میں بھی ملتا

ہے۔ ویدوں میں اسے زرخیز ترین سرزمین قرار دیا گیا ہے۔ وید کے ایک شاعر نے اسے ''جوانی اور خوبصورتی'' کا آماجگاہ قرار دیا ہے۔ وہ بڑی تفصیل سے اس کی پیداواروں اور تجارتی حالت کا تذکرہ کرتا ہے۔ (1) مگر بدقسمتی سے ویدوں کی تحریر کے زمانے میں تاحال بڑا اختلاف ہے۔ محققین آج تک اس پر اختلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ ہندوستان کی قدیم ترین دستاویزات میں سے ہے جبکہ بعض اس کو 1500-1000 برس قبل مسیح کا بیان کرتے ہیں جبکہ بعض اس کو کئی ہزار برس قبل کا بتاتے ہیں یوں سندھ کے بارے میں یہ حوالہ غیر معینہ مدت کا بن کے رہ جاتا ہے۔ اس طرح سے جو مایوسی پیدا ہوئی وہ حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے کی جانے والی بڑی بڑی دریافتوں سے دور ہو جاتی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے سندھ کی زمین کھود کر ہندوستان کی قدیم ترین ثقافت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اور یہ کوئی ایک ہی قدیم شہر ہی نہیں کہ ہے کہ جس میں قدیم ثقافت نظر آتی ہے بلکہ پورا صوبہ ان سے اٹا پڑا ہے۔ موہنجوداڑو' چانہوداڑو' جھکڑ اور آمری (2) ان ساٹھ ثقافتی مراکز میں سے چند اہم شہر ہیں کہ جن کی صوبے میں زمین کشائی ہوئی ہے۔ ان مراکز سے ہمیں صوبہ سندھ میں تین ہزار سال قبل کی تجارتی سرگرمیوں کے بارے میں بہت اہم معلومات ملتی ہے اور اسی موہنجوداڑو جیسی تہذیب یافتہ جگہ کا تعلق بھی ہے حقیقت حال یہ ہے کہ ویدوں ابتدائی ہندوستانی تحریروں اور ماہرین آثار قدیمہ کی ان دریافتوں سے بھی ہمیں سندھ کے ابتدائی عہد کی تجارتی سرگرمیوں کے بارے میں بہت اہم معلومات مل جاتی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ سندھ کے ثقافتی مراکز کے بارے میں تواریخ کا تعین میسوپوٹامیا میں مختلف مراکز کی تاریخ کے تعین سے ہوگا۔ کیونکہ ان (عراقی) مراکز میں سندھی صنعت کی کئی اشیاء ملتی ہیں۔ لاگاش (Lagash) اور اما (Umma) جیسے مقامات سے سندھی خدوخال کی حامل مہریں دریافت ہوئی ہیں۔ یہ شہر تین ہزار سال قبل مسیح میں ختم ہو گئے تھے۔ (3) اس لیے کہا جاتا ہے کہ موہنجوداڑو تہذیب پانچ ہزار سال قبل مسیح کی ہے۔ اس مفروضے کو بعد میں ہونے والی دیگر دریافتوں سے بھی تقویت ملتی ہے۔ یوں تجارتی مسئلہ تین ہزار سال قبل مسیح پر جا کر طے ہو جاتا ہے۔

یوں موہنجوداڑو اور دیگر ملحقہ شہروں سے برآمد ہونے والی اشیاء اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ سندھی صنعتی لوگ تھے اور بعض مخصوص صنائع میں تو وہ ماہر تھے۔ وادی سندھ کی مصنوعات

ہیں سب سے اہم صنعت کپڑے کی ملتی ہے۔ موہنجوداڑو سے ملنے والی اشیاء سے پتا چلتا ہے کہ وہاں پر یہ صنعت عالمگیریت کی حامل تھی جیسا کہ بعد میں ہندوستان میں یہی صنعت ترقی حاصل کر گئی تھی۔

ارزاں اور گراں مالیت کے حامل چرخے تقریباً ہر جگہ سے برآمد ہوئے ہیں۔ ماسوائے مخصوص حالات کے پانچ ہزار برس کے طویل عرصے تک کپڑے کی صنعت کا قائم ودائم رہنا بہت مشکل ہے۔ یوں پتہ چلتا ہے کہ سندھ کے کسی بھی مرکز میں کپڑے کی صنعت بہت بڑی تعداد میں نہ تھی۔ ایک چرخے سے بہت تھوڑا سا کپڑا حاصل ہوا ہے۔ اس کپڑے کا انڈین سنٹرل کاٹن انکوائری کمیٹی نے معائنہ کیا ہے۔ اس کپڑے کے جامع معائنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ سندھی جولاہے بڑی اہلیت کے حامل تھے اور وہ سوت کی بہت عمدہ قسم کا استعمال کیا کرتے تھے۔ کاٹن انکوائری کمیٹی کے ان فیصلوں کی توثیق وید کے شاعر کے بیان سے بھی ہوئی ہے جس نے سندھ کو عمدہ کپڑوں کی آماجگاہ قرار دیا ہے۔ (4) یہ بات اب تسلیم کی جا چکی ہے کہ سندھ قدیم دور میں پوری دنیا میں سوتی کپڑے کا سب سے بہترین صنعتی شہر تھا۔ جس طرح سے قدیم دور سے ہی چین نے ''چینی برتنوں'' (Porcelain) کے حوالے سے عالمی شہرت حاصل کر لی تھی اسی طرح سے سندھ کو بھی امتیازی کپڑوں کی صنعت میں خاص مقام حاصل تھا۔ سندھی کپڑے کی صنعت نے اعلیٰ معیار کی وجہ سے اپنے ملک کا نام اونچا کیا (دیگر اقوام کے درمیان جیسے مصر کو ارض اہرام میسوپوٹامیہ کو شہری تہذیب، یونان کو جمہوری حکومت کی ماں، روم کو عہد قدیم کی مالکہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے) قدیم بابل میں ''سندھ'' دراصل بناتی کپڑے (Vegetable Cloth) کا نام تھا (5) اسی چیز کا قدیم یونان میں نام ''سندھون'' تھا۔ عربی میں اسے ''ساتن'' اور عہد نامہ عتیق میں ''سادن'' (6) کہا گیا ہے۔ سوت کے درختوں سے کی جانے والی ان سندھی مصنوعات کی اتنی شہرت تھی کہ سخارب (Sennacherib) آٹھویں صدی ق۔م کا ایک آشوری بادشاہ نے سوت کے درختوں کی درآمد کی غرض سے ایک وفد ہندوستان روانہ کیا (آشوریوں کے نزدیک ہندوستان صرف وادی سندھ سے متعلق تھا) اور نینوہ میں اپنے باغات میں ان درختوں کی بوائی کی۔ انہوں نے درخت لگائے اور پھر انہیں کپڑوں کے لیے استعمال کیا۔ بعدازاں (7) زرکس (Xerxes) (450 قبل مسیح) کے عہد میں بھی سوتی کپڑے اتنے نادر تھے کہ مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس

ایرانی فوج کے ہندوستانی دستے کے بارے میں جو سندھیوں اور پنجابیوں پر مشتمل تھے۔ کیونکہ اس وقت صرف سندھ اور پنجاب ہی ایرانی سلطنت میں شامل تھے۔ کہتا ہے کہ وہ سوتی کپڑوں میں ملبوس تھے۔(8) اس طرح سے پتہ چلتا ہے کہ سندھی سوت اس صوبے کی سب سے اہم مصنوعات تھی اور اسے دنیا کے مختلف حصوں میں برآمد کیا جاتا تھا۔

موہنجوڈارو کے درخشاں عہد میں سندھ کی اگلی سب سے اہم صنعت پتھر کے کتبوں کا فن تھا۔ خاص طور پر تسبیح کے دانوں (Beads) کی مصنوعات کے لیے سندھ کو بہت شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس قدیم دور میں اس مصنوعات کے لیے ایک مرکزی صنعتی شہر بھی پایا جاتا ہے۔ نواب شاہ کے قریب چانھوداڑو نامی ایک شہر تھا جہاں پر باقاعدہ سے تسبیح یا مالا تیار ہوا کرتی تھی۔ اس مقام پر مصنوعات کے مختلف ادوار کی بہت بڑی مقدار میں تسبیحیں پائی گئی ہیں جو کہ نہ صرف اس شہر بلکہ پورے صوبے کے لیے کافی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی اس مصنوعات کی تیاری سے متعلق آلات بھی دریافت ہوئے ہیں جو اس مقام پر اس صنعت کی مرکزی پیداوایت کا ثبوت ہیں۔

سندھ کے مختلف مقامات سے ان تسبیحات کی برآمدگی سے پتہ چلتا ہے کہ ان مصنوعات کا صوبے میں کتنے بڑے پیمانے پر کاروبار تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس صنعت پر بڑے بڑے ماہرین کام کیا کرتے تھے۔ تیس مختلف قسم کا مواد استعمال کیا جاتا تھا جو نرم بھی ہوتا تھا اور سخت بھی ہوتا تھا۔ اس میں کانیلین (Cornelian) جیڈٹ (Jadeite) جسپر (Jasper) آگاٹ (Agate) لاپس لازولی (Lapos Lazuli) ٹرکوئس (Turquoise) الابسٹر (Albaster) لائم اسٹون (Limestone) پوٹری (Pottery) وغیرہ شامل تھے جو تسبیحات بنانے میں استعمال ہوتے تھے۔ ان تسبیحات کی جو اس قدیم سرزمین سے برآمد ہوئی ہیں' اشکال کی مختلف شکلوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس وقت بھی ان کی تیس مختلف اقسام تھیں۔ ان میں اسٹیٹائٹ (Stealite) ربند (Riband) جسپر (Jasper) بلیو (Blue) سرخ و پیلی جسپر (Red and Yellow Jasper) موس آگاٹ (Moss Agate) اونیز (Onyz) امازون پتھری (Amazon Stone) ہیلڈ (Helid) ٹروپ (Trope) پلازما (Plasma) ٹیشیلائٹ (tachylite) کلیسڈونی (Chalcidony) نیفیلن (Nepheline) سوڈالائٹ (Sodalite) شیل (Shell) فینس (Faience) ویٹریس پاسٹ (Vitrious paste) کوارٹز (Quartz)

سرپنٹائن (Serpentine) ہالمیٹیٹڈ (Halmatited) بیرل شیپڈ (Barrel Shaped) گلوبلار (Globular) سیگمنٹڈ (Segmented) کا گوہیل (Cogwheel) سیلینڈ یکل (Cylindrical) فلوٹیڈ ٹیپرڈ (Flutedtapered) لانگ بیرل سیلنڈر (Long Barrel Cylinder) شارٹ بیرل (Short Barrel) لانگ بیرل (Long Barrel) یعنی بیضوی شکل کا، ریکٹنگیولر (Rectangular) یعنی بیضوی نما، ریکٹنگیولر (Rectangular) نصف بیضوی اور اسی طرح کی غیر متعین شدہ اشکال شامل تھیں۔ان قابل قدر اشکال سے غیر مطمئن ہوتے ہوئے دو یا دو سے زائد مختلف قسم کے مواد سے بھی تشبیہات تیار کی جاتی تھیں۔اس نوعیت کا ایک نمونہ تقریباً 49 انچ لمبا تھا جو سرخ کارنیلین اور سفید یا نیلے شالسیڈ ونی طرح کے پانچ مختلف مادوں سے تیار کیا گیا تھا۔اس کو اتنی احتیاط سے تیار کیا گیا تھا کہ اس کے مختلف اجزاء کی الگ الگ نوعیت بھی برقرار رہتی اگر یہ کو پر کنسٹر (Copper Cannister) میں گھر کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گیا ہوتا۔مزید مختلف قسم کی تسبیحوں کو تیار کرنے کی غرض سے ایک اور طرز کا انتخاب کیا گیا تھا۔اس صورت میں شیشوں کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔نایاب اور قیمتی تشبیہات بنانے کی غرض سے ان کے دانوں کی سجاوٹ میں فینس (Faience) کا استعمال کیا جاتا تھا اس صنعت میں مہارت کا ایک نمونہ یہ بھی ملتا ہے کہ آئینی تسبیحات میں دو بڑے دلچسپ قسم یک قرینے ہوا کرتے تھے۔پہلے اسے ایک شیشے سے تیار کیا جاتا تھا، مگر جب اس کا قریب سے معائینہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں محض باریک قسم کا بھورا اور سفید سیڈہ ملایا گیا ہے ورنہ اسے تیار مٹی سے کیا گیا تھا۔مذکورہ بالا امر سے یہ بات ثابت ہے کہ قدیم سندھی لوگ تیسرے ہزار سالہ قبل مسیح کے عہد میں بھی تسبیحیں یا مالائیں بنانے میں بڑے ماہر تھے۔ڈاکٹر مے کی (Dr. Mackay) نے بھی اس بات کی حمایت کی ہے ان مصنوعات پر اپنے اختتامیہ الفاظ میں وہ کہتا ہے کہ: ”تسبیح کے دانوں کے سوراخوں کا کام بھی اسی طرح سے صفائی سے کیا گیا ہے کہ جتنی صفائی سے بیرونی سطح کا کام کیا گیا ہے۔اور کارنیلین طرز کے تخیل پتھروں پر اس طرح کا کام کرنا بڑا مہارت طلب امر ہے۔پروانے کو دو کونوں سے رگڑا گیا ہے۔یہاں تک کہ اکثر دانوں میں دو اختتامی کونے یکساں پائے گئے ہیں چونکہ دانے کے اندر بھی کسی قسم کا کوئی سفید نشان یا ریزہ رہ گیا ہے لہٰذا اس سے ان دانوں کو پالش کرنے میں بڑی فنی مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔(10) چانھوداڑو سے ملنے والے

دانے صرف صوبائی سطح پر استعمال ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ دور دراز ملکوں میں بھی بھیج دیئے جاتے تھے۔ یہ تسبیحیں وادی شنار (Shinar Valley) سے بھی برآمد ہوئی ہیں جس سے وادی سندھ کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ و آثار قدیمہ سے ملنے والی محض موجودہ مستند معلومات کی بنا پر ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ سندھ سے کن کن ممالک کو یہ چیزیں درآمد کی جاتی تھیں۔ کیونکہ یہ ہمیں صرف میسوپوٹامیا میں ملی ہیں جہاں سے وہاں کے اپنے اصلی نمونے بھی ملے ہیں۔

مغربی ہندوستان کی ایک اور مشہور پیداوار نیل (Indigo) بھی تھی جو سندھ کی بندرگاہوں کے راستے قدیم دور میں ہی مختلف ممالک میں پھیل گئی مشہور محققین لاسن (Lassen) اور ویلکنسن (Vilkinson) کی تحقیقات سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ مصر میں اہرام کی تیاری کے عہد سے ہی نیل کا استعمال بہت زیادہ تھا' مزید یہ کہ سندھ کے ثقافتی مراکز (11) سے ملنے والی اشیاء ہمیں بتاتی ہیں کہ سندھ میں نقش شدہ مہروں کی کاریگری بھی بہت پائی جاتی تھی' یہ مہریں کس حد تک قابل استعمال تھیں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کو تجارتی مقصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ البتہ ایک بات ثابت ہے کہ وہ بہت اہم امور کے لیے استعمال ہوتی تھیں جیسا کہ ان کی صنعت پر بہترین مہارت و اعلیٰ فنکاری سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ مہریں دو دریاؤں' دجلہ اور فرات کی وادی کے کم از کم دو اہم ترین مراکز سے برآمد ہوئی ہیں جس سے موہنجوداڑو کی تہذیب کی قدامات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان سندھی مصنوعات جیسا کہ موہنجوداڑو اور دیگر ثقافتی مراکز سے ثابت ہوتا ہے کہ علاوہ ویدوں کے گیتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قدیم دور میں سندھ سے اور کیا کیا اشیا برآمد کی جاتی تھیں' سندھ عمدہ گھوڑوں کے لیے کافی مفید جگہ معلوم ہوتی تھی۔ وید کے ایک مورخ نے سندھ کے بارے میں کہا ہے کہ "وہاں کے گھوڑے بہت عمدہ ہیں۔(12) پالی زبان کے ایک کتبے سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ بدھ جاٹکا لوگ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں سندھ سے اور شمالی علاقے سے سینکڑوں کی تعداد میں گھوڑے درآمد کیے جاتے ہیں۔ (13) آجنا جاٹکا (Ajanna Jataka) جب ایک رتھ سوار جنگ باز کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ اس بات کی خاص طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ اس کے رتھ میں دو سندھی گھوڑے لگے ہوئے تھے۔(14) سندھ کے عمدہ گھوڑوں کی شہرت اتنی تھی کہ بھجا جانوئی جاٹکا (Bhojajanya Jataka) اس حقیقت کو آشکار

کرتا ہے کہ بدھست (Bodhisata) اس دنیا میں ایک سندھی گھوڑے پر بیٹھ کر آیا تھا۔ اتنے قدیم دور سے سندھ میں گھوڑوں کی تجارت مشہور تھی۔

ان دنوں سندھ میں ایک اور چیز کی تجارت معلوم ہوتی ہے یعنی غذائی اناج کی سندھ غذائی مال کا برآمد کنندہ رہا ہے اور آگے اس ضمن میں حوالے بھی دیئے جائیں گے۔ ویدکا مصنف بیان کرتا ہے کہ ''اس (سندھ) کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا اور وہاں پر خوراک کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں۔'' (15) لوگ ان بڑے بڑے ذخائر کا کیا کرتے ہوں گے علاوہ ان کو برآمد کر کے ان سے نفع حاصل کرنے کے۔ کافی تعداد میں ملنے والی بلواسطہ شہادت سے اور بعد از اں برآمد ہونے کے یقینی اور براہ راست حوالوں سے اس بات کا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ویدوں کے عہد میں موہنجوداڑو کے اطراف میں مندرجہ بالا اشیاء ہی سندھ کی اہم اشیائے برآمد تھیں۔ درآمد شدہ اشیا میں کسی شیئے کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس معاملے میں صرف بلواسطہ شہادت ہی موجود ہے۔ جیولوجیکل سروے آف انڈیا کے سر ای پاسکو (Sir E. Pascoe) نے جب موہنجوداڑو کی معدنیات اور دھاتوں کا معائینہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سندھ بڑی تعداد میں خام مال درآمد کیا کرتا تھا جن سے وہ ان اشیاء کو تیار کیا کرتا تھا جو موہنجوداڑو (16) کی کھدائی کے دوران ملی ہیں۔ اس طرح سے ان اشیاء کی ایک عارضی سی فہرست تیار کی جا سکتی ہے کہ جو اس قدیم دور میں درآمد ہوئی تھیں اس میں سونا' چاندی' کاپر (Copper) لیڈ (Lead) ٹین (Tin) جیسی دھاتیں شامل ہیں اور اس کے علاوہ مختلف قسم کے پتھر بھی شامل ہیں جیسے راک کرسٹل (Rock Crystal) سلیٹ (Slate) بیٹومین (Bitumen) ریڈ اوکر (Red Ochre) اور باسلٹ (Basalt) وغیرہ۔

موہنجوداڑو اس عہد (3250-2750 قبل مسیح) میں سندھی تجارت کے شہادت کی نوعیت سے اس تجارت کی مالیت یعنی اس رقم کا اندازہ کرنا ناممکن ہے کہ جو تجارت پر صرف ہوئی تھی۔ البتہ سندھ کے بیرونی دنیا سے تجارتی تعلقات باآسانی معلوم ہو سکتے ہیں۔ سندھ کی مہریں' تسبیح کے دانے بڑی تعداد میں جھالر اور کپڑوں کی اقسام کے وادی شنگار یا میسوپوٹامیا کے ادب میں سندھی نام معلوم ہونے سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ سندھ اور خلیج فارس کے درمیان تجارتی تعلق بہت قدیم ہے۔ (17) اہرام مصر کی سرزمین میں موجود محققین مثلاً لاسین اور ولکنسن کی

شہادت بھی اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ اس قدیم ترین دور میں سندھ کے مصر سے بھی تجارتی تعلقات تھے۔(18) اس بات کی شہادت موجود ہے کہ یہ تعلق براہ راست نہیں تھا بلکہ صابین بندرگاہوں (Sabean Posts) کے ذریعہ قائم ہوا تھا۔ جیسا کہ دوسری صدی قبل مسیح میں اسکندریہ کی لائبریری کے صدر اگارتھاسائڈس(Agartharcides) کے بیان سے ثابت ہوتا ہے۔(19) خلیج فارس میں طویل سفر کرنے کی نسبت سندھی تاجروں کے لیے آسان تر اور ارزاں تر بات یہ تھی کہ وہ عربی بندرگاہوں پر اتر جائیں اور اس طرح سے اپنا واپسی کا سفر بھی طے کریں۔ اس طرح سے وہ تاجر صائبین بندرگاہوں سے مال خلیج میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ عرب کے ذریعہ ہی سندھ کے فلسطین سے بھی تعلقات تھے جیسا کہ سوت کپڑے (ساتن) کے یہودی نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ بعدازاں ایک عہد میں جبکہ روم اور یونان کے تہذیبی علبہ حاصل کر لیا تو ان دونوں کے بھی سندھ سے تجارتی تعلقات تھے۔ جیسا کہ ان دونوں ممالک میں سوتی کپڑے کے سندھی نام سے ثابت ہوتا ہے۔ بمبئی گزیٹیئر کے تالیف کنندہ نے بھی روم کے وادی سندھ سے تعلقات پر زور دیا ہے۔ اس نے تحریر کیا ہے کہ: ''مشرق اور مغرب کے درمیان تجارتی تعلقات پر بااختیار ہونے کی وجہ سے ان کی اہمیت۔''(20) سر پاسکو نے مذکورہ بالا ممالک کے علاوہ یہ بھی بتایا ہے کہ سندھ کے مندرجہ ذیل اقوام سے تجارتی رابطے تھے کیونکہ سندھ ان ممالک سے مختلف معدنیات اور دھاتیں درآمد کیا کرتا تھا۔ افغانستان' فارس (خراسان) تبت' برما' جنوبی ہندوستان اور نل گریا(Nilgria) یوں قبل از تاریخ کے دور میں بھی سندھ کے تعلقات کافی وسیع تر تھے۔(21)

ماسوائے ابتدائی آثار قدیمہ سے ہونے والی معلومات کے' کہ جس کی توثیق ویدوں کے حوالوں میں ہو جاتی ہے' آٹھویں صدی میں سندھ میں اسلام کی آمد تک کے واقعات کے بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے۔ بلکہ غیر ملکی سیاحوں کے سندھ کے بارے میں بیانات کے علاوہ کسی بھی دیگر ذریعے سے سندھ کی تاریخ کے بارے میں کوئی ڈھانچہ قائم کرنا بھی مشکل ہے۔ سیاحوں کے ان بیانات سے سندھی تجارت کے بارے میں کچھ بلواسطہ اشارے مل جاتے ہیں۔ ویدوں اور موہنجوداڑو کے قدیمی ریکارڈ کے بعد سب سے پہلا بیان مشہور ایرانی بادشاہ دارا(486-522 ق۔م) کے کتبوں میں سامنے آتا ہے۔ ان کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ دارا کے عہد میں سندھ اور

پنجاب ملا کر فارسی سلطنت کا بیسواں پیداواری حصہ تھے۔(22) مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس تحریر کرتا ہے کہ یہ بیسواں حصہ دارا کے ایام میں فارسی سلطنت میں شامل ہوا تھا۔ اس نے اپنے قابل سردار اسکائی لاکس (Skylax) کی سرکردگی میں شمال کی جانب سے یا یوں کہیے کہ گندھارا کی جانب سے وادی سندھ میں ایک مہم بھیجی تھی۔ فارسی سلطنت کے بارے میں ہیروڈوٹس کا بیان(23) وادی سندھ کے بارے میں اور بھی معلومات فراہمکرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس خطے میں سلطنت کے دیگر خطوں کی نسبت بہت زیادہ آبادی تھی۔ اور اس سے سالانہ خراج 360 کیوبک گولڈ یا 185 اکٹس (Cwts) ملتا تھا جو سب سے زیادہ تھا اور آج کے ایک میلین اسٹر لنگ کے برابر تھا۔(24) اور یہ خراج اشیاء کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا' وادی سندھ کے لوگوں نے اس قدر سونا کیسے حاصل کیا جو وہ سالانہ خراج کے طور پر ادا کیا کرتے تھے عہد موریہ سے قبل کے دور میں ہندوستان میں سونے کی مانگ کے بارے میں ڈاکٹر رادھا کمود مکرجی (Dr. Radha Kumud Mookerji) واضح طور پر تحریر کرتا ہے کہ: ''غالباً ہندوستان میں سونے کی یہی افراط تھی (جیسا کہ اس کو پوری دنیا بالخصوص روم میں سپلائی کرنے سے ظاہر ہے) جو چھٹی صدی قبل مسیح میں باہر کے علاقوں سے آ گئی تھی اور اس نے دارا کے عہد کے اس ہندوستانی خطے کو اس قابل کر دیا تھا کہ وہ اتنی بڑی مقدار میں یعنی ایک میلین اسٹر لنگ سونا ادا کر دے یعنی جو ایشیائی صوبوں کے ایک بیلین مالیہ کا ایک تہائی حصہ بنتا تھا۔(25) اس دور میں اس علاقے میں شاندار تجارتی ماحول کی بناء پر ہی ایرانی افواج نے یہاں پر حملہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر بریسٹڈ (Dr. Breasted) اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ تجارت کی شہرت نے ہی دارا اعظم جیسے سیاستدان کو اس بات پر اکسایا تھا کہ وہ ایران کو عظیم سمندری طاقت بنا دے۔(26) چنانچہ بیرونی تاریخی ریکارڈ سے یہ بات عیاں ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں بھی سندھ کی تجارت بہت شہرت یافتہ تھی۔

سندھ کا اگلا حوالہ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم کی مہم کے ضمن میں ملتا ہے اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کا بادشاہ کون تھا۔ حالانکہ پہاڑی قبائل کے حکمران کا نام سامبو (Samboo) درج ہے۔ اس بارے میں پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مورخ آرین (Arrian) نے جس خطے کا ذکر ہے وہ یقینی طور پر وادی سندھ ہی ہے۔ اس بات سے انکار

نہیں کیا جا سکتا کہ سکندر اعظم سندھ آیا تھا۔ بلا شبہ و بلا تضاد بھی اس بات پر زور دیا جا سکتا ہے کہ سکندر کی فوج دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ نیچے چلی گئی اور سندھ میں موجود کشتیوں کے ہی زریعے خلیج فارس جا پہنچی۔ اس بارے میں بھی آرین (Arrian) کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ جب وہ تحریر کرتا تھا کہ وہاں پر 800 کشتیاں تھیں جن میں سے 30 جنگی جہاز تھے اور باقی دریائے سندھ اور سمندر میں استعمال ہوا کرتے تھے۔ حالانکہ مقدونیہ کی فوج میں 124000 سپاہی تھے جبکہ سندھ اور پنجاب کے لیے اتنا بڑا جنگی بحری بیڑہ رکھنا ممکن نہ تھا (27) کشتیوں کی تعداد اور ان کے سائز اور سکندر کے ان کو استعمال کرنے سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ یہاں پر بہت زبردست تجارت ہوا کرتی ہوگی۔ یہ اندازہ ہی دراصل ڈاکٹر ونسنٹ (Dr. Vincent) کی رائے بھی ہے۔ اس حوالے سے وہ تحریر کرتا ہے کہ ''سکندر اعظم کے سپاہیوں میں سے بہت سے سپاہی ساحلی تجارت سے آگاہ تھے جس کی وجہ سے سکندر اعظم کو یہاں پر منصوبے بنانے کی بہت تقویت ملی۔'' (28) اس طرح سے ایک بار پھر سندھ میں وافر تجارت کا ثبوت ملتا ہے۔

سندھ زیادہ تر یونان سے استفادہ نہ کر سکا کیونکہ ہندوستان کے یونانی صوبے سکندر اعظم کی وفات کے بعد جلد ہی مگدھ ریاست میں شامل ہو گئے۔ ایسا سکندر کے جانشین سیلیوکس (Seleukus) جو ہندوستانی مقبوضات پر حکمران تھا اور چندر گپت موریہ کے درمیان معاہدہ کے ذریعے ہوا۔ چونکہ سندھ مگدھ ریاست کے دارالحکومت پاٹلی پتر۔ جو جدید شہر پٹنہ کے قریب ہے۔۔ سے کافی دور تھا لہٰذا یہ جلد ہی باختری شہزادوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ''ایک باختری شہزادے دمتریوس (Demetrius) (29) نے 190 اور 180 قبل مسیح کے درمیان آریانہ فتح کیا اور پاروپامسیوس (Paropamisus) عبور کر کے سندھ یا پٹالین میں داخل ہو گیا بلکہ کاٹھیاواڑ اور سورت کے اضلاع پر بھی قبضہ کر لیا۔''

''اس مہم میں اس کا مقصد بلاشبہ تجارتی تھا۔ اس نے (Pamiss) تک اپنی حدود وسیع کر لیں تاکہ بری راستے پر قبضہ کر سکے اور سندھ و کاٹھیاواڑ پر قبضہ کر کے اس نے دریائے سندھ کے راستے سمندر تک پانی کی گزرگاہ حاصل کر لی۔'' ایک خاص مدت کے اندر باختریوں کی جگہ ساکا (Sakas) یا اسکاتھین (Scythians) قابض ہو گئے جو چین سے نکل کر (30) ہندوکش تک پہنچ گئے تھے اور اس کے بعد وادی سندھ میں اتر آئے۔ بعد ازاں ان کی جگہ پارتھین (Parthian)

حکمران غالب آ گئے (31) پارتھیوں کے دور میں ہی پیرپلس (Periplus) کا نامعلوم یونانی مصنف سندھ آیا۔ اس نے سندھ کو ''ہندوسوئیتھیا'' کے نام سے پکارا ہے اور سوئیتھیا کے میٹروپیولیس(Metropolis) کو میناگرا(Minnagara) کے نام سے تشبیہ دی ہے۔(32) وہ حریر کرتا ہے کہ ''یہ پارتھین حکمرانوں کے زیر قبضہ ہے جو ایکدوسرے کو یہاں سے بیدخل کرتے رہتے ہیں۔''(33) (یہاں پر موجود تاریخ سے مشابہت ہے کہ جہاں پر شہزادے ایک دوسرے کو بیدخل کرتے رہتے ہیں)''ان میں سے تقریباً 40 نے سندھ اور پنجاب کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ بات حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے دوصدیوں بعد واقع ہوئی تھی۔''مقدونیہ کے حکمران کی فتح کے بعد سے سندھ کئی مرتبہ برے حالات سے دوچار ہوا۔ علاقے پر اپنا اختیار قائم کرنے کی غرض سے ایک کے بعد ایک نسل آتی چلی گئی اور بلاشبہ و بلاتعجب ان تیزی سے بدلتے حکمران خاندانوں کی وجہ سے تجارت بھی ضرور متاثر ہوئی ہوگی بہرحال، پہلی صدی عیسوی میں پیرپلس کا مصنف جب آیا تو ہندوسوئیتھیا پر پارتھی قابض تھے۔ اس کے وقت میں دریائے سندھ کے دہانے پر موجود بندرگاہ کا نام باربارکیم (Barbaricum) تھا جو تجارتی شہر تھا(34) مگر خیال یہ ہے کہ یہ تجارتی شہر محض تجارتی سامان چڑھانے اور اتارنے کی جگہ تھی جیسا کہ آگے ہی وہ تحریر کرتا ہے کہ ''اس سے آگے اس سرزمین میں میناگرا، سوئیتھیا کا شہر آ جاتا'' بحری جہاز باربارکیم پر آتے ہیں لیکن ان کا تمام مال اس صوبے کے شہر میں لے جایا جاتا ہے جو اندر کی جانب ہے۔ البتہ یہ مال وہاں جاتا دریا کے راستے ہے''(35) سکندر نے پٹالہ (Pattala) آباد کیا تھا جسے پیرپلس کا مصنف ''میناگرا'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ بعدازاں یہی حیثیت اور درجہ ٹھٹھہ کو حاصل ہوگیا یہاں تک کہ دریا کی وہ شاخ سوکھ گئی۔ سرزمین کے اتنے اندر کی جانب شہر کا آباد کرنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ ساحل سمندر پر دریائی اور کھلے سمندری طوفان کا شدید خطرہ رہتا تھا۔ پیرپلس دیگر جو اہم معلومات فراہم کرتا ہے وہ یہ ہے کہ سندھی ملاحوں کو مون سون کی وجہ سے تجارتی امور میں بہت فائدہ حاصل رہتا ہے۔ سب سے آخر میں وہ باربارکیم کی تجارتی منڈی میں ہونے والی درآمدت اور برآمدات کی فہرست فراہم کرتا ہے۔ سندھی بندرگاہ پر درآمدات میں سب سے زیادہ مقدار میں باریک کپڑا آتا ہے۔ جو کسی قدر جعلی تھا۔ اس کے علاوہ لینن (Linens) ' ٹوپاز (Topas) ' کورل (Coral) ' اسٹوراکس (Storax) ' فرینکنسنکس (Frankinseuse) ' شیشے

(Glassware)' سونے اور چاندی کی پلیٹیں اور کسی قدر شراب آتی تھی۔(36) مذکورہ بالا درآمدات کی فہرست سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں یہاں پر کپڑا آتا تھا۔لیکن یہ کپڑا بھی جعلی تھا۔مصراور میسوپوٹامیہ جیسے ممالک میں سل سے کپڑا تیار کیا جاتا تھااور وہی چیز پہلی صدی عیسوی میں سندھ میں درآمد کی جاتی تھی۔لینن کپڑا مصراور بابل سے بہت قدیم عہد سے آتا تھا۔بحراحمد کے جزائر سے ٹوپاز درآمد ہوتے تھےاور مونگا مغربی بحیرہ روم سے آیا کرتا تھا۔(37) پلینی (Pliny) کے دور سے ہی مونگا بہت مہنگا ہو گیا تھا۔مونگا کی تو اس ملک میں ایک بار اتنی وقعت بڑھی کہ نایاب پتھر بھی پیچھے رہ گئے۔(38) پیریپلس کے مطابق بہت سی قیمتی معدنیات شمال مغرب ایشیائے کوچک میں پیدا ہوتی تھیں۔(39) اور فارسی یا عربی بندرگاہوں کے راستے سندھ لائی جاتی تھی۔فرینکلنسن دراصل حبشہ اور عربی بندرگاہوں سے درآمد کی جاتی تھی۔اس کے عربی الاصل ہونے کی نشاندہی اس کے نام سے ہی ہو جاتی ہے یعنی''اللبان'' یہ ان دونوں ممالک سے ہی آتی ہو گی(40) کیونکہ سندھ کے ان دونوں ممالک سے تجارتی روابط تھے۔شروع میں شیشے یا آئینے فنیشیا (لبنان) مصراور سری لنکا میں تیار ہوتے تھے۔(41) یہ بات تاحال معلوم نہ ہوسکی ہے کہ سندھ میں شیشے کہاں سے آتے تھے کیونکہ سندھ کا ان تینوں ممالک سے تجارتی رابطہ موجود تھا۔سندھ جو چیزیں پہلی صدی عیسوی میں درآمد کیا کرتا تھا اب ہم اس کی جانب آتے ہیں۔پیریپلس کہتا ہے کہ سوتی کپڑا' ریشمی تھان اور نیل سندھ سے برآمد کیے جاتے تھے۔کاسٹس (Costus) تو کشمیراور اس کے ملحقہ ممالک میں تیار ہوتی تھی اور اسے خوشبو کے طور پر استعمال کیا جاتا تھااور کئی ادوار سے یہ چین میں بخورات یا دھونی جبکہ روم میں سے باورچی خانے کے مسالحے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔(42) روم اور چین میں اس کی بہت قدر تھی اور سندھی بندرگاہ کے ہی ذریعہ اس کی برآمد ہوتی تھی۔(43) یہ چیز بہت قیمتی تھی اور کئی بار ہندوستان میں تعینات یونانی جرنیلوں کی جانب سے اپنے ہم وطنوں کو بطور تحفہ ارسال کی جاتی تھی۔(44) آج بھی کاسٹس ہندوستانی بندرگاہوں کے راستے چین اور بحراحمر کی بندرگاہوں تک پہنچایا جاتا ہے۔(45) بڈیلیم جو ایک طرح کی خوشبودار گوند تھی اس کی رومی دنیا میں بہت قدر تھی۔یہ ہندوکش اور بحرہند کے درمیان موجود پہاڑوں میں پیدا ہوا کرتی تھی اور وہاں سے عربی بندرگاہوں کے راستے روم جاتی تھی۔(46) یوں دریائے سندھ کی بندرگاہوں کو اس کی تجارت میں بہت زبردست فائدہ تھا۔

لیشئیم (47) بھی رومیوں کے درمیان بہت مشہور تھا اور سندھی بندرگاہوں کے راستے بڑی تعداد میں باہر لے جایا جاتا تھا۔ کیونکہ ہمالیہ میں باربیری (Barberry) بہت بڑی تعداد میں پیدا ہوتی تھی جس سے لیشئیم نکالا جاتا تھا۔ اس کی جڑوں سے ایک قسم کی دوا بھی تیار کی جاتی تھی۔ (48) رومی علاقوں میں لیشئیم اتنا مشہور اور عام تھا کہ ہرکولانم (Herculanum) اور پومپی آئی (Pompei) کی کھدائی میں اس کے بہت بڑے بڑے مٹکے اور برتن بھرے ہوئے برآمد ہوئے ہیں۔ (49) نادر جو ایک جنجر (Ginger) گھاس یا جڑی بوٹی کی جڑی ہوتی ہے وہ روم میں دوا کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اسے خوشبو کے طور پر اور مرہم کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

یہ چیز مغربی ہندوستان بالخصوص پنجاب میں بہت عام تھی اور اسی وجہ سے بار بار یکم کے ذریعے بڑی آسانی سے برآمد کی جاسکتی تھی (50) فیروزے کی پیداوار خاص طور پر خراساں اور نیشاپور میں ہوا کرتی تھی۔ وہ قدرتی پہاڑی دروں کے ذریعے ہندوستان لائے جاتے تھے اور پھر سندھ سے برآمد کر دیئے جاتے تھے۔ اٹھارویں صدی اور اس کے بعد بھی شکارپور کے راستے فیروزے (Turquoises) کی تجارت بہت مشہور ہے۔ (51) لاپس لزونی بھی ان ہی علاقوں سے سندھ میں آتی تھی اور پھر وہاں سے مصر اور اس کے نواحی علاقوں میں برآمد کر دی جاتی تھی جہاں پر اسے زیورات وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ (52) جہاں تک کپڑے کا تعلق ہے تو اسکے بارے میں مسلمانون کا حوالہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ سندھ اور پنجاب کی صنعت سے ہی کپڑا منگوایا کرتے تھے۔ پیرپلس کے وقت مین ریشمی تھان زیادہ تر چین میں پیدا ہوتے تھے اور دو راستوں سے برآمد کیے جاتے تھے۔ خشکی کی راستے کیتھے (Cathay) کے ذریعہ یہ ہندوستانی بندرگاہوں پر آتے تھے جس میں انہیں قراقرم (53) کے علاقے سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ عرصہ دراز تک چینی ریشم مغرب کے علاقوں کو سندھی بندرگاہوں سے برآمد کیا جاتا رہا ہے۔ مگر مغربی ہندوستان پر مقدونیہ والوں کے اچانک حملے چین میں دگرگوں سیاسی حالات اور ساکاؤں جیسی اقوام کی انتشار پسند سرگرمیوں کی وجہ سے یہ راستہ بند ہوگیا اور چین کو اپنا مال کنٹون (Canton) کے ساحل سے خلیج فارس برآمد کرنا پڑا۔ (54)

کچھ زمانے کے بعد یہ پھر سے پیرپلس کے دور میں سندھ کے راستے برآمد ہو کر عرب اور بحیرہ احمر کی بندرگاہوں کے راستے بحیرہ روم لے جایا جانے لگا۔ (55) نیل تو عرصہ دراز سے مغربی

ہندوستان کی مشہور عام پیداوار رہی ہے۔ یہ چیز بڑی آسانی سے شمال ممالک مثلاً خراسان وغیرہ چلی جایا کرتی تھی۔ اس طرح سے عرب' مصر اور دیگر ملحقہ ممالک میں بھی فراہم ہوتی تھی۔ نیل کا استعمال دوا کے طور پر بھی ہوتا تھا اور رنگ کے طور پر بھی۔ پلینی (Pliny) کے مطابق اس کو موسمی بخار کے لیے دوایا مسکن (Sedative) کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا (56) اسے مصر میں رنگ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس بات کی توثیق مصر کے عہد قدیم سے بھی کی جا سکتی ہے۔ (57) پیر یپلس کی سندھ کی درآمدت اور برآمدات کے بارے میں مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں جن ممالک کے ساتھ سندھ کی تجارت تھی وہ وہی ممالک تھے کہ جو بہت قدیم دور میں بھی سندھ سے تجارت کرتے تھے اور اشیائے تجارت بھی تقریباً وہی تھیں۔ اگر چہ بہت سی نئی چیزیں بھی سامنے آئیں ہیں اور یہ چیزیں شاید قدیم دور میں بھی موجود ہوں گی مگر مستند شہادت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں فہرست میں شامل نہ کیا گیا تھا۔ جب پیر یپلس کا مصنف سندھ کے ساحل سمندر سے سوار ہو کر چلا گیا تو اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد سندھ پر کشان قوم کی حکمرانی شروع ہوگئی۔ سندھ میں موہنجوداڑو اور دیگر ثقافتی مقامات میں موجود بدھ مت کی خانقاہوں نے بڑی تعداد میں کشان عہد کے سکے برآمد ہوئے ہیں۔

لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وادی سندھ پر سے کشانوں کی حکمرانی ختم ہوگئی۔ اور چھٹی صدی عیسوی میں (58) وادی سندھ کا اقتدار اعلیٰ سفید ہن قبائل کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ان ہن لوگوں نے مقامی آبادی کو سندھ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ بہت سے سندھی اور کچھ قبائل سندھ چھوڑ کر خلیج بحرین کے جزائر میں پناہ گزین ہونے پر مجبور ہو گئے۔ (59) ہن قبائل کا دور بھی زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا اور ملک میں پھر رائے قوم کے لوگ حکمران ہو گئے۔ ان کے زیر اقتدار یہ سلطنت بہت وسیع ہوگئی اور شمال میں سندھ کی حدود قیقانی اور کردان کے پہاڑوں تک پھیل گئیں اور جنوب میں دیبل اور سمندر تک جبکہ مشرق میں کشمیر اور مغرب میں مکران تک پھیل گئیں۔ (60) بادشاہ کے پاس بے شمار دولت اور مال وزر آ گیا۔ (61) اس نے اپنی سلطنت کو چار صوبوں میں منقسم کیا۔ برہمن آباد' سیوستان' اسکلندہ اور ملتان ہر صوبے پر ایک گورنر مقرر کیا گیا۔ یہاں کا ب بادشاہ بہت چوکنا اور ہوشیار تھا اور اسی طرح سے اس کے گورنر بھی اپنے اپنے علاقوں کی حفاظت اور عوام کی خوشحالی کے ذمہ دار تھے۔ (62)

سندھ پر اسی طرح سے حکمرانی قائم تھی کہ فارس کے علاقہ نیمروز کے حکمران نے مکران کے راستے سندھ پر اچانک حملہ کر دیا۔(63) سندھی افواج اس سے بے خبر تھیں اس کے باوجود سندھی جنگجوؤں نے بڑی کوشش کی مگر ہمت ہار گئے اور جب ان کا سردار رائے سہرس تیر لگنے سے مارا گیا تو وہ بھاگ نکلے۔ اگر چہ فارسی لوگ اپنی فتح کے بعد جلد ہی واپس لوٹ گئے مگر تب سے مغرب کے راستے حملہ آوری کا راستہ کھل گیا اور اس کے نتیجے میں 711ء میں سندھ کو سلطنت اسلام میں شامل کر لیا گیا۔

رسول خدا حضرت محمدؐ 570ء کے قریب مکہ میں پیدا ہوئے اور (اسلام کی) شاندار تعلیمات کے ذریعے اور محنت طلب عملی جدوجہد کے بعد 629ء میں پورے جزیرہ نما عرب کے حکمران کی حیثیت اختیار کر گیے۔ آپ نے اپنے دور میں رومی شہنشاؤں کو بھی مخاطب کیا اور ان کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے الہامی وحی پر مبنی سچے عقیدے کو قبول نہ کیا تو ان کا زوال یقینی ہے۔ اپنی حیات میں اخلاقی تعلیمات اور ان کے عملی مظاہرے سے آپ نے مساوات ثابت کر کے دکھائی اور اپنے پیروکاروں کو بتایا کہ اس ساری آباد دنیا کو کس طرح سے ظلم و بربریت و جبر واستبداد سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ آپ نے ان کو روحانی اور عالمی بھائی چارے کا ثبوت دیا۔ 632ء میں آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشینوں نے مظلوم عوام کو اوپر اٹھانے کا عظیم بیڑہ اٹھا لیا اور اپنے عظیم مقصد کی جانب پیش قدمی کی۔ عربوں کے سب سے پہلے امتیازی پڑوسی میسوپوٹامیا فارسی اور مصری تھے۔ یہ لوگ ان عربوں کی مخالفت پر زیادہ عرصہ ٹھہر نہ سکے کیونکہ عربوں کے خیالات کو پیغمبر اسلامؐ کی سچی اور شاندار تعلیمات سے جلا مل چکی تھی اور وہ اپنے عقیدے اور متاثرہ انسانیت کو آزادی بخشنے کے مقصد کی خاطر اپنی زندگیاں بھی قربان کرنے کو تیار تھے۔ چونکہ سندھ سے عربوں کے تجارتی تعلقات تھے لہٰذا وہ اس سے واقف تھے اور شروع میں ہی اس پر حملے ہونے لگے۔ صرف چار برس کے بعد ہی عثمان بن ابوالعاص ثقفی کو بحرین کا گورنر مقرر کر دیا گیا اور عثمان نے اپنے بھائی مغیرہ کو اہل دیبل کے خلاف ایک مہم پر روانہ کر دیا جو ایک سمندری بندرگاہ تھی۔ عرب اپنی مہم میں کامیاب ہو گئے اور اہل دیبل کو شکست ہو گئی۔ مگر اس جنگ میں مغیرہ بھی مارا گیا۔ اس مہم کی وضاحت کرتے ہوئے فتوح البلدان کا مصنف تحریر کرتا ہے کہ عہد قدیم سے ہی اومان کے

راستے ساحل سمندر کے کنارے ہندوستان کی بندرگاہوں کی گزرگاہ سے تاجر واقف تھے اسی وجہ سے ابوالعاص نے اپنی مہم روانہ کی تھی۔ اسکے بعد کئی بار سرحدی حملے ہوئے البتہ آٹھویں صدی عیسوی کے شروع تک عرب ارباب اقتدار کا ذہن اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا جائے۔ ان دنوں ساحلی راستے پر قزاق غالب تھے جنہوں نے ایک بار سری لنکا کے بادشاہ کی جانب سے خلیفہ اسلام کو روانہ کیے گئے تحائف سے بھرے جہاز لوٹ لیے۔ خلیفہ نے سندھ کے حکمران داہر سے اس کی شکایت کی کہ اس کی کشتیاں واپس کی جائیں جن میں تحائف اور عازمین حج بھی سوار تھے کہا جاتا ہے کہ سندھ کا حکمران نے اس بات کی پرواہ نہ کی۔ وہ اپنی عرصہ دراز کی حیثیت' حفاظتی انتظامات کے نشے میں سرشار تھا۔ خلیفہ کو اس پر برافروختگی ہوگئی اور اس نے محمد بن قاسم کی زیرنگرانی سندھ کے خلاف ایک مضبوط فوج روانہ کی جس نے سب سے پہلے دیبل پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا۔ (65) دیبل کی فتح سندھی بادشاہ کے لیے بدشگون ثابت ہوئی سارا سندھ مسلمانوں کے زیر اقتدار آ گیا۔

قبل از اسلام کے عہد میں سندھ کی تجارتی سرگرمیوں کے بارے میں قطعی معلومات موجود ہیں۔ کئی بڑے شہروں' ان کی اہم اور قابل ذکر حالت' ان کے باشندوں کے حالات اور پیشوں کی معلومات وغیرہ ان سب سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں سندھ میں تجارت کی نوعیت کیا تھی۔ قبل از اسلام کے دور میں دیبل' نیرون' برہمن آباد' سیوستان' الور اور ملتان بڑے بڑے شہروں میں سے چند ایک نام ہیں اور ان میں سے اکثر تجارتی شاہراہ عام یعنی دریائے سندھ کے کنارے آباد تھے۔ یہ اس دور میں تجارتی ترقی کا نتیجہ ہی تھا کہ بڑی بڑی عمارتیں' شاندار باغات اور چراگاہیں' نہریں' پھل پھول وغیرہ وہاں کے باشندوں کی دولت اور خوشحالی ثابت کرتے تھے۔ (66) فتح دیبل کے بعد عراقی گورنر حجاج کہ جس نے یہ سندھی مہم روانہ کی تھی' اس کے مال غنیمت میں سے حصے کو ہٹا کر 120 ملیون درہم کا مال غنیمت دربار میں پہنچا تھا۔ جس سے لوگوں کی دولت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس صوبے کی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کے وقت سندھ میں بڑی تعداد میں صناعوں اور صنعت کاروں و فنکاروں کا تذکرہ بھی سندھ میں تجارتی عروج کی بلواسطہ شہادت ثابت ہوتا ہے۔ مذکورہ و بالا شہادت میں میں کچھ اور معلومات کا بھی اضافہ کرلیجئے

جوہمیں غیر ملکی مورخین سے ملی ہیں۔ یہ معلومات انہوں نے اپنے ممالک کے بارے میں دیں ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ پر عربوں کی فتح کہ وقت یہاں پر صنعتی عمل بہت تیز تھا اور یہ علاقہ اپنی تجارت کی وجہ سے مشہور تھا۔ حمزہ اصفہانی نے اس دور میں سندھی تجارت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے مطابق دریائے فرات کے کنارے کوفہ کے نزدیک حیرہ کی بندرگاہ پر ہندوستان اور چین کے جہاز لنگر انداز دیکھے جا سکتے تھے۔ اس دور میں سندھ اور گجرات کی بندرگاہیں جہاز رانی کی سب سے بڑی مراکز تھیں۔ (67)

526ء کے لگ بھگ کاسموس (Cosmos) اس بات کی یقینی شہادت فراہم کرتا ہے کہ سندھ کے ہندوستانی ساحلی علاقوں کے ساتھ اور خاص طور پر سری لنکا سے تجارتی تعلقات تھے۔ یہ بات تب بیان کی گئی ہے کہ جب اس نے سندھ کی ڈیلٹائی بندرگاہ سندھو یا دیبل کے بارے میں ذکر کیا کہ یہ سری لنکا کے ساتھ تجارت کے لیے دو اہم بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ مختلف تاریخی تذکروں میں تجارت کے حوالے سے مماثل باتیں سامنے آتی ہیں جن کے مدنظر کیپٹن میک مرڈو (Captain McMurdo) نے تحریر کیا ہے کہ ''اس ملک کو فطری طور پر تجارت سے فائدہ ہے اور حکومت کے زیر سایہ تجارت فروغ بھی پا گئی ہے۔'' (68) رالنسن (Rawlinson) کا اہم بیان کہ لوگوں کی زندگی کی بابت ان کے ادب سے پتہ چلتا ہے' سندھ کے بارے میں بالکل درست ہے۔ سندھ کی قدیم لوک کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس ملک میں کتنی خوشحالی تھی اور تجارت کو کتنا فروغ حاصل تھا۔ خاص طور پر سیف الملوک کا قصہ جو ایک سرمایہ دار تاجر تھا اور شمالی علاقے سے صوبائی دارالحکومت الور میں آیا تھا وہ ساری تفصیلات بیان کرتا ہے جس سے سندھ کی بالکل شفاف شکل سامنے آتی ہے کہ اس ملک کے بیرون ممالک سے تجارتی روابط کا کتنا بڑا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہانیاں محض تصوراتی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام قصوں میں اصل ہیرو عموماً تاجر ہی ہوتا ہے جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ان دنوں تجارت ہی اس ملک کا سب سے اہم خاصہ تھی۔

711ء میں عربوں کی فتح سندھ کے بعد عرب اس خطے پر کم و بیش تین سو برس تک قابض رہے۔ سلطنت اسلامیہ کے سربراہ یعنی خلیفہ نے سندھ کے انتظام کے لیے ایک گورنر مقرر کیا ہوا

تھا۔ گورنر سے پوری توقع کی جاتی تھی کہ وہ سالانہ خراج ادا کرتا رہے گا۔ یہاں کے گورنر تیزی سے تبدیل ہوتے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بھی گورنر سندھ میں پوری طرح سے قدم نہیں جما سکا۔ اس طرح سے اس دور میں تجارت زوال پذیر ہوگئی۔ ملک میں تحفظ ملنا تاجر کے لیے بہت اہم چیز ہوتی ہے ورنہ تجارت کو نقصان پہنچتا ہے۔ البتہ ملک کی فطری حالت کے پیش نظر تجارت مکمل طور پر بھی ختم نہیں ہوئی کیونکہ مقامی لوگوں کی تجارتی روایات بھی ہوتی تھیں اور عربوں کی مہم جو طبیعت بھی۔ اس طرح سے اس دور کے بارے میں کتابوں میں جو تجارتی حوالے ملتے ہیں وہ حوصلہ شکن نہیں ہیں۔ ابن حوقل جو 10 صدی عیسوی میں سندھ آیا تھا وہ دیبل کے بارے میں کافی کچھ لکھتا ہے جو سندھی ڈیلٹا کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی اور اس دور میں صوبے کا سب سے بڑا مقام۔ وہ کہتا ہے کہ ''دیبل نہ صرف اس ملک کا بلکہ اردگرد کے تمام ممالک کا ایک بڑا شہر اور بندرگاہ ہے۔ یہ اپنے اناج کی بہتات کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ یہ تلواروں کی صنعت کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہے۔ (69) ابن حوقل مزید کہتا ہے کہ ''سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں کے باشندے تجارت پر انحصار کرتے ہیں۔'' (70) عربوں کا اقتدار تقریباً 1026ء میں ختم ہوگیا کہ جب محمود غزنوی کے جنرل عبدالرزاق نے عرب گورنر کو نکال باہر کیا۔ (71)

مگر محمود غزنوی نے سندھ میں اپنا اقتدار قائم نہیں کیا۔ جلد ہی اس کے تعینات کردہ گورنر کو نکال دیا گیا اور علاقے پر راجپوت سرداروں کا قبضہ ہوگیا۔ (72) عرب دور حکومت میں زیریں سندھ میں ایک طاقتور قبیلہ سامراجی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت مجتمع کر رہا تھا یوں سومرہ قبیلہ جو نو مسلم ہندوؤں اور جزواً عرب آبادکاروں کی مخلوط نسل تھا' سندھ میں عرب اقتدار کے خاتمے پر طاقتور بن کر ابھرا۔ شروع میں انہوں نے تھوڑی ڈھیل رکھی پھر آخر کار محمود غزنوی کے تعینات کردہ گورنر سے اقتدار اعلیٰ چھین کر اسے نکال دیا۔ سومرو لوگوں کا اقتدار چودھویں صدی کے وسط میں ختم ہوگیا اس دور میں بعض وقفوں وقفوں سے سندھ نے سلطنت دہلی کی مرکزیت بالخصوص شہاب الدین غوری اور خلجی خاندان کے اقتدار کو تسلیم کرلیا۔ (73) اس دور میں سندھ میں بہتر طریقے سے قانون کا نفاذ ہوا اور نتیجتاً تاجر اور تجارتی کارندے آنے لگے۔ اسی دور میں سندھ ہندوستانی دارالحکومت کے زیادہ قریب ہوگیا اور اس رابطے نے اس کے لیے زیادہ تجارتی مواقع پیدا کر

دیئے۔ بارہویں صدی کے مشہور جغرافیہ دان اور سیاح الادریسی نے سمندروں کی اپنی مہم کے دوران سندھ کا بھی دورہ کیا۔ اس کے بیان میں دسویں صدی کے سابق مصنف کی نسبت زیادہ مواد ملتا ہے وہ کہتا ہے کہ: ''دیبل میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ کئی اشیاء کی تجارت کی جاتی ہے۔'' (74) الادریسی کے اس بیان سے سندھی تجارت کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ ''اومان کی مصنوعات سے لدے ہوئے جہاز چین اور ہندوستان کے جہاز دیبل آتے ہیں۔'' (75) اس طرح سے وہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ سندھ جن خاص ممالک کے ساتھ تجارت کرتا تھا ان میں خلیج فارس کے ممالک (عرب، ایران) چین اور ہندوستان کے مختلف صوبے شامل ہیں۔

یوں شروع سے لے کر الادریسی کے دور تک سندھی اشیاء کی تجارتی منڈیوں میں کسی تبدیلی کا نشان نہیں دکھائی پڑتا۔ چین کے ساتھ سندھ کے تجارتی ناقابل یاداشت حد تک اتنے ہی پرانے ہیں کہ خلیج فارس اور ہندوستانی صوبوں کے ساتھ اس کی ساحلی تجارت پرانی ہے اگرچہ اپنے دورے کے دوران الادریسی نے سندھی درآمدات کی کوئی مکمل فہرست فراہم نہیں کی ہے مگر وہ چند اہم اشیاء کی ذکر کرتا ہے نیز ان ممالک کا بھی کہ جہاں سے وہ آتی ہیں۔ وہ تحریر کرتا ہے کہ: ''وہ چین سے اونی کپڑا اور دیگر اشیاء لاتے ہیں اور ہندوستان سے خوشبو اور خوشبودار اشیاء لے جاتے ہیں۔'' (76) یوں چین سے سندھ کو کئی اشیاء فراہم ہوتی تھیں اور ہندوستان سے اسے مشہور عالم خوشبوئیں آیا کرتی تھیں۔ البتہ الادریسی اومان سے آنے والی درآمدات اور سندھ کی برآمدات کے بارے میں کچھ ذکر نہیں کرتا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ وہ عام اشیاء تھیں جن کی وجہ سے دونوں ممالک مشہور تھے اسی لیے مصنف نے ان کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ البتہ الادریسی کے سندھ کے بارے میں بیان میں ایک اور نقص ہے جو کہ اس کی تجارت کی وسعت کے بارے میں اس بات کو وہ اتنا کہہ کر جزواً پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ''یہاں کے باشندے سرمایہ دار اور خوشحال ہیں۔'' (77)

سندھ میں سومرو کے اقتدار اعلیٰ کے جانشین ایک دوسرے قبیلے والے نکلے یعنی سمہ جن کا

دور 1521ء کے لگ بھگ، ختم ہو گیا۔ سمہ حکمران مضبوط حکمران ثابت ہوئے اور ان کا اقتدار سومروؤں کے برعکس، سیوی (Sivi) (موجودہ سبی، بلوچستان) تک سارے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔

کچھ سرداروں نے شاہی فوج سے ٹکر لی لیکن تجربہ سے انہیں فرمانروا کی طاقت کا خوب احساس ہو گیا یوں انہوں نے مستقبل کے تصادم کو نظرانداز کر دیا اور پھر یہ علاقہ تھا بھی شاہی دارالحکومت سے بہت دور لہٰذا شاہی افواج فوراً آ بھی نہیں سکتی تھیں۔ دیگر سمہ سرداروں نے انتظامی قابلیت کے ساتھ ساتھ علمیت کا بھی ثبوت دیا جیسے جام نندو (Jam Nindo) جس کے دور میں ٹھٹھہ کا مشہور شہر پھر سے تعمیر کیا گیا جو بہت اہمیت کا حامل ہو گیا اور سندھ کا دارالحکومت بن گیا اور آخرکار اس کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ مگر آخر سمہ سرداروں کے پاس نہ تو اپنے اجداد کی سی بہادری تھی نہ ہی فراست چنانچہ 1521ء میں ارغونوں نے سندھ کو فتح کر لیا۔ سمہ اقتدار میں بھی سندھ کی تجارتی روایات برقرار رہیں۔ ابن بطوطہ جو اس دور میں سندھ آیا تھا وہ سندھی تجارت کے بارے میں کچھ دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ ابن بطوطہ کے نزدیک لاہری بندری جو سندھ کی اس وقت کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی اور دیبل کی بندرگاہ کی جانشین تھی۔ بہت بڑی بندرگاہ تھی جہاں پر یمن (عرب) اور فارس کے بہت سے لوگ آیا کرتے تھے۔ (78) اسی دور میں ابن بطوطہ ہی ہمیں ڈیلٹائی تجارت کے بارے میں بلواسطہ شہادت بھی فراہم کرتا ہے یعنی جب وہ یہ کہتا ہے لاہری بندر کے ساتھ ساتھ ٹھٹھہ سے اکٹھا ہونے والا حکومتی مالیہ تقریباً ساٹھ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتا ہے۔ (79)

اگلے پانچ برس کے اندر اندر بابر دہلی کے شاہی تخت پر قابض ہو گیا اور شاہ حسن ارغون نے جو کہ سندھ کا حکمران تھا، اس بات کو زیادہ بہتر سمجھا کہ مغل بادشاہ کی حمایت کا دم بھرا جائے وہ اس کا ہواخواہ ہو گیا اور سندھ کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ پس یہ بات ثابت ہے کہ ہندوستان میں مغلوں کے عروج تک سندھ کے بیرون دنیا سے بڑے مضبوط اور گہرے تجارتی تعلقات تھے۔

References

1. Das, Dr. A.C., *Rigvedic India*. Calcutta; 1924, pp. 72-73.
2. Mujamdar. N.G., *Explorations in Sind.*
3. Kadim Sind.
4. Das, Dr. AC, *Rigvedic India,* Calcutta: 1924, p 72.
5. Mookerji, P.K., *History of Indian Shipping and their own ships from earliest times in the Persian Gulf* etc., 912, p. 86 and Ragozia, R., *Vedic India*, p. 306.
6. Schoff. W. H., *The Periplus of the Erythraean Sea*, 1912, p. 165.
7. Breasted, Dr. J.H, *Conquest of Civilization,* p 172.
8. Mookerji, R.K., *History of Indian Shipping and their own ships from earliest times in the Persian Gulf* etc., 1912, p. 95. Herodotus speaks of Indian cotton as "The excellent wild cotton superior to sheep's wool of which the Indians made their clothes" vide Robinson, *India and the Western works*. pp. 24-25.
9. Mackay, Dr. E.J.H., "Bead making in Ancient Sind" Jour. *Am. Ori. Soc.*, Vol. 57, No. 1(1937).
10. Mackay, Dr. E.H.J., "Bead making in Ancient Sind" Jour. *Am. Ori. Soc*, Vol. 57, No. 1(1937)
11. Mookerji, R.K., *History of Indian Shipping and their own ships from earliest times in the Persian Gulf* etc., 1912, pp. 91-92.
12. Das, Dr. A.C., *Rigvedic India*, Calcutta; 1924, pp. 72-73.
13. Mookerji, R.K., *History of Indian Shipping and their won ships from earliest times in the Persian Gulf* etc., 1912, p. 78 fn.
14. Ibid.
15. Das, Dr. A.C., op.cit, pp. 72-73.
16. Pascoe, Sir E.H., *Manual of the geology of India and Burma*, 1850, Vol. I, pp. 31-32.

17. P. 127 Trajan (Roman) during his Partition expedition traveled to the mouths of the Euphrates and watched the ships spreading their sails for India, (Rawlinson, Sir H.G., *Intercourse between India and the Western World: From the earliest times to the fall of Rome*, Cambridge University Press, 1916, p. 2) Trade between the Indus valley and Euphrates in no doubt very ancient. The earliest trace of this intercourse is probably to be found in the cuneiform inscriptions of the Hittite Kings of Mittani belonging to the 14th or 15th century B.C.
18. Mookerji, R.K., *History of Indian Shipping and their own ships from earliest times in the Persian Gulf* etc, 1912, p. 91.
19. Ibid., p. 131.
20. *Bombay Gazetteer,* Vol. I, Part I, p. 490.
21. Pithawala, Maneck B.,. "A geographical analysis of the Lower Indus Basin (Sind)" *JSHS*, Vol. II, Part I, pp. 28-29.
22. Rapson, E.J., *Ancient India*, Calcutta: Susil Gupta, p. 85.
23. Ibid., p. 85.
24. Ibid., p. 85 and Mookerji, R.K., *History of Indian shipping and their own ships from earliest tiems in the Persian Gulf* etc., 1912, p. 84.
25. Mookerji. R. K., *History of Indian Shipping and their own ships from earliest times in the Persian Gulf* etc., 1912, p. 84.
26. Breasted, Dr. J.H., *Conquest of Civilization*, p. 229.
27. Vincent, Rev. William. *Dissertation on the Voyage of Nearchus*, 1797, p. 10.
28. Vincent, Rev. William, op.cit., p. 13.
29. Rawlinson, Sir H.G., *Intercourse between India and the Western World From the earliest times to the fall of Rome*, Cambridge University Press, 1916, p. 71.
30. Ibid., p. 71.

31. Rawlinson, Sir H.G., op.cit., p. 161; Haig, M.R. Maj; Gen., *Indus Delta Country*, London: Kegan Paul & Co., 1894, pp. 24-25 and Schoff, W.H., *The Periplus of the Erythraean Sea*, New York: 1912, pp. 166-76.
32. Schoff, W. H., *The Periplus of the Erythraean Sea*, New York: 1912 pp. 286 and 37.
33. Ibid, p. 37 and Rawlinson, Sir H.G., op.cit, p. 77.
34. Schoff, W.H., op.cit., p. 77.
35. Schoff, W.H., *The Periplus of the Erythraean Sea*, New York: 1912, p. 37.
36. Ibid., p. 37-38.
37. Schoff. W.H., *The Periplus of the Erythraean Sea*, New York: 1912, p. 167.
38. Ibid., p. 168.
39. Rawlinson, Sir H.G., *Intercourse between India and the Western World: From the earliest times to the fall of Rome*, Cambridge University Press, 1916, p. 120.
40. Ibid., p. 125.
41. Schoff, W.H, op.cit., pp. 220 and 68.
42. Rawlinson, Sir H.G., op.cit., p. 125.
43. Rawlinson, Sir H.G., *Intercourse between India and the Western World: From the earliest times to the fall of Rome*, Cambridge University Press, 1916, p. 124. CostusKushtha (Sank) Kut Lakdi (modern) called also upler in Karachi. (Called Puchuk in the Far East). It is the root of Saussurea lappa henoz the Roman name Radix. It fetched 5 Denarii a Lb in Rome.
44. Schoff, W.H., *The Periplus of the Erythraean Sea*, New York, 1912, p. 169.
45. Ibid., p. 169.
46. Ibid., p. 164.
47. Rawlinson, Sir H.G., op.cit, p. 126.
48. Schoff, W.H., op.cit., p. 169.
49. Rawlinson, Sir H.G., op.cit., p. 125.
50. Rawlinson, Sir H.G., *Intercourse between India and the Western World: From earliest times to the fall of Rome*,

Cambridge University Press, 1916, p. 102. Costus, Lycium and other cosmetics fetched high prices in Rome.

51. Bombay Government Records.
52. Schoff, W.H, *The Periplus of the Erythraean Sea*, New York: 1912, pp. 170-71.
53. Abbott, J, *A Reinterpretation of the Unhappy Valley*, Bombay: Oxford University Press, 1924, p. 70.
54. Ibid., p. 70.
55. Schoff, W.H., *The periplus of the Erythraean Sea*, New York: 1912, p. 172.
56. Ibid., p. 173.
57. Ibid., p. 173.
58. Mookerji, R.K., *History of Indian Shipping and their own ships from earliest times in the Persian Gulf* etc., 1912, p. 168.
59. Ibid, p. 168.
60. Chach Nama, p. 11.
61. Ibid., p. 11.
62. Elliot, Sir H.M. and Dowson, John, *History of Indian as told by its own historians*, Vol. I, London, Trubner & Co., 1876, p. 139.
63. Elliot, Sir H. M. and Dowson, John, *History of Indian as told by its won historians*, Vol. I, London: Trubner & Co., 1876, p. 139.
64. Nizamuddin, Moulvi Noor Mohammad, *Tarikh-e-Sind (Kadim Sind)*, Hyderabad: Sind Muslim Adabi Society, 1933, Vol. I, p. 140.
65. Elliot, Sir, H.M. and Dowson, John, *History of India as told by its own historians*, Vol. I, London: Trubner & Co., 1876, p. 120.
66. Elliot, Sir H. M. and Dowson, John, *History of India as told by its own historians*, Vol. I, London: Trubner & Co., 1876, p. 138.

67. Mookerji, R.K., *History of Indian Shipping and their own ships from earliest times in the Persian Gulf* etc., 1912, p. 168.
68. McMurdo, James, "An account of the country of Sindh, with remarks on the state of Society, the Government, Manners and Customs of the People," *JRAS*, Vol. I (1834), pp. 223-257.
69. Elliot, Sir H. M. and Dowson, John, *History of India as told by its own historians*, Vol. I, London: Trubner & co., 1867, p. 37.
70. Ibid., p. 37.
71. Bulchand, Dayaram, *History of Sind* (Sindhi), 1920, p. 15.
72. Ibid, p. 15.
73. Bulchand, Dayaram, *History of Sind* (Sindhi), 1920 pp. 15-16.
74. Elliot, Sir H.M. and Dowson, Johan, *History of India as told by its own historians*, Vol. I. London: Trubner & Co., 1876, p. 77.
75. Ibid. p. 77.
76. Elliot, Sir H.H. and Dowson, John, *History of India as told by its own historians*, Vol. I, London: Trubner & Co., 1867, p. 77.
77. Ibid, p. 77.
78. Ibn-I-Batuta, *Travels in Asia and Africa*, London: Routledge Kegan Paul, 1929, p. 187.
79. Ibid., p. 187.

❁

علاقائی تعلق سے سندھ کی معیشت اور معاشرہ
(1750-1950)

کلارڈ مارکووٹس/ ڈاکٹر مبارک علی

یہ مضمون کلارڈ مارکووٹس (Clarde Markovits) کی کتاب ''ہندوستانی تاجروں کی گلوبل دنیا1750-1947 سندھ کے تاجر بخارا سے پناناما تک'' ہے۔ The Global World of Indian Merchants, 1750-1947: Traders of Sind from Bukhara to Panama. Cambracdge 2000. کے دوسرے باب کا ترجمہ ہے۔کلارڈ مارکووٹس نیشنل سینٹر آف سائنٹیفک ریسرچ پیرس کے ڈائریکٹر ہیں۔

جنوب ایشیا کی تاریخ میں سندھ ایک فراموش شدہ اور نظر انداز کیا ہوا علاقہ ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سرحدی پر واقع ہے۔ ہندوستان اور خراساں کے درمیان ہونے کی وجہ سے یہ ان کو دونوں علاقے کو ملانے کا کام کرتا تھا۔ خراساں میں جنوبی افغانستان' بلوچستان' اور جنوب مشرقی ایران شامل تھے جہاں ایرانی کلچر کا زبردست اثر تھا' سندھ وقتاً فوقتاً شمال ہندوستان میں قائم ہونے والی سلطنتوں کے تابع بھی رہا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں کلہوڑہ اور ٹالپر حکمراں خاندانوں کے عہد میں اس نے مقامی سیاسی نظام کی تشکیل کی' جسے قبائلی کنفیڈریشن کہا جا سکتا ہے جو کہ اس قابل تھی کہ ایشیا کے سب سے بڑے نہری نظام کو زیریں سندھ میں نہ صرف ترقی دے

سکے بلکہ اس کو برقرار بھی رکھ سکے۔ سندھ پر حکومت برطانیہ نے قبضہ کرنے سے پہلے سندھ کے
خلاف پروپیگنڈے کی مہم چلائی اور اسے بدنام کیا اور یہ کہا گیا کہ یہ ایک پس ماندہ ریاست تھی کہ
جس کے حکمراں جابر و ظالم تھے۔ لیکن تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں تھا۔(1) اس سلسلہ میں
خصوصیت سے نیپیر اور اس کے ہمنواؤں نے سندھ کے ہندوؤں اور ان پر ہونے والے مظالم کا بڑا
تذکرہ کیا ہے تاکہ اس کو وہ اپنے حملہ اور سندھ پر قبضہ کا جواز پیش کر سکیں' اگرچہ بعد میں نیپیر نے خود
اس قبضہ کو "بدمعاشی کا ایک قدم" کہا تھا۔(2) اس لیے ہندوؤں کا نوآبادیات سے پہلے اور بعد
میں سندھ کی تاریخ میں کیا کردار رہا ہے' یہ انتہائی اہم سوال ہے کیونکہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی
سندھ کی تاریخ واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔

سندھ کی تجارت: 1750 سے پہلے کا پس منظر

سندھ برصغیر کا ساحلی علاقہ ہے' خلیج فارس کے قریب ہونے کیوجہ سے ابتدا ہی سے یہ اس
سے تجارتی تعلقات رکھتا تھا۔ اس نے وسط ایشیا اور برصغیر کو بھی تجارتی طور پر ملانے کا کام کیا۔ اس
طرح خشکی اور سمندری دونوں راستے اس کی تجارتی اہمیت کو متعین کرتے تھے۔(3) یہاں یہ کہنے
کی ضرورت نہیں کہ ہڑپہ کے تہذیبی دور میں موہنجوداڑو اور میسوپوٹامیہ کے درمیان تجارتی تعلقات
تھے' لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ آٹھویں صدی میں عربوں کی سندھ کی فتح کی وجہ بھی تجارتی تھی۔
(4) عربوں کی فتح کی ایک وجہ انڈس ڈیلٹا میں واقع بندرگاہ یا بندرگاہوں پر قبضہ کرنا تھا۔ دیبل کی
بندرگاہ پانچویں صدی عیسوی میں اہمیت کی حامل ہوئی' جب اس پر ایران کے ساسانیوں کا قبضہ تھا
اور 632(5) میں یہاں پر عربوں کے جہاز پہلی مرتبہ آئے۔ 711ء میں محمد بن قاسم کا قبضہ عرب
فتح کی ابتداء تھی۔ اس وقت کے سندھ کے بارے میں ایک مصنف کی رائے تھی کہ بحر ہند کی تجارت
کا انحصار سندھ پر ہے۔ اس کے خشکی کے راستے تجارتی قافلوں کی راہ گزر ہیں۔(6) عربوں کی فتح
سندھ کے بعد سندھ اسلامی امپائر کا ایک حصہ بن گیا اور خلیج فارس و مشرق وسطیٰ سے اس کی تجارتی
سرگرمیاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ دیبل کی بندرگاہ بارہویں صدی تک انتہائی اہم رہی۔(7) جب
دیبل کی بندرگاہ کا زوال ہوا تو متوازی طور پر لاہری بندر کا قیام عمل میں آیا۔ جو ٹھٹھہ کے شہر کی
تجارتی و کاروباری مرکز ہونے کی وجہ سے اہمیت اختیار کر گئی 1330 کی دہائی میں ابن بطوطہ نے

اس بندرگاہ کی سیر کی تھی۔(8) ہمیں ان لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں کہ جوان دنوں تجارت میں مصروف تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس عہد میں عرب تاجر اور سندھ کے تاجر دو علیحدہ گروپوں میں تقسیم تھے۔(9) یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا پندرہویں صدی سے پہلے بھی ہندو تاجران سرگرمیوں میں شامل تھے؟

سندھ کے بنیوں کے بارے میں پہلا ذکر عرب اور پرتگیزی دستاویزات میں ہے کہ جن کا تعلق مسقط سے تھا۔ یہ ذکر پندرہویں صدی کے اواخر میں آیا ہے۔ ٹھٹھہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ''مسقط کا سب اہم ساتھی ہے اور مزید کہا ہے کہ ہندو بھاٹیہ سندھ اور عرب کے درمیان تجارت کرنے والے لوگ ہیں۔''(10) یہ لوگ پرتگیزی جہاز استعمال کرتے تھے اور ان کے مسقط میں تجارتی گودام تھے۔ جب پرتگزیوں نے ہرمز کی بندرگاہ پر قبضہ کرلیا' تو ان کی دستاویزات کے مطابق سندھ سے تجارت کے نتیجہ میں دس فیصد کسٹم ریونیو حاصل ہوتا تھا۔ ڈیگو دا کوٹوا (Diego de Couta) کے مطابق ٹھٹھہ کا شہر مشرق کے امیر ترین شہروں میں سے ایک تھا۔(11) ٹھٹھہ کی خوش حالی کی ایک وجہ تو اس کی کپڑے کی صنعت تھی' جو کہ اعلیٰ کوالٹی کی تھی' اس میں کاٹن کے کپڑوں کی مختلف قسمیں تھیں جن میں سادہ کپڑ' بافتہ' چھینٹ اور سلک کا بنا ہوا اعلیٰ قسم کا کپڑا قابل ذکر تھیں۔(12) ٹھٹھہ میں پنجاب اور شمالی ہندوستان سے تجارتی قافلے دریائی راستوں کے ذریعہ اپنا مال لاتے تھے۔ سولہویں صدی میں جب کہ زیریں سندھ مغل سلطنت کا ایک حصہ بنا ہے تو اس کے بعد سے ٹھٹھہ کی خوش حالی میں کمی آ گئی تھی کیونکہ اب خلیج فارس کی تجارت دوسری مغل بندرگاہوں سے ہونے لگی تھی۔ 1640ء کی دہائی میں ٹھٹھہ کو ایک بار پھر تھوڑے وقت کے لیے اہمیت ملی کہ جب یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پرتگالیوں کو نکال دیا سترہویں صدی کے اوائل میں لاہری بندر مٹی کے جمع ہونے کی وجہ سے استعمال کے قابل نہیں رہا' اس نے ٹھٹھہ اور بندرگاہ دونوں کو زوال پذیر کر دیا۔ اگرچہ مغلوں نے ایک اور بندرگاہ ''اورنگ بندر'' کو ترقی دینے کی کوشش کی مگر تجارت شاہ بندر اور کھڑک بندر کی جانب منتقل ہوگئی' لیکن یہ دونوں خوش حالی کی اس اسٹیج تک نہیں پہنچ سکیں کہ جو ٹھٹھہ کو حاصل ہوئی تھی۔ یہاں پر کچھ ایسے شواہد ملتے ہیں کہ سترہویں صدی میں جبکہ سمندری تجارت زوال کی حالت تھی تو اس زمانے میں مقامی سندھی بنئے تجارت میں آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے پرتگیزی جہازوں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے جہازوں

میں سامان تجارت بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ الگزنڈر ہملٹن جو 1699ء میں سندھ آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ یہاں پر تجارت ہندو تاجروں کے ہاتھ میں ہے۔(13) اگرچہ ٹھٹھہ کا زوال شروع ہو چکا تھا' لیکن اس کے بھاٹیہ تاجر اس وقت بھی مسقط میں تجارت میں مصروف تھے جہاں انہوں نے شہر میں پہلا مندر تعمیر کیا تھا۔(14) ایسے شواہد ہیں کہ انہوں نے اپنی تجارت کو خلیج کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیلا دیا تھا جیسے بحرین کے جزیروں میں۔ لیکن سندھ کے بھاٹیہ اکیلے نہیں تھے جو تجارت میں مشغول تھے سیٹھ ناؤمل نے جو انیسویں صدی میں کراچی کا اہم تاجر تھا اس نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اس کے اجداد سیٹھ بھوجومل' اور اس کا خاندان جن کا تعلق سہون شہر سے تھا 1720 میں وہ کھڑک میں آ کر آباد ہوئے' یہاں انہوں نے اپنی تجارت کمپنی قائم کی۔ جس کے گماشتے مسقط میں تھے اور پھر ان کے نمائندے بوشہر' شیراز اور بحرین میں تھے۔(15) 1720ء کی دہائی میں جب کھڑک ہندو کا زوال ہوا' تو سیٹھ بھوجومل نے کراچی کی نئی بندرگاہ کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی تعمیر اور حفاظتی فصیلوں کے بننے کے بعد اس پر کلھوڑا حکمرانوں نے قبضہ کر لیا' لیکن جلدی انہوں نے اسے قلات کے خاں کے حوالے کر دیا' جو کہ اس وقت بلوچستان کا ایک اہم حکمراں تھا۔ اس طرح پاکستان کے اس بڑے شہر کی ابتداء ایک ہندو بنئے نے کی تھی۔ یہ اٹھارویں صدی کے اواخر کی بات ہے کہ اس بندرگاہ میں ٹالپر حکمرانوں نے دلچسپی لینی شروع کی۔

اٹھارویں صدی کے نصف تک سندھ سمندری دریائی اور خشکی کے راستوں کے ذریعہ شمالی ہندوستان اور خلیج فارس اور عرب ملکوں کو تجارتی طور پر ملانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے تاجروں کی خوشحالی کا دارومدار اس علاقہ کی اپنی پیداوار اور صنعت پر تھا۔ ٹھٹھہ اپنے بندرگاہ کے زوال کے بعد بھی کپڑے کی صنعت کی وجہ سے ممتاز شہر رہا سندھ کے تاجروں میں ہندو بنئے سب سے زیادہ کامیاب تاجر تھے۔ اگرچہ مسلمان بھی تجارت میں تھے' مگر بنیوں کو اس پیشہ میں شہرت تھی یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک ایسے ملک میں کہ جہاں مسلمان حکمراں ہوں اور جہاں کی آبادی پندرہویں سے اٹھارویں صدیوں تک اکثریت میں مسلمان ہو گئی ہو' وہاں تجارت اور معیشت پر ہندوؤں کا تسلط ہو؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس پر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہمیں یہاں پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل اٹھارویں صدی سے پہلے کی سندھ کی سماجی اور معاشی تاریخ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں' اس لیے ہم اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں

دے سکتے۔ اس سلسلہ میں ایک مقبول عام نظریہ تو یہ ہے کہ چونکہ قرآن شریف میں سود کو حرام قرار دے دیا ہے' لیکن جیسا کہ ایم رابنسن نے دلیل دیتے ہوئے کہا کہ اس کے باوجود مسلمان سود کے کاروبارے میں ملوث رہے۔ (16) دوسری صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلمان ریاستوں میں ریونیو جمع کرنے اور مالیہ کے انتظامات میں غیر مسلم اہل کار رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ سیاسی طور پر کمزور اور عدم تحفظ کا شکار ہوتے تھے اور انہیں آسانی سے قابو میں رکھا جا سکتا تھا' سندھ میں مالی امور کے انتظام کے لیے ہندوؤں کی ایک خاص برادری کو یہ کام سونپا گیا تھا جو کہ عامل کہلاتے تھے۔ ان کی ابتداء سندھ میں مغل تسلط کے بعد ہوئی' انہوں نے یہاں بھی وہی کردار ادا کیا کہ جو شمالی ہندوستان میں کایستھوں نے مغل دربار میں کیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عاملوں کے عروج اور بنیوں کی ترقی دونوں متوازی طور پر ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔ ایک ایسے ماحول میں کہ جب عامل ریونیو کے انتظام میں مصروف تھے' بنئے تجارت میں آگے بڑھ رہے تھے۔

سندھ میں تجارت اور معاشرہ: 1750 سے 1843 ہندو بنیوں کا کردار

اٹھارویں صدی کے نصف میں سندھ کی تاریخ میں تبدیلی آئی' اگر اس سے پچھلے دور کے حالات کو دیکھا جائے تو تبدیلی کے ان رجحانات کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ یہ وہ اہم سیاسی تغیرات تھے کہ جنہوں نے تجارتی معاملات پر گہرا اثر ڈالا۔ پندرہویں صدی کے اواخر سے اٹھارویں صدی کے نصف تک زیریں سندھ اور اس کا شہر ٹھٹھہ اہم تجارتی مرکز تھا' جب کہ اس صدی کے آخر میں کراچی ایک متبادل بندرگاہ کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ اس دوران میں بالائی سندھ اور اس کے شہر پنجاب شمالی ہندوستان اور وسط ایشیا کے تجارتی قافلوں کو زیریں سندھ کی بندرگاہوں تک لاتے تھے۔ وسط ایشیا اور شمالی ہندوستان کی تجارت کا زیادہ حصہ بالائی سندھ کو نظرانداز کر دیتا تھا' کیونکہ ملتان اس وقت تجارتی قافلوں کے لیے تجارت اور معیشت کا بڑا مرکز تھا۔

لیکن اٹھارویں صدی کے نصف میں تجارت نے جنوب کی جانب رخ موڑ لیا' جس کی وجہ سے بالائی سندھ کو فائدہ ہوا۔ اس کی وجوہات سیاسی تھیں۔ دو اہم باتوں کی وجہ سے بالائی سندھ کی اہمیت بڑھ گئی۔ ان میں ایک وجہ تو ملتانی گروبندی کا زوال تھا' جس نے سترہویں صدی میں شمالی

ہندوستان اور روس اور وسط ایشیا کے درمیان تجارت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اسٹیفن ڈیل (Stephen Dale) نے ملتانی تجاروں کے زوال کا سبب روسی ریاست کے اس فیصلہ کو قرار دیا کہ جس نے ہندوستانی تاجروں کو روس کی اندرونی تجارت سے خارج کر دیا تھا' ساتھ ہی روس اور ایران کے درمیان تجارت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔(17) اس کے علاوہ دوسرے سیاسی حالات اس سے زیادہ موثر ثابت ہوئے۔ مثلاً ان حالات کو جے گومنس (J. Gommenis) انڈو افغانی امپائر کا عروج کہتا ہے۔(18) پشتون قبیلہ جو خود کو درانی کہتا تھا' اس نے جو سلطنت قائم کی اس کا مرکز قندھار تھا۔ جس کی وجہ سے یہ شہر شمالی ہندوستان کے درمیان تجارت کا تعلق بن گیا۔ اس شمالی ہندوستان اور قندھار کے درمیان سب سے مختصر راستہ بلوچستان اور بولان کا درہ ہو گیا' یہ کوئٹہ کو بالائی سندھ سے ملاتا تھا اور آگے چل کر تھر کے ریگستان سے ہوتے جیسلمیر اور بیکانیز تک جاتا تھا۔ یہ راستہ کہ جو اب تک نظر انداز تھا درانی سلطنت کے قیام کے بعد اچانک اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ اس کی وجہ سے بالائی سندھ میں واقع شکار پور نے ملتان کی اہمیت کو گھٹا کر تجارتی شہر کی اہمیت حاصل کر لی۔ اگرچہ اس سلسلہ میں بہت سے حالات کی حیثیت سربستہ رازوں کی ہے' لیکن بہرحال یہ واضح ہے کہ اٹھارویں صدی کے نصف میں شکار پور درانی سلطنت کا اہم مالی شہر بن کر ابھرا اور اس شہر کے وہ خاندان کے جو ہنڈی کا کاروبار کرتے تھے' وہ نہ صرف افغانستان' بلکہ ایران و وسط ایشیا تک اپنے کاروبار کو پھیلائے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ تجارت کا بھی مرکز تھا' مگر اس کی تجارتی اہمیت اس قدر نہ تھی' جس قدر کہ اس کی مالی حیثیت تھی یہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا کہ بالائی سندھ کے ایک شہر نے معاشی طور پر زیریں سندھ کے شہروں پر فوقیت حاصل کر کے انہیں ایک لحاظ سے پسماندہ کر دیا۔

اس دوران زیریں سندھ میں بھی تبدیلیاں آ رہیں تھیں۔ ٹھٹھ کے زوال کے بعد کراچی کی بندرگاہ ابھر رہی تھی۔ حیدرآباد ایک اہم شہر کے طور پر منظر عام پر آ رہا تھا کہ جس نے آگے چل کر سیاست اور کاروبار میں موثر طور پر حصہ لیا۔ ٹھٹھ کا شہر لاہری بندر کے بند ہونے کے بعد ویران ہو گیا تھا اور اپنی تجارتی اور اقتصادی حیثیت کھو بیٹھا تھا۔ اس کے نتیجہ میں اس کے بھاٹیہ تاجر کو جنہیں 1785ء کے بعد سے اپنے حریف کچھی بھاٹیہ تاجروں سے واسطہ پڑا' انہوں نے جلد ہی مسقط کی تجارت پر قبضہ کر کے' انہیں پیچھے دھکیل دیا۔(19) ٹھٹھ اب صرف صنعت و حرفت کی پیداوار کا شہر

رہ گیا کہ جو صرف مقامی ضروریات کی اشیا پیدا کرتا تھا' بین الاقوامی تجارت سے اس کا رابطہ کٹ گیا۔ اگرچہ بھاٹیہ تاجر خلیج فارس میں اہم تجارتی برادری کی حیثیت سے باقی رہے اور بعد میں انہوں نے بحرین میں موتیوں کی تجارت کے فروغ میں حصہ لیا۔ لیکن 1750 کے بعد کراچی سندھ کی اہم بندرگاہ بن گیا۔ جب سندھ کے ٹالپر میروں نے اسے قلات کے خان سے واپس لیا ہے تو انہوں نے بندرگاہ کی ترقی میں دلچسپی لی۔ اس نئی بندرگاہ پر نہ صرف سندھ کے تاجر آئے' بلکہ کچھ اور کاٹھیاواڑ سے ہندو مسلم تاجروں کی برادریاں یہاں آ کر آباد ہونا شروع ہوئیں' جس سے اس شہر کو کاسمو پولٹن درجہ دے دیا۔ ایک دوسرا شہر کو جو تیزی سے ترقی پذیر ہوا وہ حیدر آباد تھا۔ (20) جسے 1769ء میں کلھوڑا حکمراں نے نیرون کوٹ کے مقام پر آباد کیا تھا۔ یہ شہر پھلیلی نہر کے ساتھ ساتھ آباد ہوا۔ اگرچہ کلھوڑا اسے اپنا دارالسلطنت بنانا چاہتے تھے' مگر اس منصوبہ کو پورا کرنے والے ان کے ٹالپر مرید تھے کہ جنہوں نے 1782ء میں کلھوڑوں کو شکست دے کر اور ان کے دارالسلطنت خدا آباد کو کہ جو سہون کے قریب تھا' مسمار کر کے حیدر آباد کو اپنا مرکزی مقام منتخب کیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آخر وہ کون سی وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا' لیکن ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے نام نہاد افغان حکمراں کے درمیان کہ جنہیں وہ خراج دیتے تھے طویل فاصلہ رکھنا چاہتے ہوں گے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کراچی کی ابھرتی ہوئی بندرگاہ کے نزدیک اس کی قربت بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اگرچہ حیدر آباد سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کا مرکز تھا' لیکن یہاں دربار ہونے کی وجہ سے تاجر اور بنکر ز صنعت کار اور ہنر منداس سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ شہر ایک ایسے تجارتی راستہ پر واقعہ تھا کہ جہاں سے تجارتی قافلے تھر کے ریگستان سے ہوتے ہوئے' عمر کوٹ' باڑمیر سے ہو کر جودھپور تک پہنچتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے زیریں سندھ کے تجارتی نظام میں مکمل تبدیلی آ چکی تھی' اب تک جو کام ٹھٹھہ شہر کرتا تھا' اب اس کی جگہ کراچی نے لے لی تھی۔ اور حیدر آباد بھی اس میں اپنا حصہ بٹا رہا تھا۔ اس دوران شکار پور معیشت اور تجارت کا مرکز بن کر ابھر رہا تھا جس کی وجہ سے بلائی سندھ کی اہمیت بڑھ رہی تھ اس کا یہ ابھار افغانستان میں درانی سلطنت کا محتاج تھا اگرچہ شکار پور کے راستے وسط ایشیا تجارتی قافلے جاتے تھے اور اس کے حیدر آباد اور کراچی سے بھی تعلقات تھے' جو کہ بہت زیادہ قریبی نہیں تھے' لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اٹھارویں صدی کے

آخر میں سندھ ہندوستان اور وسط ایشیا خلیج فارس کے درمیان اہم تجارتی اور معاشی مرکز تھا۔ زیریں سندھ اور بالائی سندھ کے درمیان فرق موجود رہا۔ شکار پور 1824ء تک افغانستان کے زیر نگین تھا' اس کے بعد ہی یہ ٹالپر حکمرانوں کے تسلط میں آیا۔

انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جو ایک اہم تبدیلی سندھ کی تجارت میں آئی وہ یہ تھی کہ یہ مالوہ کی افیم کے سلسلہ میں وسط ہند اور چین کے درمیان ایک رابطہ بن گیا۔ اگرچہ یہ اس تجارت کا کوئی راستہ تو نہیں تھا' مگر یہ تبدیلی اس لیے آئی کہ افیم کی تجارت کے سلسلہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور مقامی ہندوستانی تاجروں میں تصادم ہوا' جس نے سندھ کے راستہ چین کے لیے افیم کی تجارت کے راستے کھول دیئے۔ اگرچہ مالوہ افیم کی تجارت کے بارے میں پوری معلومات اب تک دستیاب نہیں ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ مالوہ افیم کی تجارت 1770 سے 1870 تک ہندوستان میں سرمایہ کی بڑھوتری میں اہم عنصر تھی۔ اور یہ کہ ہندوستان میں مختلف تجارتی جماعتوں نے اس کے منافع سے خوب سرمایہ اکٹھا کیا۔ اس کے ثبوت میں یہاں کچھ اعداد و شمار دیئے جاتے ہیں۔ ہمارا تعلق اس پوری داستان سے صرف اتنا ہے کہ جس میں 1820 کی دہائی سے 1830 کی دہائی تک سندھ کی تجارت و معیشت اس سے اثر انداز ہوئی کہ یہ زمانہ 1843ء میں سندھ پر برطانوی قبضہ سے پہلے کا ہے۔

یہ 1821ء کی بات ہے کہ برطانوی حکومت ہند کے نوٹس میں سندھ کے اس چکردار راستہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ جو مالوہ کی افیم کے لیے استعمال ہوتا تھا' لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ راستہ پہلے ہی سے استعمال ہوتا ہو' یہ تجارت اس وقت سے شروع ہوئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ فیصلہ کیا کہ مالوہ کی تمام افیم خرید کر اس پر اجارہ داری قائم کی اور اس کی تجارت کے لیے صرف برطانوی علاقوں اور ان کے راستوں کو مخصوص کر دیا۔ اس پر ہندوستان کے مقامی تاجروں نے برطانوی پالیسی کی مخالفت میں افیم کی تجارت کے لیے سندھ کے راستے کو منتخب کر لیا۔ یہ راستہ جیسا کہ سرکاری دستاویزات میں بیان کیا گیا ہے پالی (Pali) سے شروع ہوتا تھا جو کہ جودھپور کے راجہ کا علاقہ تھا' یہاں پر مالوہ کی مختلف منڈیوں سے افیم خرید کر لائی جاتی تھی' جن میں کہ سب سے ممتاز اجین کی منڈی تھی' یہاں سے اونٹوں پر لاد کر یہ تھر ریگستان پار کر کے جیسلمیر آتی تھی اور پھر عمر کوٹ کے راستے وادی سندھ اور کراچی کی بندرگاہ پر۔ یہاں کشتیوں میں لاد کر اسے ہندوستان کے

پرتگیزی علاقہ کی بندرگاہ دماؤ لے جایا جاتا تھا اور پھر مکاؤ کی بندرگاہ پر چین کی منڈیوں کے لیے لے جائی جاتی تھی۔(21)

فروری 1822ء میں بمبئی کے ریونیو ڈیپارٹمنٹ نے اپنے ایک خط میں جو کہ فورٹ ولیم کے حکام اعلیٰ کو لکھا گیا تھا' اس میں اس احکامات کا ذکر کیا ہے کہ جو برطانوی عہدیداروں نے اس خفیہ تجارت کو روکنے کے سلسلہ میں کیے تھے' اور ان اقدامات سے آگاہ کیا تھا کہ جن کے ذریعہ برطانوی علاقے اور اس کی حمایتی ریاستوں میں اس تجارت کو روکنے کی غرض سے کیے تھے تاکہ اس پر اس قدر سختی کی جائے اور اس کو اس قدر مشکل بنایا جائے کہ افیون کے ان تاجروں کے لیے یہ غیر منافع بخش ہو جائے۔ مزید کہا گیا ہے کہ اگر جیسلمیر اور پالی کے راستوں کو بند کر دیا جائے اور امیران سندھ کو مجبور کیا جائے کہ وہ سندھ کے علاقے سے افیون کی تجارت کی اجازت نہ دیں' خصوصیت سے کراچی کی بندرگاہ کو استعمال نہ کرنے دیں۔ لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی کیا گیا کہ کمپنی کی حکومت ایک ایسی حکومت سے کسی قسم کی حمایت یا مدد کی کے لیے کیا توقع کرسکتی ہے کہ جس کی پالیسی سے ہم متفق نہیں ہیں اور جس پر ہم شک کرتے ہیں۔ اس کے بعد آٹھ سالوں کے اندر تجارت میں اتار چڑھاؤ رہا۔(22) لیکن اس دوران میں برطانوی حکومت کی یہ کوشش کہ ان ریاستوں سے کہ جہاں جہاں سے یہ راستے گزرتے تھے' ان سے معاہدوں کے بعد اس تجارت کو روک دیں لیکن ان کی یہ کوشش مکمل طور سے ناکام ہوئیں۔

1830ء میں حکومت نے افیون کی تجارت پر پابندیوں کی اس پالیسی کو ترک کر دیا' اور اس بات کی کوشش کی کہ مالوہ افیم کی تجارت کو داماؤ کے بجائے ان راستوں کے ذریعہ کرے کہ جن سے بمبئی کو فائدہ ہو' لیکن اس میں بھی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ مالوہ کی افیم داماؤ اور کراچی کے ذریعہ 1838ء تک چین تک پہنچتی رہی۔ ایک برطانوی عہدیدار کی 1837ء کی رپورٹ کے مطابق کراچی کے ذریعہ ہونے والی تجارت برآمدی تجارت کا ایک بڑا حصہ تھی۔ تجارت کی اس اہمیت کے ساتھ ساتھ اس نے سندھ کو ہندوستانی تجارتی سسٹم سے ملا دیا کہ جو چین' جنوب مغربی ایشیا اور وسطی ہندوستان کے درمیان تھا۔ کیا یہی وجہ تو نہیں تھی کہ برطانیہ نے سندھ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس طرح تجارت کے اس راستہ کو بند کر دیا جائے۔ اس موضوع پر حال ہی میں ایک مقالہ میں اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔(23) میں اس موضوع پر زیادہ تو نہیں کہوں گا' مگر اس کی جانب اشارہ

ضرور کروں گا کہ 1839ء میں جب برطانوی افواج نے کراچی پر قبضہ کیا ہے تو انہوں نے موثر طریقہ سے پالی سے کراچی کے راستہ کو بند کر دیا اور افیون کی تجارت بمبئی کے ذریعہ ہونے لگی۔ یہ وہ کام تھا کہ جس کی کامیابی کے لیے انہوں نے بیس سال تک کوشش کی تھی۔

مختلف دستاویزات کے شواہد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس تجارت میں بنئے براہ راست شریک نہیں تھے' نہ تو وہ مالوہ سے افیم کی خریداری کر رہے تھے اور نہ ہی اسے جہازوں کے ذریعے کراچی سے داماؤ بھجوا رہے تھے۔ اس کاروبار میں ایک طرف تو مالوہ کے ساہوکار جن کی اکثریت گجراتی اور مارواڑی تھے اور جو کہ مالوہ میں آباد ہو گئے تھے اور جن کے اس علاقہ کی مقامی ریاستوں سے گہرے روابط تھے' خاص طور سے گوالیار اور اندورے' یہ وہ علاقے تھے کہ جہاں افیم کی کاشت ہوتی تھی' دوسری طرف ان کے ساتھ پارسی اور گجراتی سیٹھ جن کا تعلق بمبئی' احمد آباد' سورت سے تھا اور کچھ پوربندر اور کچھ کی مقامی ریاستوں کے باشندے' تھے' اس تجارت کے نتیجہ میں سندھ کے بنیوں کو جو منافع ہوا' اس کی تفصیل مختلف ماخذوں سے اکٹھی کی گئی ہے۔ ان بنیوں نے ایک طرح سے ''مڈل مین'' کا کردار ادا کرتے ہوئے قافلوں کی دیکھ بھال کی اور مختلف ٹیکسوں کی ادائیگی کرنے میں ان کی مدد کی۔ اگرچہ تجارتی قافلے پالی میں مارواڑی تاجروں کی مدد سے منظم ہوا کرتے تھے' لیکن جیسا کہ برنز ہمیں بتاتا ہے کہ مارواڑی اونٹ ایک حد تک تھر کے ریگستان میں سفر کر سکتے تھے' اس کے بعد سامان کو سندھ کے اونٹوں پر لادا جاتا تھا' اس میں بنیوں کی مدد درکار ہوتی تھی۔ لیکن منافع کا خاص ذریعہ ٹیکسوں کی ادائیگی میں تھا جو کہ اس پورے سامان پر ادا کیا جاتا تھا جو کہ مالوہ نے داماؤ جاتا تھا۔ (24) سندھ کے بنئے اس ادائیگی پر اپنا کمیشن وصول کرتے ہوں گے۔ اگرچہ سندھ کی حکومت جو ٹیکس لگاتی تھی' اس کی شرح کے بارے مختلف اعداد و شمار ہیں' اور یہ کہ یہ ہر سال بدلتے بھی رہتے تھے' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ سالوں میں افیم کے ٹیکسوں سے سندھ کو خاصی رقم وصول ہو جاتی تھی نومبر 1830 میں ہنری پوٹنجر نے اپنے سندھ کے ایجنٹ کا ایک خط بمبئی روانہ کیا جس میں تحریر تھا کہ 1830ء میں 2 ہزار 4 سو اونٹوں کے سامان پر جو ڈیوٹی ادا کی گئی وہ 5 لاکھ 40 ہزار روپیہ تھی 235 روپیہ ہر اونٹ سے لیے گئے کہ جس پر 8 [illegible] سامان لادا ہوا تھا) (25) مارچ 1839ء میں الکزنڈر برنز نے ان ڈیوٹیز کی تفصیل دی ہے جو سندھ کی حکومت نے 1838ء میں افیون کی تجارت پر لگائی تھیں۔ (26) 234 کوڈایا کا شانی

روپیہ تھے (یہ دو کرنسیاں اس وقت سندھ میں استعمال ہوتی تھیں) جو کہ ایک اونٹ کے سامان پر لیے جاتے تھے (ہر اونٹ پر دو صندوق ہوتے تھے) کمپنی کے حساب سے یہ 200 روپیہ کے برابر رقم تھی۔ یہ اس کے مقابلہ میں کافی کم تھی کہ جو کمپنی ایک صندوق پر وصول کرتی تھی' جو کہ 125 روپیہ تھی۔ ڈیوٹی کراچی میں وصول کی جاتی تھی' لیکن کچھ ڈیوٹی میر پور میں بھی لے لی جاتی تھی' کیونکہ یہاں پر میر پور خاص کی حکومت حیدرآباد کے امیروں سے علیحدہ تھی۔ 1848ء کی ایک برطانوی دستاویز میں حیدرآباد کے تاجروں کے لیے افیم کی تجارت کے جو فوائد تھے اس کے بارے میں ایک جگہ ذکر آ گیا ہے۔(27) ایک اور رپورٹ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ شکار پور کے تاجر بھی اس منافع میں شریک تھے۔ لیفٹیننٹ لیچ (Leech) نے اپنی رپورٹ میں اس تجارت پر کہ جو پالی اور شکار پور کے درمیان تھی' افیم کی تجارت کا ذکر نہیں کیا' لیکن اس سرمایہ سے کہ جو شکار پور کے تاجروں نے تجارت میں لگایا تھا اور اس منافع کی شرح سے جو اس سے حاصل ہوا' اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے افیم کی تجارت میں کافی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔(28) 1839 میں مالوہ افیم کی تجارت کو جب مکمل طور پر ختم کر دیا گیا' تو اس کی وجہ سے شکار پور' کراچی اور حیدرآباد کے تاجروں کو سخت نقصان ہوا۔

وہ برطانوی سیاح کہ جو سندھ پر برطانوی قبضہ سے پہلے آئے تھے' وہ اس تضاد کو دیکھ کر پریشان تھے کہ جس میں ہندو معاشی طور پر معاشرہ میں تسلط رکھتے تھے' جب کہ مسلمان سیاسی طور پر با اقتدار تھے۔ لیکن اس تضاد کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے زبردست غلطی کی ہندو دراصل سیاسی معاملات میں معاون کی حیثیت سے شریک تھے۔ ٹالپر دور حکومت میں سندھ کے عامل ریونیو انتظامیہ اور دوسرے سیاسی معاملات میں انتہائی اہم کردار ادا کرتے تھے' اس وجہ سے وہ سندھ میں ایک سیاسی طاقت تھے۔ سندھ میں ہندو جاگیردار بھی تھے' اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ عاملوں اور تاجروں کو یہ اجازت تھی کہ وہ ہتھیار رکھ سکتے تھے۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ 1790ء میں ٹالپروں کے خلاف کراچی کا دفاع کرنے والے وہاں کے ہندو بنئے ہے جو خان قلات کے ماتحت تھے اور آخر میں انہوں نے ٹالپر میروں کے حق میں دست برداری کی۔(29) ہندوؤں کی بزدلی کے بارے میں جو روایات مشہور ہیں وہ مسلمان مراد اور برطانوی عہدیداروں کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

برطانوی حکومت کا سندھ کے ہندوؤں کے بارے میں متذبذب قسم کا رویہ تھا ایک طرف وہ ان کے ساتھ شفقت آمیز سلوک کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ مسلمانوں کے مذہبی تعصّبات اور تنگ نظری کے شکار لوگ تھے۔ دوسری طرف وہ انہیں چالاک تاجر کی حیثیت سے دیکھتے تھے جو لالچ اور طمع میں غریب کسانوں کا استحصال کرتے تھے اور فضول خرچ زمینداروں کو قرض دے کر لوٹتے تھے ان کے اس کردار کی وجہ سے وہ ان سے نفرت کرتے تھے۔ یہ تاثر کہ سندھ کے ہندو مسلمانوں کے تعصب کا شکار تھے' برطانوی فتح سندھ سے پہلے یہاں آنے والے برطانوی سیاحوں نے قائم کر دیا تھا' خصوصیت سے جس برنز نے۔ لیکن وہ یہ بھی لکھ رہا تھا کہ ''ریونیو کی انتظامیہ پر ہندوؤں کا تسلط تھا'' اس نے ان کے بارے میں لکھا کہ ''بحیثیت طبقہ کے دربار میں ان کو پسند نہیں کیا جاتا ہے اور نہ ہی ملک میں ان کا کوئی اثر و احترام ہے حالانکہ وہ دولت مند ہیں'' (30) اس نے ایک واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ جس میں میر مراد علی نے ہندوؤں کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ (31) 1843 کے واقعات کے فوراً بعد نیپیر (Napier) اور اس کے ساتھیوں نے ہندوؤں کو یہ تاثر دیا کہ برطانوی فتح دراصل مسلمانوں کے تسلط سے ان کی آزادی ہے۔ یہ برطانوی حملے اور فتح کو ایک اخلاقی جواز دینا تھا جس کے قبضہ کی اصل وجہ معاشی اسباب تھے۔ نیپیر کے ایک تنقید نگار ایسٹ وک (Eastwick) نے اس سلسلہ میں کہا کہ اگر ہندو مسلمانوں کے ہاتھوں اس قدر غصہ کا شکار تھے تو آخر وہ وہاں سے فرار ہو کر روادار اور فیض رساں برطانوی علاقے میں کیوں نہ آ گئے کہ جو ان سے بہت قریب تھا۔ (32)

اسی طرح یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ ٹالپروں کی حکومت میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات مثالی تھے۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قبل از نو آبادیاتی سندھ میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک خاص مرحلہ پر خود کو علیحدہ علیحدہ کمیونٹی سمجھتے تھے' سیٹھ ناؤمل ہوت چند کی یادداشتوں میں 1831ء کے ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ جس میں ہندو مسلم فسادات نے پورے علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سیٹھ ناؤمل کا باپ سیٹھ ہوت چند اس وقت سندھ کا سب سے بڑا مالدار شخص تھا' جب یہ فرقہ وارانہ فساد میں ملوث ہوا تو اسے مسلمان مجمع نے پکڑ لیا اور مجبور کیا کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ اس وقت یہ افواہیں بھی تھیں کہ اس کی زبردستی ختنہ کر دی گئی تھی' جو کہ صحیح نہیں تھی۔ آخرکار میر مراد علی نے اس معاملہ میں دخل دے کر اسے آزاد کرایا لیکن سیٹھ اس واقعہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ وہ سندھ چھوڑ کر

کچھ کے راؤ کے پاس چلا گیا۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات چھپے ہوئے تھے وہ کس طرح اچانک ابھر کر سامنے آ گئے اور فساد کی شکل اختیار کر گئے۔ ٹالپر حکمرانوں نے اس واقعہ میں جو متذبذب کردار ادا کیا اس کی قیمت جلد ہی انہیں ادا کرنی پڑی کیونکہ نوجوان سیٹھ ناؤمل اس ذلت کو فراموش نہیں کر سکا اور اس نے برطانوی فتح کے موقع پر ان کا بھرپور ساتھ دیا لیکن انہیں یادداشتوں میں ایک اور بیان بھی ہے جو کہ ہندو مسلمان تعلقات پر بالکل ایک دوسرے انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ جب سیٹھ ہوت چند کو آزاد کیا گیا تو اس نے لوگوں میں یہ اعلان کیا کہ اب وہ سب چھوڑ چھاڑ کر ایک صوفی فقیر بننا چاہتا ہے۔ (33) اس کے فٹ نوٹ میں جو کہ ان یادداشتوں کا ایڈیٹر اور سندھ کا سابق کمشنر تھا' اس نے سیٹھ کی وفات کے بعد ہماری معلومات کے لیے یہ لکھا کہ ''شاید سیٹھ ہوت چند کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک ہندو جوگی بننا چاہتا تھا'' ہمیں یقین ہے کہ سیٹھ ناؤمل کو ہندو جوگی اور مسلمان فقیر کے درمیان فرق معلوم تھا۔ اس لیے سیٹھ ہوت چند نے جو اعلان کیا وہ اس کو پوری طرح سے معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور دیکھا جائے تو اس میں کوئی زیادہ حیرانی کی بات بھی نہیں ہے۔ کیونکہ سندھ اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں یہ روایت تھی کہ مسلمان صوفی اور پیر مذہب بدلے بغیر لوگوں کو مرید کر لیا کرتے تھے۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر اس لیے کیا ہے تاکہ سندھ میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کی پیچیدگیوں کو سمجھا جا سکے' یہ اس قسم کے تعلقات تھے کہ جن میں مخالفت اور تصادم کے ساتھ ساتھ باہمی دوستی اور مذہبی یگانگت کے رویے موجود تھے ان دونوں کے تعلقات میں یہ رویے اور رجحانات اس طرح باہم ملے ہوئے تھے کہ ٹالپر حکومت میں سندھ کے ہندوؤں کے بارے میں کوئی ایک بات کہنا سخت غلطی ہوگی۔ (34) اس میں کوئی شک نہیں کہ کراچی اور حیدرآباد میں رہنے والے ہندو، تاجر سماجی طور پر طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے اور ٹالپر حکومت کے حکمراں طبقوں کا ایک حصہ تھے' اگرچہ سماجی طور پر شاید وہ ان وڈیروں' سیدوں اور پیروں کے برابر نہ ہوں کہ جو ملک کے کاشتکاروں اور کسانوں پر حکومت کرتے تھے۔ ہندوؤں کا یہ طبقہ اعلیٰ حکمراں طبقوں سے قریبی تعلقات رکھتا تھا۔ عاملوں کے طبقے کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ ان کا کوئی سیاسی اثر ورسوخ نہیں تھا' مگر یہ ضرور ہے کہ اپنی اس طاقت کا وہ اظہار نہیں کرتے تھے۔ تاجر برادری کے

دوسرے لوگ کہ جن میں دوکاندار، ساہوکار وغیرہ تھے، ان کا تعلق سندھ کے درمیانی طبقوں سے تھا، اور سماجی طور پر یہ ہاریوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم تھے۔ سندھ کے ہندوؤں کے ان مختلف طبقات کے پیش نظر یہاں نوآبادیاتی نظام کا اثر بھی اسی طرح سے غیر مساوی اور تقسیم شدہ تھا۔ اس لیے مناسب ہے کہ یہاں نوآبادیاتی دور کے ہندو معاشرے کا تجزیہ کیا جائے۔

نوآبادیاتی سندھ میں ہندو معاشرہ: کچھ عمومی رجحانات

پندرہویں سے لے کر اٹھارویں صدی میں جب سندھ میں اسلام پھیلا اور یہاں کے کسانوں نے اسے قبول کرنا شروع کیا، تو اس کے نتیجہ میں ہندو اقلیت میں ہو گئے، لیکن ان کی اس قدر تعداد ضرور رہی کہ جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی شناخت کو برقرار رکھا۔ اس کمیونٹی کے مطالعہ کے سلسلہ میں اہم ماخذوں کی بڑی کمی ہے، اگرچہ ان سے متعلق سستا قسم کا ہم عصر مواد ضرور موجود ہے۔ سندھ پر برطانوی قبضہ سے پہلے سندھ کے ہندوؤں نے مذہب کے علاوہ اور کوئی دوسرا تحریری مواد نہیں چھوڑا، مذہبی ادب میں وہ بھجن ہیں کہ جو نانک پنتھیوں نے بطور عقیدے لکھے۔ عاملوں اور بنیوں نے بھی وقتاً فوقتاً سندھ کے صوفی ادب میں اپنی تحریروں سے اضافہ کیا۔ سندھ کی صوفیانہ روایات شاہ عبداللطیف کی شاعری میں اپنی بلندی کو چھوتی نظر آتی ہیں۔ برطانوی دور حکومت میں بھی کہ جب ان میں خواندگی کی شرح بڑھ گئی تھی، خاص طور سے عامل طبقہ میں تعلیم کا زیادہ رواج ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے ہندو کلچر اور سماج کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ (35) اہل برطانیہ نے بھی سندھ کے ہندوؤں پر کوئی زیادہ توجہ نہیں دی، انہیں وہ سندھ کے سماج میں ''غیر ملکی'' خیال کرتے رہے۔ اس کے مقابلہ میں نوآبادیاتی اسکالرشپ نے کہ جس کی تحقیق اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اس نے مسلمان معاشرہ اور کلچر پر توجہ مرکوز رکھی۔ اگرچہ نوآبادیاتی انتظامیہ نے کچھ بنیادی معلومات اکٹھی کر کے گزٹیئرز میں چھاپیں، خاص طور سے 1907 کے ایڈیشن میں یہ معلومات کافی ہیں۔ (36) چونکہ اب تک سندھ پر کوئی زیادہ تحقیق اور مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، اس لیے جب تقسیم سے پہلے سندھی ہندوؤں کے بارے میں لکھا جاتا ہے تو اسی مواد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ 1947ء کی تقسیم کے بعد جب کہ یہاں ہندوؤں کی تعداد گھٹ کر بہت معمولی رہ گئی۔ اس لیے اب اس سے کسی کو زیادہ دلچسپی نہیں کہ تاریخ میں ان کے کردار کا جائزہ لیا جائے۔ ہندوستان

درمیان فرق کو قائم کر دیا تھا' یہاں پر یہ فرق نہیں تھا۔(39) اس وجہ سے یہ کہنا مشکل تھا کہ کیا نانک پنتھی خود کو سکھ کہتے ہیں یا ہندو۔ 1881 کی مردم شماری میں شکار پور اور حیدر آباد کے لوہانوں نے خود کو سکھ لکھوایا تھا' لیکن 1889 کی مردم شماری میں سب ہندو ہو گئے(40) سندھ میں برہمنوں کی ذات کوئی زیادہ با اثر نہیں تھی ان کی تعداد کم تھی۔ یہ جو صرف شہروں میں تھے یہ ان کے مقابلے میں ''باوا'' نانک پنتھی دیروانت تھے جو کہ ہر گاؤں اور شہروں کی ہر گلی میں پائے جاتے تھے اور یہ مندر گردوارا جو کہ ''ٹھکانہ'' کہلاتا تھا اس کا انتظام کرتے تھے۔ ان ٹھکانوں میں ہندومت کے بتوں کے ساتھ ساتھ گرنتھ صاحب اور بابا نانک کی شبیہ بھی رکھی ہوتی تھی۔ اس مذہبی ہم آہنگی میں ان کے ہاں ''اوڈیرولال'' جو کہ ''جھولے لال'' بھی کہلاتا ہے اس سے عقیدت مندی کا اظہار ہوتا تھا۔(41) صدیوں تک ''جھولے جھولے لال'' وہ نعرہ تھا کہ جس کے گرد مصیبت کے وقت سندھی ہندو جمع ہو جاتے تھے۔ یہ وہ علامت تھی کہ جس کے ذریعہ وہ ایک ہو کر اپنے مسلمان حریفوں کے مقابلہ میں اپنی شناخت کو برقرار رکھتے تھے۔

لیکن سندھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہاں جو مذہبی یگانگت کا عنصر تھا وہ یہ کہ دونوں باہم مل کر ان صوفیوں اور پیروں سے عقیدت مندی کا اظہار کرتے تھے کہ جن کا تعلق ہندو اور اسلام سے تھا۔ اس قسم کی شہادتیں ہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت کسی مسلمان پیر کی مرید ہوا کرتی تھی' جنہوں نے سندھ میں اسلام کے پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔(42) اگر برصغیر ہندوستان میں یہ رسم عام ہے کہ ہندو مسلمان پیروں کے مرید ہوتے ہیں' مگر سندھ میں خاص طور سے ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت یہ رسم عام ہے۔ کسی مسلمان پیر کا مرید ہونے کے صرف روحانی فوائد ہی نہیں تھے' بلکہ اس طرح سے معاشی فوائد بھی ہوتے تھے' اور خاص طور سے سماجی و سیاسی طور سے اسے تحفظ مل جاتا تھا' اس صورت میں جب کہ وہ دور دراز کے علاقوں میں مسلمان اکثریت میں گھرے ہوئے رہتے ہوں۔ یہ دنیاوی فوائد اپنی جگہ' مگر ان کے اس خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جو ایک مرید کو اپنے پیر سے ہوا کرتا تھا۔ اس کی مثال ہندوؤں کی شاہ عبداللطیف اور دوسرے صوفیاء سے عقیدت ہے جس کا اظہار ان کے ہاں بار بار ہوتا ہے۔ اسی طرح سے سندھ کے مسلمان بھی ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی سمادھیوں پر حاضری دیا کرتے تھے۔ ایک ہندو راہنما نے اشارہ کیا ہے کہ سندھ کے ہندو کس ذوق

وشوق سے محرم کی تقریبات میں حصہ لیا کرتے تھے۔(43)

بہرحال مذہبی اشتراک ان دو کمیونٹیز میں تصادم اور کشمکش کو ختم نہیں کر سکا اگرچہ یہ شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں بہت کم تھا1920ء سے سندھ کی سیاست میں آہستہ آہستہ فرقہ واریت آتی چلی گئی۔ ہندو خود کو کانگرس سے جوڑنے لگ گئے' جب کہ مسلمان اس سے دور رہے اور 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں جا کر وہ مسلم لیگ سے جڑے۔(44) لیکن اس پر اتفاق ہے کہ 1947-48ء میں سندھ سے ہندوؤں کا ہجرت کرنا' سندھ کے اندرونی فرقہ وارانہ فسادات اور سندھ کے ہندو مسلمانوں کے درمیان تضادات نہیں تھے' بلکہ یہ تقسیم کے منطقی نتائج اور پنجاب میں ہونے والے خوں ریز فسادات تھے۔(45) اگرچہ یہ کہنا تو درست نہیں کہ سندھ میں مکمل طور پر مذہبی ہم آہنگی یا رواداری تھی' لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں یعنی پنجاب بنگال اور یوپی کے مقابلہ میں یہاں مذہبی اختلافات اور تضادات کم تھے۔(46) اور اس مذہبی اشتراک اور ہم آہنگی میں کیا جا سکتا ہے ان میں یہاں کے صوفیاء نے موثر کردار ادا کیا۔

ہندو بنئے اور نو آبادیاتی دور میں سیاسی و معاشی حالت

اس نقطہ نظر کو عام طور سے تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ سندھ کی برطانوی فتح کے بعد جو سماجی اور معاشی تبدیلی ہوئی اور معاشرے کی ساخت کی تشکیل نو ہوئی اس کا سب سے زیادہ فائدہ ہندو بنیوں کو ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نقطہ نظر کی بھی وضاحت کی جائے۔ اس سلسلہ میں اس برطانوی ذہنیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جس میں سندھ کے ہندو ابتدا میں ان کے لیے محض تجارتی معاملات میں آڑھتیے تھے اور مفت میں منافع کماتے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف تک یہ برطانوی نقطہ نظر برطانوی مصنفوں کے ہاں پایا جاتا ہے' اس کی بہترین مثال رچرڈ برٹن ہے۔ سندھ کے بارے میں 1851ء (47) میں شائع ہونے والی اس کی کتاب میں سندھ کے ہندوؤں کے بارے میں جو خیالات ہیں' اگرچہ ان میں تعصب تو ہے مگر پھر بھی مجموعی طور پر یہ معروضی ہے۔ 1877ء میں لکھی جانے والی کتاب جو اس نے سندھ کا دورہ کرنے اور یہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد لکھی اس میں سندھ کے ہندوؤں کے خلاف بہت زہر آلود مواد ہے۔(48) جس

سے برطانوی عہدے دار اور غیر عہدے دار دونوں ہی متاثر ہوئے اور ہندوؤں کے بارے میں اس کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کی چونکہ یہ کتاب نوآبادیاتی بحث ومباحثہ میں نہیں آتی ہے اس لیے میں اس پر روشنی نہیں ڈالوں گا۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس کی کتاب نے ایک ایسے رحجان کو پیدا کیا کہ جس کے اثرات دیرپا اور دوررس ہوئے اور اس نے ہندوؤں کے بارے میں سطحی خیالات کو پیدا کرنے میں مدد دی۔

ہندوؤں کے خلاف جو سب سے اہم بات کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندو بنیوں نے اپنے ہتھکنڈوں کے ذریعہ زرعی زمینوں کو اپنے نام تبادلہ کرالیا۔ اگر تبادلہ کی کچھ شہادتیں تو ہیں مگر یہ مشکل ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دی جائے۔ اول تو اس کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات نہیں ہیں کہ برطانوی قبضہ کے وقت ہندوؤں کے پاس کتنی زمین تھی۔ برطانوی عہدیداروں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ ان معاملات میں واقعات کو سابقہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں' خاص طور سے اس صورت حال میں جب کہ معاملہ ساہوکار اور سودخوروں کا ہو۔ جو ان کے نزدیک مفت کے منافع خور تھے۔ لہٰذا انہوں نے مختلف قوانین پاس کرائے تاکہ زمینوں کا تبادلہ نہ ہو سکے' اس کی ابتداء 1896ء (Sind Encumberel Estate Act) کے ذریعہ ہوئی۔ 1896ء میں سندھ کے کمشنر سر اوان جونس (Sir Evan Jones) نے یہ دعویٰ کیا کہ 42 فیصد زمین ہندوؤں کے پاس رہن رکھی ہوئی ہے۔ (49) اس کے بعد سے اور قوانین پاس کیے تاکہ کسان اور زمیندار قرض کے عوض اپنی زمینیں رہن نہ رکھ سکیں۔ دیکھا جائے تو یہ سندھ کی زرعی تاریخ کے دو نمایاں ادوار ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف میں' ہندوؤں بنیوں نے بہت زیادہ تعداد میں زمینوں کو حاصل کرلیا تھا' بالواسطہ یا بلاواسطہ دونوں طریقوں سے لیکن یہ رحجان بیسویں صدی میں جاکر رک گیا۔

ڈیوڈ چیس من (David Cheesman) (50) جس نے سندھ میں سودی کاروبار پر تفصیل سے کام کیا ہے' اس نے بدقسمتی سے اپنی تحقیق کا دائرہ انیسویں صدی تک رکھا ہے اور اپنی تحقیق کو بیسویں صدی کے نصف تک نہیں لایا۔ چیس من کی دلیل یہ ہے بنئے بنیادی طور پر تاجر تھے

اور قرض پر روپیہ دے کر اس کے ذریعہ سے وہ زراعتی پیداوار کو ہتھیا لیتے تھے۔ وہ سود کے ذریعہ رقم لینے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے' ان کو زیادہ فائدہ اس زرعی پیداوار سے ہوتا تھا جو وہ زمینداروں اور کسانوں سے قرض کے عوض لیتے تھے اور اسے منڈی میں بیچ کر منافع حاصل کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ جھگڑوں اور تنازعات کو عدالت تک نہیں پہچانا چاہتے تھے' یہ قدم اس وقت اٹھاتے تھے کہ جب اور کوئی راستہ نہیں رہتا تھا۔ یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ ان کے لیے زمیندار ہونا یا زمینوں پر قبضہ کرنا کوئی منافع بخش کاروبار نہیں تھا' کھیتی باڑی کے لیے کسانوں سے کام کرانا ان کے لیے مشکل تھا۔ چیس من کا یہ تجزیہ اس سے مطابقت رکھتا ہے کہ جو نیلا دری بھٹا چاریہ نے پنجاب کے سلسلہ میں کیا ہے جو کہ ساہوکاروں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر کے ان میں فرق بتاتا ہے ان میں سے ایک کو وہ سود خور کہتا ہے' جن میں اکثریت پٹھانوں کی ہے جو کہ مختلف عرصہ کے قرضہ پر بہت زیادہ سود کی شرح پر پیسے وصول کرتے تھے' یہ اپنے سود کی وصول کے لیے مسلسل دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ دوسری جماعت کو وہ تاجر سود خور کہتا ہے جو کہ کم شرح پر قرضہ دیتے تھے اور اس کے عوض زرعی پیداوار وصول کرتے تھے۔ (51) اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قسم کا فرق ہمیشہ رہا' لیکن سندھ میں بنیوں کا تعلق دوسری جماعت سے تھا جو کہ سود کے عوض زرعی پیداوار حاصل کرتے تھے' یعنی یہ تاجر سود خور یا ساہوکار تھے۔

چیس من نے انیسویں صدی کے سندھ کے بارے میں جو تحقیق کی ہے اس کی بنیاد سرکاری دستاویزات پر ہے' لیکن اس کا نقطہ نظر سرکاری عہدیداروں کے مقابلہ میں مختلف ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ اس امر کے باوجود کہ سندھ کی زمین بنیوں کے ناموں منتقل ہوئی۔ وڈیرہ نے سندھ کے دیہات میں اپنے اثر و رسوخ کو برقرار رکھا۔ اس لیے برطانوی عہدیداروں کا یہ ڈر کہ وڈیروں کی زمینوں سے بے دخلی سندھی معاشرے میں تبدیلی لائے گی اور اس مقصد کے لیے انہوں نے جو مختلف قوانین پاس کرائے' وہ سب محض رسمی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اس کی جڑ پر کوئی حملہ نہیں کیا جو کہ قرضہ لینے کی عادت تھی۔ اس کے عوض انہوں نے وڈیرے کو یہ تاثر دیا کہ سرکار ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتی ہے' لہٰذا ان کا یہ فرض ہے کہ وہ بغیر کسی تذبذب کے حکومت برطانیہ سے

اپنی وفاداری کو برقرار رکھیں۔ برطانوی دور میں سندھ کے معاشرے کی ساخت میں کوئی بہت اہم تبدیلیاں نہیں آئیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بنئے زمین حاصل کرتے تھے' اور ان زمینوں کا انتظام بھی عمدہ اور بہترین طریقے سے کرتے تھے۔(52) لیکن بہت سے معاملات میں وہ وڈیرے پر انحصار کرے تھے' خاص طور سے جب ہاریوں سے بات چیت کی جاتی تھی۔ چونکہ بنیوں کا تعلق ایسے طبقہ سے تھا کہ جس کا سماجی طور پر وڈیروں' پیروں اور سیدوں سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ ہاری ان کے ساتھ وفادار رہیں گے' یا ان سے ڈریں گے اور ان کی اطاعت کریں گے۔ ان کا دیہات میں آنا محض اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے وڈیروں کو قرضہ دیا تھا اور وڈیرہ اس کے عوض ان کے لیے ہاریوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ اس کے باوجود سندھ کے دیہات میں سودخوروں کے قتل ہوتے رہتے تھے۔ ان کے قاتل بہت کم حالات میں پکڑے جاتے اور سزا پاتے تھے۔ (53) شہادتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہاری اچانک جذبات میں آ کر بطور انتقام یہ قتل نہیں کرتا تھا' بلکہ اس کے پس منظر میں وڈیرہ ہوتا تھا جو اس قسم کے واقعات میں ملوث ہوتا تھا اور سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ قتل کرائے جاتے تھے لہٰذا اپنی دولت کے باوجود' جو بنئے کے پاس اچھی خاصی تعداد میں ہوتی تھی' وہ اس قابل نہیں تھا سندھ میں ایسا کردار ادا کر سکے کہ جو اس کے تسلط کو قائم کر دے۔

اس سے اس کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ آخر سندھی ہندو بنیوں نے کیوں انیسویں صدی کے نصف میں سندھ سے باہر تجارت کی راہیں تلاش کیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انہیں اپنی دولت کے باوجود دیہات میں جو عدم تحفظ تھا' اس میں وہ پوری طرح سے اپنا کاروبار نہیں کر سکتے تھے' اس وجہ سے سندھ سے باہر ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس سلسلہ میں اناج کی قیمتوں کا بھی دخل ہے' کیونکہ ان کی تجارت کا ذریعہ یہی زرعی پیداوار تھی۔ اعداد وشمار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اناج کی قیمت انیسویں صدی کے نصف میں بڑھ رہی تھی۔(54) اور اس سے بنیوں کے منافع میں اضافہ ہو رہا تھا' لیکن اس عدم تحفظ کی وجہ سے جو دیہات میں تھا' ان کے لیے یہ منافع بھی کاروبار کو مزید پھیلانے میں رکاوٹ تھا۔ اگرچہ بنیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جو ہر طرح کے خطرات

مول لیتے تھے، مگر بہرحال ان خطروں کی بھی ایک حد ہوتی تھی۔ ان کا ایک رجحان یہ بھی تھا کہ سرمایہ کو ایک ہی قسم کی تجارت میں نہ لگایا جائے، لیکن برطانوی حکومت کے دوران انہیں سرمایہ کاری کے اور مواقع نہیں تھے جہاں وہ دیہات سے نکل کر اپنی تجارتی صلاحیتوں کو آزمائیں۔

جب برطانیہ نے سندھ پر قبضہ کیا ہے تو اسے چار مسائل کا سامنا کرنا پڑا: ریاست کے مالی انتظام، کرنسی کا تبادلہ، صنعتی پیداوار اور سندھ کے راستے گزرنے والی تجارتی اشیاء۔ جہاں تک ریاستی مالیاتی انتظام کا تعلق تھا تو اس میں اہل برطانیہ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی، کیونکہ سندھ پر قبضہ سے پہلے ان کا ہندوستانی مقبوضات میں مالی انتظامی ڈھانچہ موجود تھا، اس لیے انہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ مقامی بنکرز سے قرضہ لیں، جب کہ اس پہلے بنکرز ریاست کو قرضہ دیا کرتے تھے اور یہی ان کی خاص تجارت تھی، خاص طور سے حیدرآباد کے بنکرز۔ اب جب کہ یہ تجارت نہیں رہی تو ان کے لیے ضروری تھا کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں۔ کرنسی کے تبادلہ کی جو تجارت تھی۔ اس کا بھی خاتمہ ہوگیا، کیونکہ کمپنی کا روپیہ قانونی طور پر کرنسی بن گیا اور مقامی کرنسیاں ختم ہوگئیں۔ جہاں تک سندھ کے راستے سے گزرنے والی تجارتی اشیاء کا مسئلہ تھا جو ہمسایہ ملکوں کو جاتی تھیں، اس میں بھی کمی آ گئی، خاص طور سے مالوہ افیم کی تجارت بالکل بند ہوگئی۔ قلات اور افغانستان میں حالات کے بگڑنے کی وجہ سے وسط ایشیا کی تجارت کے راستے غیر محفوظ ہوگئے۔ دریائے سندھ کے راستے پنجاب اور وسط ایشیا کی تجارت بھی کوئی زیادہ فائدہ مند نہیں رہی۔ دست کاری کی اشیاء اور دوسری صنعتی پیداوار میں اس لیے زوال آیا کیونکہ اب دربار اور فوج میں ان کی مانگ نہیں رہی، جو کہ اس کے سب سے اچھے خریدار تھے، جو تاجر کے دست کاری اور صنعت میں سرمایہ لگاتے تھے اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ اس میں مزید سرمایہ کاری کرسکیں۔ لہٰذا یہ وہ حالات تھے کہ جن میں سندھ پر قبضہ کے بعد بنئے ان مواقعوں کی تلاش میں تھے کہ جہاں وہ سرمایہ کاری کرسکیں۔

1843۔1875ء میں سندھی قبیلوں میں ایسے مہم جو تھے جو کہ تجارت کے لیے نئے راستوں اور سرمایہ کاری کے لیے نئے طریقوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ شکارپورہ اور ٹھٹھہ

کے بھائیہ اپنے پہلے سے قائم شدہ تجارتی رشتوں کو مضبوط کر رہے تھے' جب کہ حیدرآباد کے تاجروں نے بالکل نئے ذرائع کی تلاش شروع کر دی۔

سندھ نے برطانوی ہند کی معیشت میں جو حصہ لیا اس کی وجہ سے بھی حالات میں تبدیلی آئی۔ قبضہ سے پہلے سندھ بین الاقوامی اور علاقائی تجارت میں حصہ لیتا تھا' لیکن برطانوی اقتدار کے بعد اس کو پنجاب کی زرعی پیداوار کے لیے راستہ دینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس غرض سے انیسویں صدی کے نصف میں برطانوی حکومت نے سندھ میں سب سے زیادہ سرمایہ کاری کراچی کی بندرگاہ کو پھیلانے اور ریلوے لائنز بچھانے کے لیے کی تاکہ پنجاب سے بندرگاہ کا رابطہ ہو جائے۔ (55) 1847 میں یہ فیصلہ کہ سندھ کو بمبئی پریذیڈنس سے متعلق کر دیا جائے' یہ ایک دور رس فیصلہ ثابت ہوا' کیونکہ سندھ کا بمبئی سے معاشی اور ثقافتی طور پر بہت کمزور رشتہ تھا' یہ بمبئی کی جانب سے پنجاب کے لیے ایک بلاواسطہ سہولت تھی کہ جو اسے دی گئی۔ (56) اس طرح سندھ کو جب پنجاب کی زرعی پیداوار کے لیے منتخب کیا گیا تو اس سے کراچی کو بہت فائدہ ہوا' دوسری طرف ریلوے کی وجہ سے ان شہروں نے فائدہ اٹھایا کہ جہاں سے یہ گزرتی تھی۔

اس مرحلہ پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اسباب کا تجزیہ کیا جائے کہ جن کی وجہ سے سندھ کے بنئے اپنے صوبے کی تجارت پر اپنا روایتی تسلط قائم نہیں رکھ سکے' اور انہوں نے غیر مقامیوں کو یہ موقع دیا کہ وہ کراچی آ کر وہاں کی معیشت اور تجارت کو اپنے کنٹرول میں لے لیں۔ ان اسباب میں کچھ کا تعلق تو سندھ پر برطانوی قبضہ کا ہے۔ 1839ء کے بعد سے اور پھر 1843ء میں فتح سندھ کے بعد بمبئی میں واقع برطانوی تجارتی کمپنیوں نے اپنے سرمایہ اور تجربہ کی بنیاد پر کہ جو انہیں غیر ملکی منڈیوں کے بارے میں تھا' خاص طور سے روئی کی تجارت کا' انہوں نے کراچی کی تجارت میں سرمایہ کاری کر کے وہاں اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس کا مظہر 1860ء میں کراچی چیمبر آف کامرس کا قیام ہے جو ان تجارتی کمپنیوں کے تعاون سے قائم ہوا۔ (57)

لیکن ان کے ساتھ ہی دوسری تاجر برادریاں جو برطانوی ہند سے اور خاص طور سے بمبئی سے کراچی آئیں اور یہاں آ کر شہر کی منڈیوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم پارسی ٹھیکیدار تھے' انہوں نے جلد ہی برطانوی فوج اور عہدیداروں کے لیے سپلائی کے

ٹھیکے لے کر اس پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی۔ لیکن جلد ہی انہوں نے دوسرے کاروبار میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے نصف میں پارسی کراچی میں سب سے زیادہ طاقتور تجارتی جماعت تھی۔ (58) بمبئی سے آنے والے دوسرے تاجروں میں یہودی اور گجراتی بنئے تھے۔ ان کے علاوہ سندھ پر قبضے سے پہلے جو دوسری تاجر برادریاں اہم تھیں ان میں اسماعیلی خوجے اور کچھی میمن تھے، فتح سندھ کے بعد ان کو مزید تقویت اس وقت ملی کہ جب ان کی برادریوں کے مزید تاجر کراچی آنا شروع ہو گئے' آنیوالوں میں اکثریت بمبئی اور کچھ کی تھی کراچی بندرگاہ کا پنجاب سے تعلق قائم ہوا اور شمال ہندوستان کے علاقوں کی قربت کی وجہ سے یہاں پنجابی اور مارواڑی سیٹھ بھی آئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سندھی بنیوں کی تجارتی کمپنیاں جو برطانوی قبضہ سے پہلے تھیں' جیسے سیٹھ ناؤمل اور وسن داس کھیم چند کی' ان کا بڑی تیزی سے زوال ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جو بنیا گروپ کراچی میں برقرار رہا وہ شکارپوریوں کا تھا' انہوں نے کراچی کی بڑی کمپنیوں اور سندھ کے شہروں وقصبوں کے درمیان ''مڈل مین'' کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنی حیثیت کو مستحکم رکھا۔ (59) اس کے علاوہ انہوں نے اپنے وسط ایشیا کے تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے برطانوی صنعتی پیداوار کو جنوب مشرق ایران کی منڈیوں میں فروخت کیا۔ لیکن مجموعی طور پر یہ درست ہے کہ اس دورانیہ میں سندھی بنیوں نے اپنی اجارہ داری اور تجارت پر تسلط اپنے ہی صوبہ میں کھو دیا۔ یہ وہ حالات تھے کہ جن میں حیدرآبادی اور شکارپور کے بنیون نے اپنے لیے دوسرے علاقوں کی تلاش کی' اور اپنی تجارت کے لیے نئی راہوں کو ہموار کیا۔ شکارپوریوں نے کوشش کی کہ اپنے ہی ملک میں کوئی راستہ ڈھونڈیں' جب کہ حیدرآبادیوں نے صوبہ سے نکل کر بمبئی کی راہ لی' جو آگے چل کر ان کے لیے فائدہ مند ہوئی۔

اس تجزیہ کے بعد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کس طرح اندرون سندھ کی دو تاجر برادریوں نے ایک ایسا تجارتی جال پھیلایا کہ جس میں ایک طرف وسط ایشیا' جنوب مشرق ایران اور جنوب مغرب سنکیانگ تھا' تو دوسری طرف وہ دنیا تھی جو سمندری راستوں پر پھیلی ہوئی تھی' جس میں جاپان کے کوبے (Kobe) سے لے کر وسطی لاطینی امریکہ کا پانامہ شامل تھا۔ ان دنیاؤں میں شکارپوری اور حیدرآبادی تاجر تجارت میں مصروف تھے۔

References

1. C.A Bayly writes in *Imperial Meridian: the British Empire and the World 1780-1830*, London, 1989, p. 48; 'Emerging from out of the brief Afghan Empire of the Durranis, magnates from tribal backgrounds in Sindh (the Talpur emirs) had built up a viable political system by the 1790s' thus signalling a considerable shift in current historio-graphical views on pre-colonial Sind.
2. For an altogether favourable account of Napier, see H. T. Lambrick, *Sir Charles Napier and Sind*, Oxford, 1952.
3. See C. L. Mariwalla, *History of the Commerece of Sind (From Early Times to 1526 AD)*, Jamshoro, 1981, p. 16.
4. See Wink, *Al Hind*, vol. I, p. 51: 'The desire to expand traffic along the Persian Gulf route was... the main motivation for the conquest of Sind.' The suppression of piracy in particular was a crucial objective for the Muslim conquerors.
5. *Ibid.*, p. 181.
6. *Ibid.*, p. 52.
7. On Debal, see S. Q. Fatimi, 'The Twin Ports of Daybul' in H. Khuhro (ed.) *Sind Through the Centuries*, Karachi, 1981, pp. 97-105
8. Ibn Battuta, *Voyages*, translated from the Arabic by C. Defremery and B. R. Sanguinetti, Paris, 1854, p. 112. He calls 'Lahary' 'une belle place situee sur le rivage de l'ocean' and mentions that 'elle possede un grand port, ou abordent des gens du Yaman, du Fars'.
9. Wink, *Al Hind*, p. 173.
10. Allen, 'The Indian Merchant Community of Masqat'.
11. See S. Subrahmanyam, 'The Portuguese, Thatta and the External Trade of Sind, 1515-1635', *Revista de Cultura*, nos. 13-14, 1991, pp. 48-58.

12. See . S P. Chablani, *Economic Conditions in Sind 1592 to 1843*, Bombay, 1951, p. 52.
13. A. Hamilton, *A New Account of the East Indies,* London, 1744, quoted in A. Duarte, A History of British Relations with Sind, Karachi, 1976, p. 39.
14. Allen, 'The Indian Merchant Community of Masqat'.
15. See *A Forgotten Chapter of Indian History as Described in the Memoirs of Seth Naomal Hotchand, C. S. I. Of Karachi 1804-1878,* Karachi, 1982 (1st edn, Exeter, 1915) p. 36. These memoirs, which were written in Sindhi by Seth Naomal himself, were translated into English by his grandson, Rao Bahadur Alumal Trikamdas Bhojwani, and 'edited' by Sir H. Evan M. James, who was commissioner in Sind in 1891-9, and had them privately published. This document, in spite of having been translated and 'edited' is an extraordinary and in many ways unique source on the world of the Hindu banias of Sind.
16. M. Rodinson, *Islam et Capitalisme,* Paris, 1966.
17. See Dale, *Indian Merchants and Eurasian Trade,* p. 128.
18. J.J. L. Gommans, *The Rise of the Indo-Afghan Empire, 1710-1780,* Leiden, 1995.
19. See Allen, 'The Indian Merchant Community of Masqat'
20. See A. B. Advani, 'Hyderabad: a Brief Historical Sketch', *Sindhian world,* vol. 1, no. 6, 1940, pp. 356-69.
21. On the Malwa opium trade, see, for an overview, D. F. Owen, *British Opium Policy in China and India,* New Haven, CT, 1934, pp. 80-112, *Parliamentary Papers, House of Commons,* 1831-32, vol. VI, Appendices to the reports of the Committee on the East India Company affairs, Appendix IV, 'Abstract of correspondence regarding Malwa opium, commencing from the Year 1818 to the Year 1828', pp. 26-59, *Royal*

Commission on Opium, 1894-1895, vol. VII, *Final Report,* part II, *Historical Appendices,* London, 1895, 'Appendix B, Historical Memorandum, by R. M. Dane' pp. 28-63. For details of the route, see in particular IOR, Bengal Board of Revenue (Miscellaneous) Proceedings, Opium, Consultation 8A, 8 March 1824, enclosing letter from opim agent in Malwa to Board of Revenue, 17 February 1824, enclosing Memorandum respecting the export of opium to Pahlie and Demaun' and Consultation 18, 22 April 1824, from *ibid.*, enclosing information collected at Pali by a native informant.

22. Statistics bearing on opium exports to China from Daman between 1820-1and 1828-9 show widespread fluctuations, a peak being reached in 1827-8 with a quantity of almost 4,000 chests. See C. Pinto, *Trade and Finance in Portuguese India: a Study of the Portuguese Country Trade 1770-1840,* Delhi, 1994, Table 5.2, p. 132.
23. See J. Y. Wong, 'British Annexation of Sind in 1843; an Economic Perspective' *Modern Asian Studies,* vol. 31, no. 2, 1997, pp. 225-44. That some correlation existed between British opium policy on the one hand and the decision to annex Sind seems indubitable, but it does not prove that the desire to close the Sind route to Malwa opium was the main motive of the annexation.
24. See enclosure 8 B. 'Memorandum respecting the export of opium to Pahlie and Demaun' in opium agent in Malwa to Board of Revenue, Customs and Salt (Opium), 17 February 1824, Consultation no. 8 A, 9 March 1824, Bengal Board of Revenue (Miscellaneous) Proceedings, Opium, 9 March to 22 June 1824, and enclosure in ibid. to *ibid.,* 22 April 1824, Consultation no. 18, *ibid.*
25. Native agent in Sind to Colonel H. Pottinger, 27 November 1830, trans, by A. Burnes, assistant resident,

20 December 1830, Bombay Revenue Proceedings, December 1830, no. 135.

26. A Burnes, 'On the Commerce of Hyderabad and Lower Sind', in *Reports and Papers, Political, Geographical and Commercial Submitted to Government by Sir Alexander Burnes, Lieutenant Leech, Dr Lord and Lieutenant Wood Employed on Mission in the years 1835-36-37 in scinde, Afghanistan and Adjacent Countries,* Calcutta, 1839, p. 21.
27. In 1848, Captain Rathbone, the magistrate of Hyderabad, answering queries regarding trade in the Hyderabad Collectorate, stated: 'The Hyderabad merchants... had till within a year or two of the conquest a large opium trade across from Pali, which has been stopped under orders conveyed from the Supreme Government. Enclosed in minute of Sir George Clark, 24 April 1848. *Parliamentary Papers (House of Commons 1854, East India (Scinde)*, p. 293.
28. 'Report on the trade between Shikarpur and Marwar', *Reports and Papers, Commercial,* pp. 68-70. Leech gives the names of six Shikarpuri merchants engaged in the trade with a total capital of Rs 340,000 while he informs us that trade in the major commodities, assafoetida and saffron, is but a small share of what it was two decades earlier, one of the major reasons for the decline being the growing inroads of British goods in the markets of Rajputana.
29. See *Memoirs of Seth Naomal Hotchand,* pp. 41-5.
30. J. Burnes, *A Narrative of a Visit to the Court of Sinde,* Edinburgh, 1831, 2nd edn, (1st edn, Bombay, 1829), p. 76.
31. The mir is supposed to have exclaimed, in the face of evidence of treachery by a Hindu servant: 'You do not know the Hindus of Sinde; they are all blackguards and rascals'. *Ibid.*, p. 86.

32. F. B. Eastwick *A Glance at Sind before Napier or Dry Leaves from Young Egypt*, Karachi, 1973, reprint (1[st] edn, London, 1849), pp. 214-15.
33. *Memoirs of Seth Naomal*, p. 68.
34. See L. M. M. Thakurdas, 'Hindus and Talpurs of Sind', *Modern Review*, vol. 51, 1932, pp. 265-72.
35. See, however, B. M. Advani, *Sindh-je-Hindus-je-Tarikh* (History of Sindh Hindus) (in Sindhi) Hyderabad.
36. *Gazetteer of the Province of Sind,* compiled by E. H. Aitken, Karachi, 1907.
37. U.T. Thakur, *Sindhi Culture*, Bombay, 1959.
38. Calculated from Appendix A, 'Comparative Tables showing the number and distribution of various Hindu castes (1891 to 1931) in Sind' in *ibid.,* pp. 207-33.
39. For an interesting although controversial analysis of this question, centered on the Punjab, see H. Oberoi, *The Construction of Religious Boundaries: Culture, Identity and Diversity in the Sikh Tradition,* Delhi, 1994. To the best of my knowledge, no study has been done of the history of Sikhism in Sind.
40. According to the 1881 Census, there were in Sind 126, 976 Sikhs (including 68, 655 in Shikarpur distric and 42,940 in Hyderabad district) as against 305, 079 Hindus (93,341 in Shikarpur and 89, 114 in Hyderabad), suggesting that he majority of Lohanas in Shikarpur district and large minority in Hyderabad district returned themselves as Sikhs. *Census of India, 1881, Operations and Results in the Presidency of Bombay including Sind,* J. A. Baines, vol. II, Tables, Bombay, 1882, Table III, pp. 3-6. However, by the time of the 1891 Census, the situation had been totally reversed, as only 720 Sikhs were enumerated in the whole of Sind, as against 567,536 Hindus. *Census of India, 1891, vol. VIII, Bombay and its Feudatories, part II, Imperial Tables,* W. W. Drew, bombay, 1892, Table VI, pp. 26-7. Commenting on this puzzling change, the

census commissioner attributed it to the fact that in the 1891 Census 'religion' and 'sect' were distinct categories, but that only the former had been taken into account. He surmised that most of those who had previously enumerated themselves as Sikhs returned themselves in 1891 as of Hindu religion and Sikh sect, which explained that they figured under the heading 'Hindus'. *Census of India, 1891, vol. VIII, part I, Report*, W. W. Drew, Bombay, 1892, p. 40.

41. On Uderolal or Lal Udero, see 'Something about Lal Udero', in Sigma (Dayaram Gidumal) *Something about Sind,* Karachi, 1882, pp. 27-31.
42. On the role of the *sufi pirs* in Sindhi Islam, see S. F. D. Ansari, *Sufi Saints and State Power: the Pirs of Sind 1843-1947,* Cambridge, 1992, pp. 19-35. Ansari mentions, p. 20, that Suhrawardi *sufis*, who were the first to be active in Sind, acquired Hindu followers 'in part as a result of the religious tolerance engendered by their belief in the doctrine of *wahdat-al-wujud'* (Unity of Being). Although this doctrine was later attacked by the Naqshbandis, *sufis* in Sind continued to accept Hindu disciples. The most influential of the *pirs*, the Pir Pagaro Sibghatullah Shah II (1921-43) systematically tried to win the trust of local Hindus by such gestures as the organization of a *shudhhi* ceremony for a Hindu who had converted to Islam and wished to be readmitted to his original faith. Mentioned in *ibid.*, pp. 137-8.
43. Hari P. Vaswani, in his biography of his father Sadhu T.L. Vaswani, who was the main spiritual guide of Sindhi Hindus in the twentieth century, mentions that 'Hindus in Sind participated in the Muharram, the festival of the Muslims. They considered the *tabut* to be so very holy that they brought their new-born babes to it to be blessed. They also covered the *tabut* with their

kerchiefs as a mark of respect and reverence.' H.P. Vaswani, *A Saint of Modern India,* Poona, 1975, p. 4.

44. See N. Boreham, 'Decolonisation and Provincial Muslim Politics: Sindh, 1937-47', *South Asia, new series,* vol. 16, no.1, 1993, pp. 53-72.
45. See S. Anand, *National Integration of Sindhis,* Delhi, 1996, in particular ch. 2, 'Partition and Mass Exodus', pp. 22-60.
46. The most significant episode of communal violence in Sind occurred in 1939 around the so-called Manzilgah agitation in Sukkur. See H. Khuhro, 'Masjid Manzilgah, 1939-40: Test Case for Hindu-Muslim Relations in Sind', *Modern Asian Studies,* vol. 32, no.1, 1998, pp. 49-89
47. R. F. Burton, *Sindh and the Races that Inhabit the Valley of the Indus, with Notices of the Topography and History of the Province,* London, 1851, in particular chapter 12, 'The Hindoos of Sindh', pp. 309-37.
48. R. F. Burton, *Sindh Revisited,* London, 1877, in Particular vol. I, chapter 14, significantly entitled 'The Hindus of Sind- their Rascality and their Philoprogenitiveness', pp.269-95, from where I extract this passage about the *banias,* pp. 283-4: 'he then takes his place in the shop, where, if you please, we shall leave him to cheat and haggle, to spoil and adulterate, and to become as speedily rich by the practice of as much conventional and commercial rascality, barely within the limits of actual felony, as he can pass off upon the world'.
49. See R. D. Choksey, *The Story of Sind (An Economic Survey), 1843-1933,* Poona, 1983, pp. 130-1.
50. D. Cheesman, *Landlord Power and Rural Indebtedness in Colonial Sind 1865-1901,* London, 1997. See also H. Khuhro, *The Making of Modern Sind: British Policy and Social Change in the Nineteenth Century,* Karachi, 1978.

51. See N. Bhattacharya, 'Lenders and Debtors: Punjab Countryside, 1880-1940', *Studies in History*, new series, vol. 1, no. 2, 1985, pp. 305-42.
52. See Cheesman, *Landlord Power*, p. 164.
53. For some instances, see *ibid.*, pp. 186-8.
54. According to the *Gazetteer of the Province of Sind*, p. 331, the average price of bajra, the staple grain crop in Sind, went up from Rs 1-1-10 per maund during 1844-50 to Rs 2-7-0 in 1896-1905.
55. On the growth of the port of Karachi and its connections with the Punjab, see A. F. Baillie, *Kurrachee (Karachi), Past, Present and Future*, London, 1890, and I. Banga, 'Karachi and its Hinterland under Colonial Rule', in I. Banga (ed.), *Ports and their Hinterlands in India (1700-1950)*, Delhi, 1992, pp. 337-58.
56. In the second half of the nineteenth century it was Bombay revenue which largely paid for the construction of a port which served primarily the Punjab. For Punjab finances it was a very good operation, and it explains why Punjab officials were never particularly keen to have Sind become part of their province. In 1903, when Sir Denzil Ibbetson, having been made lieutenant-governor of the Punjab, tried to have his domain (which had been diminished by the separation of the North-West Frontier Province in 1901) increased by the inclusion of Sind, Lord Curzon, whose grasp of interprovincial financial transfers was better than Ibbetson's quashed his attempt. See P. Mahto, 'The Separation of Sind from Bombay Presidency' in M. Y. Mughul (ed.), *Studies in Sind*, Jamshoro, 1989.
57. See H. Feldman, *One Hunderd Years of Karachi*, Kharachi 1960.
58. On the Parsis in Karachi, see T. R. Metcalf and S. B. Freitag, 'Karachi's Early Merchant Families:

entrepreneurship and community', in D. K. Basu, *The Rise and Growth of the Colonial Port Cities in Asia*, Berkeley, CA, 1985, pp. 55-9.

59. On the role of the Shikarpuris in Karachi, see Banga, 'Karachi and its Hinterland's pp. 357-8: 'The Shikarpuri Banias... migrated to Karachi to take over its grain and cotton trade as brokers which placed them in a position of dominance in the commodity export trade... Their firms of bhaibands played an important role in the Buyers and Shippers Chamber- and organization of firms engaged in maritime trade. They dominated the Karachi Indian Merchants Association founded in 1902 and played an important role in the Karachi Cotton Association founded in 1933.

❁

سندھ 1690ء سے 1760ء تک مغل جھرمٹ کی جگ مگ

ایچ۔ڈی۔سورلے/ ریاض صدیقی

(یہ مضمون ایچ۔ڈی سورلے کی کتاب ''شاہ عبداللطیف آف بھٹ'' کے ایک باب کا ترجمہ ہے)

سندھ کے حالات کے تناظر میں۔1760ء۔1690ء کے زمانوں کی کردار

ہندوستان میں مغل سلطنت عظمیٰ کے گراؤ کا عمل بہت سست رفتار تھا مگر آنے والی کایا پلٹ کے آثار شروع ہونے سے پہلے ہی حالات کا مشاہدہ کرنے والوں نے بھانپ لیا تھا۔ اس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مورخوں نے جس مستعدی اور غور وفکر کے ساتھ رومن امپائر کا احاطہ کیا ہے' اس طرح سے مغل سلطنت کا نہیں کیا گیا۔ کوئی ایسا گبن (Gibbon) پیدا نہیں ہوا جس نے اس سیاسی طاقت کی مربوط کتھا لکھی ہو جس کی شروعات سولہویں صدی میں بابر کے حملوں سے ہوئی تھی۔ اس سیاسی طاقت کی شان وشوکت لارڈ کلایو کے سامراجی دربار کے زمانے میں ڈھل چکی تھی۔ مغل راج کے سورج ڈوبنے کے منظر کی تفصیلات کا بیان سندھ کے حوالے سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اسی لیے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں زیادہ قابل توجہ بھی ہے دہلی کی سندھ پر عمل داری کے غیر موثر کردار نے بہت سے مقامی حالات کو جنم دیا جن کی وجہ سے سندھ کی قسمت ایسی تبدیلیوں کی زد میں آئی جو یقیناً منفرد تھیں اس کتاب کو لکھنے کے مقاصد میں یہ بھی مقصد ہے کہ ان مقامی واقعات کو اجاگر کیا جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں کیونکہ 1760ء۔1690ء کے زمانے کا کوئی مربوط ریکارڈ دستیاب نہیں ہے

جس پر اعتبار کیا جائے۔ ستر برس پر محیط یہ زمانہ سترہویں صدی کی آخری دہائی سے شروع ہو کر ان لڑائیوں پر تمام ہوتا ہے جو ہندوستان میں مغل اقتدار کے خلاف برپا ہوئی تھیں۔ پانی پت کی دوسری لڑائی نے مرہٹہ وفاقیت کے راج کو شکست دے دی تھی۔ جب کلایو نے پلاسی کی مہمات میں جیت حاصل کی تھی اور بیشتر حاضرین اس امکان کی نشاندہی کر رہے تھے کہ پورے ہندوستان کا مقصد برطانوی راج ہوگا۔ اس کی ابتدا یقیناً ہو چکی تھی۔ (1)

اس طرح اورنگ زیب کے اقتدار کے آخری دور میں جو نہ محسوس کی جانے والی فالج کی حالت ہندستان کی تھی یعنی شان وشوکت کی عمارت کو اندر سے دیمک چاٹ رہی تھی اور اس کا خاتمہ جدید ہندستان کے قیام سے پہلے کے درمیانی زمانے میں جنگلی قسم کے بحران اور گڑبڑ کے ساتھ ہوا (اس کے لیے Orgy of turbulencei کی ترکیب استعمال کی ہے)

سترہویں صدی کے اواخر تک یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ بوڑھا' خشک طبع' کبڑا اور اپنے اصولوں پر اٹل اورنگ زیب جس نے مغل اقتدار میں دراڑیں ڈالنے والی قوتوں کو زیر کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی چند برسوں کا مہمان ہے۔ دہلی کی بھونچال زدہ سلطنت کی ایکتا اور طاقت کو وہ اپنی قوت ارادی' صلاحیت اور قابل تعریف ذہانت سے نہ صرف قائم کیے رہا بلکہ اس کی حفاظت میں بھی کامیاب رہا تھا۔ البتہ اورینٹل یعنی مشرقی مطلق العنان حکمرانوں کی یہ نمایاں کمزوری رہی تھی کہ ان کے نظام میں پرامن طریقے سے اقتدار کی منتقلی کے موزوں وسائل دستیاب نہیں تھے۔ جب بھی مطلق العنان بادشاہ مرتا تھا تو اقتدار یعنی تخت وتاج کی وراثت کے دعویٰ کی وجہ سے حریف قوتوں میں لڑائی شروع ہو جاتی تھی۔ اس لڑائی کے نتیجے میں سول ہنگامے' انقلاب اور لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے تھے۔ ان پر اقتدار کے دعوے داروں میں وہی قابو حاصل کرتا تھا جو طاقتور ہو اور تمام اختلاف کرنے والی قوتوں کو پسپا کر دے۔ اورنگ زیب جب بستر مرگ کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا اس وقت تک تبدیلی اور ہنگاموں کے واضح آثار نہیں تھے۔ اکبری شان وشوکت سے لے کر شاہ جہاں کی شان وشوکت تک دنیا بہت بدل چکی تھی۔ جدید زمانے کی طرف پیش بندی کئی طرح سے واضح دکھائی دینے لگی تھی۔ مستقبل میں یہ امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ ہندستان پہلے کی طرح ایک براعظم رہ سکے گا۔ دنیا کے مختلف دیسوں کے مابین تجارت بھی اسی طرح شروع ہو گئی تھی جس طرح موجودہ زمانے کے عوام اپنے یہاں دیکھ رہے ہیں۔ سمندری

طاقت ایک ایسی فعال اور دلکش قوت بن گئی تھی کہ پہلے کبھی کسی زمانے میں اتنی ترقی کا تصور بھی نہیں تھا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی بھی مرتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کا حکمراں بہت زیادہ مرکز مائل سیاسی مشین کو جس کا دہلی والوں کو کوئی علم ہی نہیں تھا اور جو باہر تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی کنٹرول کر سکے۔ (یہاں سیاسی مشین کے لیے انگریزی لفظ Creakily استعمال کیا ہے جس کے معنی اس سخت دروازے کے ہیں جس کو کھولتے ہوئے ناگوار آواز پیدا ہوتی ہے) نیم جاگیردارانہ نظام وصول یابی کے دن جو کمزور توپ خانے اور ڈسپلن پر مشتمل تھے ختم ہونے کو تھے۔ ماضی کے زمانوں کے سادہ طور طریقے اب بے معنی ہو گئے تھے۔ بعض مورخوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مغل سلطنت یا امپائر کے زوال کی وجہ تخت و تاج کے ایسے باصلاحیت دعوے داروں کا فقدان تھا جو اورنگ زیب کے بنائے ہوئے راستے پر چل سکیں۔ وہ کچھ کریں جو اس نے کیا تھا دربار اور انتظامیہ کے کرپشن کا اسی طرح خاتمہ کریں اور اقتدار میں شامل جاگیردار (1) سرداروں اور گورنروں کی نااہلی اور عیاشیوں کا سدباب کریں۔ یہ خیال بالکل غلط تھا۔ مغل سلطنت کا زوال اور گراؤ اس لیے ممکن ہوا کیونکہ وہ ایسی مقامی حکومتیں قائم نہیں کر سکے اور نظم و ضبط پیدا نہیں کر سکے جن کا وقت اور حالات تقاضا کر رہے تھے۔ ایک اور بنیادی وجہ اندرونی طور پر سلطنت کی فوجی اور دفاعی قوت کا کمزور ہونا بھی تھا۔ اس فوج میں نہ تو ایسی سمندری قوت تھی اور نہ فوج میں اتنی طاقت تھی کہ وہ کسی بڑے خطرے کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں یہ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی تھی کہ وہ بہتر اور مستحکم مقامی حکومتیں بنوا سکے ہندستان بہت سے علاقوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے تناظر میں زیادہ بہتر مقامی حکومتوں کی ضرورت تھی۔ دنیا سکڑتی جا رہی تھی اور سمندری سفر کے تیز رابطے دنیا کے ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب لا رہے تھے۔ مالیاتی مستعدی میں بھی تیزی آ رہی تھی اور ان ملکوں کے مابین رقابتیں اٹھارویں صدی کی دنیا میں ہندستان کو اقتصادی وحدت کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ یہ ایک ایسا تناظر تھا جس کے تقاضوں کا موزوں حل تلاش کرنا مغل سلطنت کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اکبر کے کارنامے ہوں یا شاہ جہان کی شان و شوکت صرف اس لیے فعال رہی تھی کیونکہ نہ ہی اکبر اور نہ شاہ جہاں کو ان مشکلات کا سامنا ہوا تھا جو سترہویں صدی میں اورنگ زیب کے اقتدار کے دوران رونما ہو رہی تھیں اور سترہویں صدی کے اواخر تک خاصی تند و تیز ہو چکی تھیں۔ آخر کار ان مشکلات نے ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ مغل سلطنت جیسی بااختیار سیاسی

قوت ان کا سدباب کرنے میں کامیاب ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ پلاسی کی مہابھارت سے گیارہ برس پہلے 1746ء میں ایک چالاک یورپی مہم جو ہندستان میں بیس برسوں سے رہ رہا تھا آنے والے وقت میں مغل اقتدار کی موت کو محسوس کر چکا تھا۔ اسی سال کرنل جمیس مل نے کہا تھا کہ پورا ہندستان یا مغل سلطنت اس قدر لرزہ براندم اور دفاع کی صلاحیت سے محروم ہوگئی ہے کہ یورپ کا کوئی شاہی حکمراں جس کے ہاتھ میں فوجی قوت اور کمان ہوا اپنے علاقے میں ایسی کوئی کاروائی نہیں کر سکتا تھا جیسی کہ ہندستان میں کی گئی اور ایک ہی وار میں اس نے اپنے اور اپنی رعایا کے لیے لامحدود دولت کے ذخائر حاصل کر لیے۔ مغل پالیسی بے جان ہے‘ اس کی فوجی قوت پتلی ہے اور اس کے علاقائی سمندروں کا دفاع کرنے والی کوئی سمندری فوج موجود ہی نہیں ہے۔ بنگال کا صوبہ بھی دفاعی حصار سے محروم ہے جبکہ سمندر کے اطراف ہندستان کے دوسرے علاقے نسبتاً محفوظ ہیں جس کے نتیجے میں صوبے کی بے پناہ دولت حاصل کرنا اور اس میں رکاوٹ پیدا کرنے والی باغی قوتوں کو نکال باہر کرنا مشکل نہیں ہے۔ بیس برسوں کے اندر اندر یعنی (1846ء سے لے کر 1866ء تک) پلاسی‘ پانی پت‘ وندی وش اور بکسر کے میدانوں میں برپا ہونے والی جنگوں نے مل کی پیش گوئی کو سچ ثابت کر دیا تھا۔ مغل سلطنت کے گراؤ کی نمایاں وجوہات تھیں جن میں سے کسی کا بھی دہلی کے تخت و تاج پر براجمان حکمراں کی اہلیت یا نا اہلیت یا جاگیردارانہ اشرافیہ کی کمزوریوں سے کوئی سمبندھ نہیں تھا۔ ان دو وجوہات میں اول سلطنت کے دفاع کے لیے فوجی قوت کا موجود نہ ہونا اور دوم انتہائی مرکزیت تھیں۔ انتہائی مرکزیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عالمی تجارت کی ترقی کے حوالے سے ہندستان کے دور دراز علاقوں میں باہر سے آنے والے جگہ جگہ بس گئے تھے اور سلطنت کا ان پر کوئی کنٹرول نہیں تھا کیونکہ اقتدار کا مرکز ان علاقوں سے بہت دور اور کٹا ہوا تھا۔ جاگیردار اشرافیہ میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا وہ ماضی کے زمانوں سے ان میں موجود سیاسی دھڑ پنچ اور اقتدار کے غلط استعمال کی وجہ سے اپنی جڑیں پھیلا چکا تھا کوئی ایسی طاقت نہیں تھی جس نے ان حالات پر قابو پانے میں دلچسپی لی ہو(2) بلکہ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ جوں ہی مغل سلطنت پر داب پڑی اسی وقت وہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھیر ہوگئی۔ لین پول کے بقول (3) 4 مارچ 1707ء کو جب اقتدار کے پچاس برس پورے ہو چکے تھے نواسی برس کے اورنگ زیب کی وفات ہوگئی۔ اسی کی ہدایت (وصیت) کے مطابق اسے

بہت سادگی کے ساتھ دولت آباد میں بزرگوں کی قبروں کے قریب دفنا دیا گیا۔ اس کی موت ایک الیہ کی اشاریہ اور ایک عہد کی موت تھی۔ اس سانحے کے بعد مغل سلطنت میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا اور ہندستان کا براعظم انتشار اور عدم استحکام کا میدان ہو کر رہ گیا تھا جیسا کہ سرکار نے کہا ہے کہ مغل عمل داری میں جو افراتفری پھیلی تھی اس کا اظہار اس وقت ہوا جب باجی راؤ (مرہٹہ) کی فوجوں نے 1737ء میں شاہی دارالسلطنت کو تاراج کیا تھا اور اس صورت حال کو دیکھ کر نادر شاہ نے دھاوا بول دیا تھا چنانچہ 1739ء میں دہلی کا اقتدار بری طرح ڈھیر ہو گیا تھا۔ سر ایلفرڈ لائل (Alfred Lyall) نے اس زمانے کے منظر کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس نے لکھا کہ نادر شاہ نے تباہ و برباد شہر میں دوبارہ قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا۔ اس نے بادشاہ سے اس کی ساری دولت اینٹھ لی اور مغل اقتدار کو تباہی کے بستر پر سسکتا ہوا چھوڑ کر اپنے دیس کو چل دیا۔ دو برس بعد افغانستان کے ابدالی قبیلے کا جنگجو احمد شاہ ابدالی دہلی پر اپنی فوجیں لے کر پل پڑا۔ نادر شاہ کی فوج میں وہ بہت بڑی فوج کا کمانداد تھا۔ جب ایک ایرانی نے خراسان کے پڑاؤ میں نادر شاہ کا کام تمام کر دیا تھا تب وہ مشرق کی طرف افغانستان پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اسی علاقے سے آگے بڑھ کر اس نے 1751-1748 کے دوران پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی زمانے میں مرہٹہ قوتیں وسطی ہندستان میں بازو کھول رہی تھیں اور ان کو جنوب مغرب کی طرف سے بڑھتا ہوا ایک تباہ کن طوفان کہا جا سکتا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے عوام خود کو کسی حکمراں سے بالکل محروم محسوس کرنے لگے تھے اور ہوا میں پھینکا ہوا ایک پتھر ہو کر رہ گئے تھے جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی ہے۔ اس صورت حال میں جو بھی طاقت ان کو اقتدار میں مل جاتی تھی خواہ وہ فطری ہو (4) یا مافوق الفطرت اسی کو اپنا سائبان سمجھ لیتے تھے۔ اکبر کے جاہ و جلال، جہانگیر کے انصاف، شاہ جہاں کی شان و شوکت اور ظالم و کٹر پنتھی مذہبی اورنگ زیب جس کی شخصیت میں لچک اور مفاہمت کا دور دور تک گزر نہیں تھا ان کے عظیم الشان ہندستان کا اس طرح خاتمہ ایک افسوسناک باب ہے۔

اس دور کا جس سے کہ میری اس کتاب کا تعلق بھی ہے یہ نمایاں منظر تھا۔ مغل اقتدار کے زوال کی یہ کہانی میری کتاب کے مقصد کی وضاحت اور تفہیم کے لیے ضروری ہے کیونکہ یہی وہ دور بھی ہے جب صوبہ سندھ میں اہم اور دوررس تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ میں نے یہ کوشش بھی کی

ہے کہ اس زمانے کے سندھ کی سماجی زندگی کی تصویر پیش کروں جو کہ نظروں سے اوجھل تھی۔ اس تصویر کو سمجھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ سندھ سے باہر رونما ہونے والی صورت حال کا صحیح اور حقیقی تناسب کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ 1592ء میں اکبر نے سندھ کو مغل سلطنت کے ساتھ نتھی کیا تھا۔ نادر شاہ کے حملے 1737ء تک سندھ مغل سلطنت کا اٹوٹ انگ رہا۔ اس کے بعد سندھ ایرانیوں کے ہاتھ لگا اور پھر افغانوں کے۔ اورنگ زیب کی موت اور نادر شاہ کی یلغار کے درمیان تیس برسوں کے دوران سندھ میں مغل سلطنت کی بڑھتی ہوئی کمزوری کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سندھ کے اقتدار پر براجمان کلہوڑا خاندان نے حالات کا فائدہ اٹھا کر خود کو زیادہ خود مختار بنا لیا تھا۔ جن چیزوں پر وہ قبضہ کر سکتے تھے ان پر قبضہ کر لیا تھا اور جو کچھ بھی قبضہ میں ملا اس پر اپنا اجارہ بھی قائم کر لیا۔ مخصوص حالات میں قبضہ گیری کا یہ مزاج مشرقی روایت کا حصہ تھا۔ ان کو یہ اچھی طرح اندازہ تھا کہ دارالسلطنت دہلی بہت دور ہے اور اپنے بکھیڑیوں میں الکھا ہوا ہے۔ ہندستان کی طرف سے مقرر کیے جانے والے گورنروں کا کلہوڑا حکمراں خاندان نے ان کی جگہ سندھی گورنر مقرر کیے جو اب مغلوں' ایرانیوں اور افغانوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ 1760ء تک کلہوڑا خاندان راج پاٹ پر براجمان ہو گیا تھا گو کہ ابھی وہ پوری طرح آزاد نہیں ہوا تھا۔ کلہوڑا حکمرانوں نے جس طرح اپنے اقتدار کو مستحکم کیا اور اپنی اہمیت میں پھیلاؤ پیدا کیا ان کا کوئی کارنامہ نہیں تھا۔ اس کی اصل وجہ دہلی کے تخت و تاج کی بے بسی اور کمزور صورت حال تھی۔ ان حالات کا منافع اٹھاتے ہوئے سندھی گورنروں نے خود کو حکمران بنا لیا تھا تاہم کسی بڑے حملے کی صورت میں وہ پسپائی کے لیے تیار تھے۔ وہ باہر سے کنٹرول کرنے والی قوتوں کو محصولات ادا کرتے تھے۔ کلہوڑا حکمرانوں کے زوال کی وجہ بھی وہی تھی جو مغل سلطنت کی تھی یعنی فوجی قوت کا فقدان ان کی حکمرانی کو تالپور خاندان نے ختم کر دیا تھا مگر انیسویں صدی کی پہلی دہائی تک وہ افغان حکمرانوں کے دباؤ سے آزاد نہیں ہو پائے تھے۔ ایک سو برسوں تک کلہوڑا اور تالپور حکمرانوں ہے باہمی تعاون کے ذریعہ جو کوششیں کی تھیں اس کے نتیجے میں سندھ ایک معمولی درجے کی مسلمان ریاست بن گیا تھا اور اس وقت تک یہ ریاست خود کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی جب تک کہ 1843ء میں برطانیہ نے سندھ کو فتح نہیں کر لیا تھا۔ ان حکمرانوں نے انتظامی سطح پر مغل انتظامیہ کے طور طریقوں ہی کو جاری رکھا اور اس کے ساتھ اسلامی نظریئے کو بھی پیوند کیا اس طرح ان حکمرانوں نے ایک ایسی

سیاسی قوت بنالی جس نے ان کی انفرادیت قائم کردی تھی اور انہوں نے علیحدہ ریاست کی حیثیت سے اپنی حکمرانی کو برقرار رکھا۔ کلہوڑا اور تالپوروں نے راج پاٹ کا جو نظام رائج کیا تھا اس میں دونوں ہی خاندانوں کے حکمرانوں نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ برطانوی ڈومنین نے میانی اور دبو میں جنگیں برپا کیں اور 1843ء میں تالپور حکمرانوں کا خاتمہ کردیا۔ 1760-1690ء کے زمانوں کا ریکارڈ دستیاب نہیں تھا چنانچہ سندھ کے سماجی حالات ہی کو براہ راست سفر بنایا گیا۔ سندھ کے عوام جس طرح اٹھارویں صدی کے پہلے کے حالات میں زندگی گزارتے تھے۔ 1843ء میں چارلس نیپیر کے دور میں بھی اسی طرح زندگی گزار رہے تھے مگر اس دعوے پر پوری طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں جو بھی اصل صورت حال تھی اور جس کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں ان کو کس طرح حاصل کیا جائے جو کہ اس کتاب کا مقصد بھی ہے۔ اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی اپائے نہیں ہے کہ سندھ کے عوام کی صورت حال اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ان کلاسیکی کاموں سے رجوع کریں جو سندھی زبان میں ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے یہ معلوم کیا جائے کہ ان کے پڑھنے اور سننے والے عوام کس طرح کی زندگی گزارتے تھے جن کے لیے یہ نظمیں لکھی گئی تھیں اور جو ان نظموں کو گایا کرتے تھے۔

سندھ اور اس کی تاریخ کے کچھ نمایاں خواص

تاریخ کے لکھاریوں کے لیے سندھ ایک مشکل ملک ہے۔ اس کا سبب واضح ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سندھ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ابتدائی دور میں ایک عظیم الشان تہذیب تھی ہندستان میں زمین کی علاقائی ساخت سوائے بعض ادھر ادھر ایک دوسرے دور دور علاقوں کے بری طرح اطلاع و معلومات کے تاریخی آثار سے محروم ہے۔ کتبات اور ایسے تمام طبعی آثار جو ماہرین آثار قدیمہ کو ان حقائق سے باخبر کرتے ہیں جن سے تاریخ میں خالی جگہوں کو مکمل کیا جا سکتا ہے ہندستان میں دستیاب نہیں ہیں۔ (5) صرف چند ہی ایسی پرانی عمارتیں محفوظ رہ سکی ہیں جن کے ذریعہ ہم پندرہویں صدی کے زمانے سے پہلے کے زمانوں کی تہذیب کا خاکہ مرتبہ کر سکتے ہیں۔ جن عمارتوں کو ہم قدیم میں گنتے ہیں سوائے چند کے بیشتر کا تعلق عموماً سترہویں صدی کے اوائل سے ہے بلکہ ان میں سے بھی اکثر کا تعلق بعد کے زمانے سے (یعنی اٹھارویں صدی سے) ہے۔

ہندستان میں زمانہ قدیم کے تعلیمی مراکز کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے' قدیم زمانے کی لائبریریوں او رقدیم دستاویزات کے ذخائر بھی دستیاب نہیں ہیں۔(6) پہلے کی صدیوں میں جو علما سندھ میں رہا کرتے تھے ان کے بارے میں معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اگر کچھ آثار مل بھی جاتے ہیں تو ان کی کوئی معنویت نہیں ہے۔ عمارتوں کا نہ ہونا کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ بھی نہیں ہے جس کی وضاحت نہ کی جا سکے۔(7) سندھ کی زمین صدیوں سے دریائے سندھ کی زد میں رہی جو اکثر اپنے بہاؤ کے راستے بدلتا رہتا تھا اور جو کچھ بھی اس کے بہاؤ کے رستے میں آیا وہ تباہ ہوا۔ عمارتیں زیادہ تر مٹی گارے' لکڑیوں اور بھوسے کے آمیزے سے بنتی تھیں۔ اس قسم کی عمارتیں بڑے شہروں کے باہر اب بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی عمارتیں جن میں پکی ہوئی اینٹیں استعمال ہوئی تھیں جیسے کہ مسجدوں اور مقبروں کی وہ بھی بپھرے ہوئے دریائی پانی کے بہاؤ کی چوٹیں کھا کر تباہ ہو جاتی تھیں۔ زمین یک سیم وتھور اور آب وہوا کی سختی جو ہر سال کے چھ مہینے اتنی سخت گرم ہوتی ہے جس کی شدت کا بیان کرنا مشکل ہے۔ یہی نہیں بلکہ گردوغبار کے طاقتور طوفان بھی آتے ہیں۔(8) موجودہ زمانے کے بڑے شہر جیسے کراچی' حیدرآباد' سکھر' شکارپور اٹھارویں صدی کے جدید زمانے کی دین ہیں۔ ابتدائی زمانے کے شہر غائب ہو چکے ہیں اور اگر بھولے بھٹکے ملتے بھی ہیں تو گارے مٹی کے ٹوٹے پھوٹے چند مکانات تک ہی محدود ہیں۔ ایک ایسے بدلتے ہوئے دریائی علاقے کی زمین پر جو سمندر کی سمت کے علاوہ ہر طرف ریگستان یا بنجر پتھریلی پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے ایسی کسی جگہ کی تلاش بے سود ہے جہاں آپ کو قطب مینار' وجے نگر اور متھرا جیسی عمارتیں اور منظر دکھائی دے سکیں گے۔ تاریخ لکھنے والا بے چارہ کس طرح ماضی کا کوئی قابل اعتبار خاکہ تیار کر سکتا ہے جب اسے حوالے' آثار اور دوسرا مستند مواد ملتا ہی نہیں ہے۔

اب اس تناظر میں مطالعہ کرنے والے اگر سندھ کے ماضی کی صدیوں کو دیکھیں تو سندھ کی تاریخ کے بعض نمایاں خواص ان کو نظر آئیں گے۔ تاریخ کے خاصے بڑے عرصے تک ان اہم واقعات سے جو باقی ماندہ پڑوسی ایشیا میں رونما ہوتے رہے تھے سندھ بالکل کٹا رہا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے اہم واقعات تھے جن کے گہرے اثرات سندھ پر مرتب ہوئے۔ مگر ان اثرات کی معنویت کو بہت کم ہی سمجھا گیا۔ سندھ اور اس کے عوام کی کتھا میں جو اکیلا پن تھا اس کی بہتر انداز سے وضاحت سندھ کی زندگی کو ایک ایسا تالاب سمجھ کر اس سے کی جا سکتی ہے جس میں وقتاً فوقتاً باہر

سے پتھرآ کر گرا کرتے تھے۔اس کے نتیجے میں کچھ لہریں پیدا ہوتی تھیں مگر دھیرے دھیرے ختم ہو جایا کرتی تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سندھ کی تاریخ ڈھیلی ڈھالی' الگ اور پرسکون ہے جہاں بعد کے زمانے میں ایک مذہبی اسلامی سماج قائم ہوا جس نے نمایاں صورت اختیار کرلی۔سندھ کی تاریخ میں ایسے بھی واقعات رونما ہوئے تھے جن کی تاریخی معنویت مسلم تھی مگران واقعات نے سندھ پر جو بھی اثرات مرتب کیے ہوں سندھ سے باہران کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔سب کچھ زیریں انڈس تک ہی محدود رہا۔موئن جوداڑو کی تہذیب جس کا زمانہ مشکوک ہےاور غالبًا 325اور 275 قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے سمیرین اور المانی تہذیب سے بہت قریب تر ہے جب کہ اس قربت اور یکسانیت کو ابھی تک پوری طرح بیان نہیں کیا جاسکا ہے۔ یہ پتھر' کانسی اور شہر کی ملی جلی تہذیب تھی جس کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ گنگا کے علاقے تک پہنچی تھی یا نہیں۔(9) بہر حال ابھی تک اس تہذیب کے آثار سوائے سندھ اور پنجاب کے ایک شہر کے اور کہیں نہیں ملے ہیں (10) 325 قبل مسیح میں سکندر نے ہندستان کی مہم سر کی تھی اور اپنی فوج کے ساتھ دریائے سندھ کے علاقوں کی طرف بھی گیا تھا۔اس نے جن راستوں پر سندھ میں سفر کیا اس کے بارے میں صرف روایتی قصے کہانیاں ہی جانکاری فراہم کرتی ہیں۔ 711ء میں جواں سال عرب فاتح اسلامی فوجوں کے ساتھ سندھ پہنچا جس کے نتیجے میں اسلام نے زیریں انڈس کے علاقے میں مسلمانوں کا ایک مرکز قائم کردیا۔سندھ میں اسلام کے اثرات بہت گہرے اور فیصلہ کن ثابت ہوئے۔اس کے تین سو برسوں کے بعد مسلمانوں نے ہندوستان پر یلغار کی اور بعد میں ہندستان کی پوری تاریخ کا رخ بدل دیا۔ 1351ء میں گجرات اور کاٹھیاوار کی بغاوتوں کو ختم کرنے کے بعد دہلی کا بادشاہ محمد بن تغلق زیریں سندھ کے علاقے میں ٹھٹھہ کے قریب بیمار ہوا اور بخار کی حالت میں مرگیا۔ برنی نے خوبصورت لفظوں میں لکھا ہے کہ ''موت نے بادشاہ کو اس کے عوام سے اور عوام کو بادشاہ سے آزاد کردیا تھا۔'' 1540ء میں ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان سول وار کے نتیجے میں ہمایوں سے اس کی سلطنت چھن گئی اور بے یار و مددگار ادھر ادھر بھاگتا رہا۔ کچھ دنوں تک اسے سندھ میں پناہ ملی۔1542ء میں عمرکوٹ کے مقام پر اس کا فرزند اکبر پیدا ہوا جو بعد میں مغل اعظم ہوا۔اس تاریخی واقعہ کے بعد ایک بار پھر سندھ اس وقت سول وار کا میدان بنا جب 1658ء میں اورنگ زیب کے جرنیلوں نے سندھ میں داراشکوہ کا پیچھا کیا تھا اور بخارا سے ٹھٹھہ

تک یہ جرنیل اسے کھدیڑتے رہے۔ سہون سے بھاگتے ہوئے جب داراشکوہ نے گجرات کا رخ کیا تو سندھ کی سرحد پر شاہی فوجوں نے اسے دھر لیا تھا۔ اور اسے اسی کے سگے بھائی کے مفاد کو پورا کرنے کے لیے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ بھکر کا گھراؤ جس میں منوچی بھی بطور توپچی شریک تھا ایک ایسا روشن باب ہے جس کا ذکر اس اطالوی مہم جو نے اپنی یادداشتوں میں قلمبند کیا ہے۔ انڈس ڈیلٹا پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب اپنی دوسری فیکٹری قائم کی تھی جس کی عمر بہت کم رہی، ایسا کوئی بڑا اور اہم واقعہ سندھ کی تاریخ میں 1758-1659ء کے دوران رونما نہیں ہوا۔ 1843ء میں البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھ پر فتح حاصل کی اس زمانے میں سندھ علاقائی طور پر جس صورت حال کا منظر دکھاتا تھا اس میں بنیادی اہمیت اس سیاسی دنگل کی ہے جس میں افغانستان، سکھ اور ایسٹ کمپنی شامل تھے۔ یہ خاصا پیچیدہ سیاسی دنگل تھا اس کا قرض بھی سندھ ہی کو الحاق کی صورت میں ادا کرنا پڑا اور برطانوی سرکار نے ان کے اپنے موقف کے مطابق انتہا پسند اور سخت گیر تالپوروں کے خاندان کا تیاپانچا کر دیا۔ ان چند واقعات کے علاوہ سندھ کی تاریخ ایک خشک یکسانیت اپنے حدود میں بند اور باہر کی دنیا کے لیے کچھ دلچسپ نہ ہونے کا منظر دکھاتی ہے۔ یہی کٹاؤ یا علیحدگی سب سے نمایاں رنگ ہے جو سندھ میں رہا۔ سندھ کی اپنی ایک زندگی تھی۔ جیسا اس کتاب سے منکشف ہوگا۔ اس علیحدگی کے خاص سبب ہیں اول سندھ (جسے سورلے دیس Country لکھتا ہے) نقشہ جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ریگستان ہر طرف پھیلی ہوئی بنجر زمین اور سخت قسم کی آب و ہوا پر جس میں کسی فعال مہم کے لیے سال میں صرف چند مہینے ہی ملتے ہیں، مشتمل ہے اور دوم ایک دریائی وادی کی نسبتاً بے رنگ و بے حسن صورت جس میں زرخیزیت تو بہت زیادہ ہے اور فصلیں پیدا کرنے کی پوری صلاحیت بھی ہے مگر ناقابل بھروسہ کیونکہ دریائے سندھ کے بڑے سیلاب تباہی مچا دیتے ہیں۔ اس تباہی میں کمی بعد کے زمانے کی بات ہے جب سندھ میں آبپاشی کا نظام قائم ہوا۔ اس طرح آوارہ خرام اور خانہ بدوش قافلے شمال مغرب کی سرحدی رکاوٹوں کو توڑتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وسط اٹھارویں صدی میں افغانستان کی سلطنت کا ابھار شروع نہیں ہوا۔ دوسری طرف پنجاب میں سکھوں کو عروج ہوا جس کے نتیجے میں شمال مغربی سرحدوں سے گھس بیٹھ کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا پنجاب کے زرخیز علاقے اور دریائے گنگا کا علاقہ چونکہ بہت زیادہ مالا مال تھا اس لیے افغانستان کی طرف سے آنے والے پنجاب اور دریائے گنگا کے

علاقوں کی طرف آتے تھے اور لوٹ مار کرتے تھے۔ لڑائیوں کی طویل تاریخ میں جو ہندستانی تاریخ
میں سال 1000ء اور اس کے بعد کی ہے اس حوالے سے سندھ کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ سندھ میں
حکمرانوں کی مدت بھی بہت کم ہوتی تھی جو سندھ کے لوگوں کے لیے مشکلات کی وجہ بھی ثابت
ہوئی۔ سول لڑائیاں ہوا کرتی تھیں اور بلوچستان کی طرف سے پہاڑی لوٹ مار کرنے والے سندھ
میں آ جاتے تھے۔ اکبر کے دور کے اختتام کے قریب مغلوں کو یہ خیال آیا کہ سندھ کو بھی امپائر
(سلطنت) میں شامل کیا جائے 1592ء میں اکبر نے سندھ کو مغل سلطنت کا حصہ بنایا تھا مگر مغل
امپائر (سلطنت) کا حصہ بن جانے کے بعد بھی سندھ کی صورت حال وہی رہی جو پہلے تھی۔
مورلینڈ نے مغل امپائر میں اقتصادی تعمیر نو کے حوالے سے جب سندھ کا مطالعہ کیا تو اسے کسی قسم کا
تاریخی ریکارڈ نہیں ملا۔ (11) سندھ کے لوگوں میں خواہ مقامی ہوں یا باہر سے آنے والے آباد کار
ہوں کسی قسم کی فوجی صلاحیت نہیں تھی۔ اس سرزمین کی تاریخ میں کوئی ایک ایسا جنگجو نظر نہیں آتا ہے
جس کے حوالے سے تاریخ نے اس کی فتوحات کا حال لکھا ہو۔ مجموعی طور پر لوگ امن پسند اور محنت
کش تھے اور زیریں وادی سندھ کے معاملات و امور میں پوری طرح حصہ لیتے تھے۔ جہاں جہاں
ممکن تھا لوگ زرخیز زمینوں پر کھیتی باڑی بھی کرتے تھے۔ تیرہویں صدی عیسویں میں جب سومرو
پریوار کا راج پاٹ تھا سندھ کی غالب آبادی مسلمانوں کی تھی۔ حکمرانی پر مذہبی شعور حاوی تھا اور
اقتدار کی لگام سید طبقے کے ہاتھ میں تھی۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں جب سندھ پر مغلوں کا
کنٹرول کمزور ہو گیا تو خدا ترس فقیر خانوادے کی آل اولاد کا دعویٰ کرنے والے کلہوڑا نے اپنی
موروثی حکمرانی قائم کر لی اور سندھ کے آزاد حکمراں بن گئے۔ کلہوڑا حکمرانوں کو ہٹا کر سندھ پر
حکمرانی کرنے والے تالپوروں نے اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا تاہم وہ سیدھے سادے چرواہے تھے
جنہوں نے اپنے عمل کی بنا پر خود کو باصلاحیت ثابت کیا اور نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے اپنے بلوچی
قبیلوں کی طاقت پر انحصار کیا۔ کلہوڑا حکمرانوں کی طرح انہوں نے بھی سندھ کے اکیلے پن اور
ایک محدود قسم کی مسلم اسٹیٹ کا تحفظ کیا جس کی ساخت اور انتظامی صورت جزوی طور پر قرآن کے
نظریات اور جزوی طور پر اس نظام پر قائم ہوئی جو مغلوں نے مکمل صورت میں رائج کیا تھا۔ ان
مختلف اثرات و عوامل کے ذریعہ سندھ نے اپنی انفرادیت اور پہچان اور ایک ایسی علیحدگی کو برقرار
رکھا جو ہندستان میں بالکل ہی الگ نوعیت رکھتی تھی۔ جیسا کہ آوٹ رم (12) نے لکھا ہے کہ جب

سندھ کے یہ نابالغ اور آپس میں بٹے ہو قبائلی سردار یعنی میران سندھ 1843ء میں انگریزوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے تو ہندستان کے برطانوی اس طرح سندھ میں داخل ہوئے جیسے کہ سندھ ان کے لیے ہمیشہ سے نامعلوم سرزمین تھا۔ سندھ انگریزوں کے لیے اتنا نیا اور اجنبی تجربہ تھا کہ اس زمانے کے سندھ پر لکھا جانے والا مواد برطانوی پبلک کی جانکاری کا ذریعہ بنا اور خوب مقبول ہوا۔ سندھ کا علاقہ کیسا تھا' اس کی کیا خصوصیات تھیں' حکومت کی ساخت' سماجی زندگی اور عوام کیسے تھے اس کے بارے میں مستند تفصیلات اسی لکھے گئے مواد اور ایسٹ کمپنی کی کچھ عرصے تک قائم رہنے والی سترہویں اور اٹھارویں صدی کی فیکٹریوں کے ریکارڈ سے معلوم ہوتی ہیں۔ ان تفصیلات میں 1760-1690ء کا سندھ نظر آتا ہے اور زیر نظر کتاب کا بھی یہی موضوع ہے۔

تاریخی ماخذ

1760-1690ء کے عہد کو از سر نو کرنے کے لیے جن تاریخی ماخذ پر انحصار کیا ہے ان کی پانچ قسمیں ہیں۔ اول وہ مواد یا کام جو سندھ کے موضوع پر مقامی مورخوں سے منسوب ہے دوم' مقامی لکھاری جنھوں نے اس عہد یا اس سے پہلے کے عہد کا احاطہ کیا ہے اور اس میں تفصیل کے ساتھ سندھ کے حوالے بھی ملتے ہیں' تیسرا ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو مرحلوں کا ریکارڈ جب اس نے سندھ میں فیکٹریاں قائم کی تھیں۔ پہلا مرحلہ تھا 1662-1635ء کا اور دوسرا تھا 1775-1758ء کا چوتھا یورپین سیاحوں کا مواد جو سترہویں اور اٹھارویں صدیوں کے دوران سندھ آئے تھے اور پنجم وہ سندیں جو سندھ پر قبضہ کرنے والے انگریزوں سے متعلق ہیں۔ ثانوی استفادہ بہت سی ان کتابوں سے بھی کیا گیا ہے جو اکبر' جہانگیر' شاہ جہاں اورنگ زیب اور ان کے بعد آنے والوں کے زمانوں کی سماجی زندگی کو موضوع بناتی ہیں۔ ان کتابوں کی تعداد بھی زیادہ ہے اور ان پر اعتبار بھی کیا جاسکتا ہے مگر ان میں چند ہی ایسی کتابیں ہیں جن میں سندھ کا حال ملتا ہے جو کہ میرے مطالعہ کا موضوع ہے۔

ان بہت سی قسموں کے تاریخی ماخذ کی کیا قدر و قیمت ہے؟ جہاں تک شاہ عبداللطیف کے موضوع کا سوال ہے مقامی مورخوں نے جن کے یہاں سندھ کے بارے میں جانکاری ملتی ہے اور جو 1760-1690ء کے دور کا احاطہ کرتی ہیں اس سوال کا جواب فراہم نہیں کرتے ہیں چنانچہ ان

کی کتابیں ہماری مدد نہیں کرتی ہیں۔ ان کتابوں میں اس دور کا بھی احاطہ نہیں ہوا ہے جو میرے مطالعہ کا دور ہے۔ ان میں سوائے ایک یا دو کے کسی بھی جہانگیر کے زمانے سے آگے کے دور کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ سندھ کی بیانیہ تاریخی کتابوں میں پانچ اہم ہیں۔ تاریخ معصومی' تاریخ طاہری' بیگلار نامہ' ترخان نامہ اور تحفتہ الکرام۔ یہ کتابیں فارسی زبان میں ہیں جو کہ برطانوی اقتدار تک ملک کے حکمرانوں کی درباری و دفتری زبان تھی تاریخ سندھ کے مصنف بھکر کے میر محمد معصوم ہیں جو کہ سب سے جامع تاریخ کہی جاسکتی ہے مگر اس میں اکبر کے ہاتھوں 1592ء میں مقامی سندھی حکمرانوں کی شکست سے آگے کا احوال نہیں ملتا ہے۔ ٹھٹھہ کے مرزا جانی بیگ کی گرفتاری کا ذکر اس تاریخ میں ہے۔ محمد معصوم کرمان کے سرفرازی حسینی کے بیٹے تھے اور بھکر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق مذہبی پیشواؤں کے سید خاندان سے تھا۔ 1600ء میں انہوں نے سندھ کی تاریخ قلمبند کی تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے سندھ کی تاریخ مرتب کی تھی مگر اس میں بزرگوں اور پیروں وغیرہ کے حوالوں سے بہت زیادہ محیر العقول معجزات بھی دیئے تھے جس کی وجہ سے ان کی تاریخ سندھ سائنسی انداز نظر رکھنے والے مورخوں کے لیے مفید ثابت نہیں ہوئی۔ تاریخ طاہری کے مصنف میر طاہر محمد نسیانی ٹھٹھہ کے سید حسن کے بیٹے تھے۔ مصنف اور ان کے پریوار کی دو نسلیں ارغون اور ترخان حکمرانوں کے خدمتگار رہی تھیں۔ اکبر نے ان حکمرانوں کا خاتمہ کر کے سندھ کو مغل حدود میں شامل کیا تھا۔ تاریخ طاہری کی تکمیل 1621ء میں ہوئی تھی جو 1621ء سے لے کر قندھار میں زہر دے کر مرزا غازی بیگ کے مارے جانے تک کا بیانیہ ہے۔ اس کتاب کے بعض حصے تاریخی بیان اور حوالوں کے اعتبار سے اہم ہیں اور اسے مصنف نے خاصے خوبصورت اور دلکش اسلوب میں لکھا ہے۔ اس قسم کے بیانیے تاریخ کے حوالے سے شاید ہی لکھے گئے ہوں۔ بیگلار نامہ امیر سید قاسم بیگلار کے زور قلم کا نتیجہ ہے جن کا تعلق سمرقند کے ترمیز خاندان سے تھا۔ یہ خاندان شاہ حسین ارغون کے زمانے میں آیا اور سندھ میں آباد ہو گیا۔ آباد ہونے کے بعد اس پریوار کے مردوں نے سندھیوں کے بھٹی قبیلے میں بیاہ کرائے تھے۔ بیگلار نامہ غالباً 1628ء میں مکمل ہوا تھا۔ تاریخی اعتبار سے اس کی اہمیت معمولی ہے۔ اس کا موضوع ترخانوں کے دربار کے حالات کے بیان تک محدود ہے۔ مصنف نے عمر کوٹ کے ویریسی رانہ کی تباہ کن فتوحات پر زیادہ توجہ دی ہے جس کے خاندان میں مصنف کا بیاہ ہوا تھا۔ ترخان نامہ کے مصنف سید جمال' میر جلال

الدین حسینی شیرازی کے بیٹے تھے۔ ترخان نامہ کا زیادہ تر حصہ تاریخ سندھ اور تاریخ طاہری سے مستعار ہے۔ یہ تاریخ اصل میں مرزا محمد صالح ترخان کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہے جس نے مغل بادشاہ سے وفاداری کو نبھایا تھا اور جس کے عوض میں کئی عہدے بھی حاصل کیے تھے۔ وہ ٹھٹھہ کا پہلا صوبیدار (یعنی گورنر) اور بعد میں گجرات کا صوبیدار بھی رہا تھا۔ مغل بادشاہ کے لیے وہ بہت مددگار ثابت ہوا۔ اس کی تاریخ کی تکمیل 55-1654ء میں ہوئی مگر تاریخی اعتبار سے اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سندھ کے کسی باسی کی لکھی ہوئی سب سے زیادہ بہتر کتاب تحفۃ الکرام ہے۔ اسے مصنف کے دور سے لے کر آخر تک کی عمومی تاریخ کہا جا سکتا ہے جو تین جلدوں میں ہے۔ تیسری جلد میں خصوصیت کے ساتھ سندھ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان جلدوں کے مصنف ٹھٹھہ کے سید علی شیر قانع ہیں تحفۃ الکرام میں تاریخی مواد زیادہ ہے مگر تاریخی بیانئے میں جگہ جگہ مصنف نے چھلانگ لگا کر محیر العقول واقعات اور بزرگوں و پیروں کی کہانیاں بھی پیوند کر دی ہیں چنانچہ تاریخ کی مجموعی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے اس میں مرزا سرفراز کلہوڑا تک کا زمانہ شامل ہے اور تاریخ کا بیانیہ 1773ء پر تمام ہوا ہے۔ یہ کتاب اس زمانے کا احاطہ کرتی ہے جس سے مجھے سروکار ہے۔ یہ تاریخ اگر تاریخ نویسی کے اصولوں کے مطابق لکھی گئی ہوتی تو یقیناً نہایت معتبر ہوتی مگر اس کا انداز بھی رائج تاریخ نویسی کی روایت کا پیرو ہے اور ان تمام کمزوریوں سے آلودہ بھی ہے جو مشرقی (Oriental) تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ دوسرے درجے کی مقامی تاریخوں میں جو عموماً یا خصوصاً سترہویں اور اٹھارویں صدیوں کی مغل سلطنت پر محیط ہیں صرف آئین اکبری قابل ذکر ہے۔ اس کا زمانہ میرے زیر نظر زمانے سے سو برس پہلے کا ہے مگر جانکاری کے حوالے سے یہ کتاب اہم ہے۔ دوسری کتابیں جن کی تعداد کم نہیں ہے ان میں سندھ کا ذکر یا تو نہ ہونے کے برابر ہے یا بالکل نہیں ہے۔ جس کا سبب تمام ہندستان سے سندھ کا اکیلا ہونا تھا اور جس کی وضاحت میں کر چکا ہوں۔ اس قسم کے کاموں کی بس اتنی ہی اہمیت ہے کہ ان سے جہانگیر اور بعد میں وسط اٹھارویں صدی نے زوال اور ان زمانوں کی صورت حالات کے بارے میں جانکاری مل جاتی ہے۔ زیادہ تر تاریخی مواد جو کہ شان دار ہے انگریزوں کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ مورلینڈ کی کتابیں ''انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر'' (اکبر کے دیہانت کے وقت کا ہندوستان) اور ''فرام اکبر ٹو اورنگ زیب'' (اکبر سے اورنگ زیب تک) اہم ہیں۔ سرکار نے اواخر مغل دور کا مطالعہ خاصی احتیاط

سے قلمبند کیا ہے۔ اروِن (Irvine) نے اواخر کی مغل انتظامیہ کے خاکے قلم بند کیے ہیں۔ ونسنٹ اسمتھ (Vincent Smith) نے اکبر دی گریٹ مغل (مغل اعظم اکبر) اور لین پول (Lane Poole) نے ''اورنگ زیب'' لکھیں۔ ان کے علاوہ اورنگ زیب کے زمانے پر ایک تاریخی فرخی نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب کی کتابیات مستند لکھاریوں کے بارے میں ہمیں کچھ جانکاری دیتی ہے جو 1600ء اور 1750ء کے سندھ کے مطالعے میں بہت قیمتی مواد فراہم کرتی ہے۔ اس کتابیات میں معاصر تاریخی کام اور دوسرے مستند لکھاریوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے سندھ کے بارے میں زیادہ مفید معلومات کا ماخذ ابتدائی دور کے فارسی و عربی لکھاریوں کی تاریخیں ہیں۔ ان میں سے کچھ کے حوالے زیر نظر کتاب کی کتابیات میں بھی شامل ہیں۔

مقامی تاریخ لکھنے والوں کے موضوع کو تمام کرنے سے پہلے ان کی خامیوں کا ذکر ضروری ہے۔ ان کے بارے میں کوئی تبصرہ اتنا مستند نہیں ہے جتنا کہ سر ایچ ایم ایلیٹ (Elliot)(13) کا ہے اس کی نہایت جامع اور شاندار کتاب ''ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریئنز'' (ہندوستان کی تاریخ اس تاریخ نویسوں کی زبانی) ناگزیر ہے۔ ایلیٹ نے مشرقی تاریخ نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے گھریلو تاریخ کہا ہے۔ یہ رائے تمام مسلمان تاریخ لکھنے والوں پر سوائے ابن خلدون صادق آتی ہے۔ مشرقی مورخوں نے اپنے عہد کے سماج اس کی ساخت اور طبقاتی تقسیم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کو اس سے دلچسپی نہیں ہے کہ ادارے کیا ہیں اور کس طرح کام کرتے ہیں' تجارت' زراعت' مقامی پولیس اور عدلیہ کے کردار کو بھی انہوں نے نہیں چھوا ہے۔ عام آبادی کے حالات اور اعلیٰ ترین حاکم وقت کے ماتحتوں کا بھی ذکر انہوں نے فضول سمجھا۔ زیادہ تر مقامی تاریخ لکھنے والے بادشاہ کے مصاحب اور چاپلوس ہوا کرتے تھے یا وہ صرف شاہی دربار اور خاندان کی شان وشوکت اور ان کے معاملات کو قلمبند کرتے تھے۔ ان کو غریبوں کی زندگی' لوگوں کے مسائل اور کم تر خلقت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جاگیردارانہ سماج جس میں وہ زندگی کرتے تھے اس سماج کو سمجھنا ان کے بس کا کھیل نہیں تھا انہوں نے اقتصادی نظام کا کوئی جائزہ نہیں لیا۔ تمام تاریخیں جو اس زمانے سے پہلے لکھی گئیں جب سائنسی تحقیق کے تناظر میں تاریخ لکھنے کی ابتدا ہوئی اور عوام کے کلچر اور ان تہذیبی صورت حال کے تمام پہلوؤں کے پس منظر میں تاریخ مرتب کی جانے لگی تھی تو ان کے مقابلے میں بچوں کا کھیل نظر آتی ہیں۔ قرون وسطیٰ اور مغل زمانے

کے مقامی تاریخ میں ایسی خامیاں زیادہ نمایاں اور پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں حکمراں امرا اور شرفا ہی کی جے جے کار کی گئی ہے کیونکہ یہ طبقہ اپنے خلاف کسی قسم کی رائے کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ ان کی احمقانہ پالیسیوں' بیوقوفیوں اور خرمستیوں کی نشاندہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان کے لیے وہی تاریخی بیانئے پسند تھے جو ان کے مفادات کے عین مطابق ہوں اور ان کی انفرادی حیثیت قصیدہ خواں ہوں۔ سماجی تاریخ کا مطالعہ جدید زمانے کی دین ہے اور اس قسم کے مطالعہ کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب سنجیدہ مزاج اہل الرائے نے زمانہ قدیم کے کلاسیکی مورخوں سے ہٹ کر انسانیت کی نشو ونما میں اقتصادی صورت حالات اور محرکات کے تناظر کو ترجیح دی۔ اس قسم کے تاریخی مطالعے میں ہر قسم کے حقائق اور ان کی سند سے استفادہ کیا جاتا ہے اور ایسے مطالعے کے لیے فوجی اور طاقتور حکمراں کی مہمات کی عارضی کامیابیوں کی بہت کم اہمیت ہوتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے انگلستان میں جہاں کی جستجو بہت سی غیر عمومی اور اجنبی موضوعات پر ہوا کرتی تھی اقتصادی اور علاقائی تاریخ کی تفصیلات کو نظر انداز کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ جانسن کی انگلستان نامی کتاب میں اس نکتے کی وضاحت ہوئی (14) ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ ماضی کے زمانوں کی مکمل زندگی کی تصویر کشی کہ جس میں تمام مختلف پہلو آ جائیں بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ اب جسے سماجی تاریخ کہا جاتا ہے سیاسی تاریخ کے مقابلے میں آج کل زیادہ مقبول ہوگئی ہے۔ عموماً لوگ اپنے زمانے کی سیاست کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں اس لیے اسے پڑھتے بھی ہیں اور اس پر باتیں بھی کرتے ہیں جبکہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے وہ اتنی دلچسپ نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ونسنٹ اسمتھ' لین پول' سرکار اور مور لینڈ جیسے اہم سماجی مورخ بھی سترہویں اور اٹھارویں صدیوں کے ہندستان کی سماجی صورت حالات کو سمجھنے کے لیے اہم ہیں۔ ان مورخین نے گو کہ 1760-1690ء کے زمانہ سندھ کے سرسری حوالے ہی قلمبند کیے ہیں تاہم سندھ کی علاقائی اور سماجی تاریخ جو اس دور میں تھی اسے ان مستند تاریخ لکھنے والوں کے کام کا مطالعہ کیے بغیر سمجھنا ممکن نہیں مقامی تاریخ لکھنے والے اور تذکرہ نگار مجموعی طور پر نامکمل ہیں اور زیر کتاب کے لیے ان کے حوالے مفید نہیں ہوں گے۔ تاریخی مواد جو دستیاب ہے اور جس میں اول الذکر باہر کے مورخوں کی زیادہ اہمیت ہے ان کے مواد میں بھی بہت سی خالی جگہیں موجود ہیں جن کو تاریخی فیصلوں اور اصولوں کے ذریعہ تنقیدی استخراج کی مدد سے پر کرنا ہوگا۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ باہر کے لکھنے والوں کے یہاں بھی

1690-1760 ء کے سندھ کے بارے میں حقائق کے بیان کا فقدان ہے۔ میں نے ان خالی جگہوں کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے پاس باہر کے لکھنے والوں کی جو گواہیاں ہیں ان کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (الف) سترہویں اور اٹھارویں صدیوں کے سندھ سے متعلق یسٹ انڈیا کمپنی کا ریکارڈ جس میں 1662-1758 ء کا دور غائب ہے۔ (ب) ہندستان کے سندھ میں مغل سلطنت کے اواخر ڈیڑھ سو برسوں کے دوران سندھ کی یاترا کرنے والے یورپین کے مستند بیانئے' (ج) برطانیہ کے ساتھ سندھ کے الحاق کا سرکاری ریکارڈ جن معاصرین کی تحریروں کے حوالے موجود ہیں اور ان سیاحوں اور مطالعہ کرنے والوں کے جرنلز جنھوں نے 1800-1850 ء تک کے زندہ وفعال مغل انتظامی نظام کے باقیات کو سندھ میں دیکھا تھا۔ ان تمام مستند حوالوں کی مدد سے مقامی تحریروں کی خامیوں کی بہت کچھ تصحیح کی جا سکتی ہے۔

سندھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی 1636-1662 ء کے دوران اپنی ایک فیکٹری چلا رہی تھی۔ اس فیکٹری کو جو بند ہو گئی تھی دوبارہ 1758-1775 ء کے دوران چلایا گیا۔ ان دونوں فیکٹریوں کا ریکارڈ سندھ کی صورت حال کے صحیح منظر کی سند ہے۔ کمپنی جن بیوپاریوں کو بیوپار کے لیے مختلف حصوں میں بھیجا کرتی تھی ان کے زریعہ سندھ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ بہت سے سرکاری خطوط جو کمپنی سورت اور بعد میں ممبئ اپنے مرکزی دفتر کو بھیجتی تھی اس زمانے کے سندھ کے حالات سے پر ہوتے تھے۔ یہ مستند مواد کچھ تو ممبئ کے ریکارڈ آفس میں اور کچھ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔ آخر الذکر کر کے حوالے سے سر ولیم فاسٹر نے جو تحقیق کی ہے اس سے سترہویں صدی کی فیکٹری کے بارے میں بہت سے حقائق معلوم ہوئے ہیں۔ ممبئ گورنمنٹ ریکارڈ میں گو کہ جزوی کڑیاں غائب ہیں تاہم اس میں اتنا مواد ضرور موجود اور محفوظ ہے جس کی مدد سے تاریخ لکھنے والے اپنے مستند بیانئے کا خاکہ بنا سکتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کی فیکٹری سے متعلق ممبئ ریکارڈ آفس کا مواد زیادہ مکمل اور اہم حوالہ ہے جس کی مدد سے مغل سلطنت کے ٹھہراؤ کے دور میں سندھ کی خراب صورت حالات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کلہوڑا قبیلہ آزادی و خودمختاری کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جبکہ سکھ' پٹھان اور مرہٹے مغل سلطنت سے کچھ حصہ چھین کر اقتدار میں حصہ داری کے لیے برسرپیکار تھے۔ یہ بات البتہ بہت تکلیف دہ ہے کہ وہ دور جو شاہ عبداللطیف کی زندگی 1689-1752 ء سے تعلق رکھتا ہے' ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈ میں اس کا

کوئی ذکر ہی نہیں ہوا ہے گویا سندھ اس ریکارڈ سے غائب ہے۔ اس مواد کا مطالعہ کرتے ہوئے شاعر کی پیدائش سے پہلے کی نسلوں کے بارے میں مستند معلومات مل جاتی ہیں اسی طرح شاعر کی وفات کے بعد کی دہائی کے پارے میں مواد مل جاتا ہے مگر جس دور میں شاعر زندہ تھے اور اپنا کام کررہے تھے ممبئی آفس ریکارڈ اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا ہے۔ میں نے اس مواد کا مطالعہ کیا تو پورے دور کا صرف ایک واقعہ ہی میرے ہاتھ لگا۔(15) اسی قسم کی خلائیں یورپین یاتریوں کے مستند بیانیوں میں بھی ہیں۔ سترہویں صدی کے ختم تک جتنے بھی یورپی یاتری ہندستان آئے تھے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی گو کہ ان میں سے بعض مختصر مدت تک ٹھہرے تھے۔ سترہویں صدی کی چوتھی پانچویں اور چھٹی دہائیوں کے دوران یورپی سیاح زیادہ آئے تھے جنہوں نے اپنی آرا اور دوسری تفصیلات کو قلمبند کیا تھا۔ اسی صدی کے ختم پر دوبارہ کافی یورپی ہندستان آئے تھے۔ انہوں نے جو فیکٹریاں دیکھیں ان کے بارے میں اپنی آرا اور اپنے تاثرات کے ساتھ ساتھ ہندستانی عوام کی سماجی واقتصادی صورت حال کا بھی مطالعہ قلمبند کیا تھا۔ اس تحریری سرمائے میں بھی سندھ کے بارے معلومات محدود ہی ہیں تاہم سندھ کو پہلے کی طرح ان آنے والوں نے نظرانداز نہیں کیا۔ برنیئر' ٹاورنیر اور تیویناٹ (Bernier, Tavernier, Thevenot) نے سندھ کا سفر نہیں کیا تھا البتہ نکولس ودھنگٹن (N.Withington) 1616ء میں فادر مانریق (Manrique) 1640ء میں نکولس منوچی جو 1655ء میں بھکر کے محاصرے کے وقت توپ خانے سے وابستہ تھا اور کپتان الکزینڈر ہیملٹن (A. Hamilton) 1699ء میں سندھ آئے تھے نکولس ودھنگٹن 1616ء میں ایک غلط مہم کا شکار ہو گیا تھا۔ ان سب ہی نے صورت حالات کی ناقابل فراموش منظرکشی کی ہے۔ ان میں سے آخری چوتھا یعنی ہیملٹن اکیلا تھا جس نے سندھ کے حالات کا احاطہ شاہ لطیف کی زندگی ہی کے زمانے میں کیا تھا۔ سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں مغل سلطنت کے جو حالات تھے ان کا مواد مکمل ہے اور اس کے ذریعہ سندھ میں سلطنت کی ساخت جو سترہویں اور اٹھارویں صدیوں کے منتخب ادوار میں تھی اتنی مکمل ہے کہ ان خلاؤں کو بھرنا مشکل نہیں ہے جو 1758-1699ء کے دوران کے مجموعی دستیاب مواد میں پائی جاتی ہیں۔

سندھ کا 1843ء میں برطانیہ سے الحاق ہو گیا تھا۔ اور اس دور سے متعلق ہر قسم کا تحریری مواد وافر مقدار میں ملتا ہے۔ اس میں برطانوی فتح کے وقت سندھ کی جو سماجی حالت تھی واضح طور پر نظر

رائج ہوا جو دوسرے علاقوں میں رائج تھا۔ آئین اکبری سے اس نظام کے خاص خاص معاملات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سندھ پر اس کا اطلاق کس طرح کیا گیا تھا۔ مغل عمل داری سے نتھی ہو جانے کے بعد سندھ گورنمنٹ کی اکائی میں کس حد تک تھا اس کے بارے میں واضح معلومات کا فقدان ہے تاہم اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ سندھ ایک مربوط اکائی ہو گیا تھا البتہ یہ بات واضح ہے کہ کافی دنوں تک بالائی اور زیریں سندھ متحد نہیں ہو پائے تھے۔ اصل میں تالپوروں کی حکمرانی کے خاتم تک (1843) اس بات میں شک کی گنجائش ہے کہ سندھ پوری طرح متحد تھا یا نہیں تھا۔ امیران سندھ کی حکمرانی کا نقشہ اس طرح تھا کہ سرکار تین نمایاں شخصیات کے ہاتھ میں ہوتی تھی جن کے اقتدار کے علاقوں کی حدود الگ الگ ہوتی تھیں تاہم معاملات اس طرح چلائے جاتے تھے ان الگ الگ صاحبان اقتدار کے مابین بڑی قسم کی لڑائیاں نہیں ہوتی تھیں۔ امیران سندھ کے انتظامات کا یہ وہ خاص پہلو بھی تھا جس سے مورخین متاثر ہوئے۔ بہرحال یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ 1843ء کے اواخر تک (یعنی برطانیہ کی عمل داری کے بعد) بالائی اور زیریں سندھ کے درمیان اتحاد مکمل نہیں ہوا تھا۔ اکبر نے جب سندھ کو مغل عمل داری سے نتھی کیا تھا تو سندھ کو صدر ملتان کا حصہ بنا دیا گیا تھا اور دو علاقوں میں سرکار قائم کی گئی تھی اول شمال میں بکھر اور دوم انڈس ڈیلٹا کے مقام ٹھٹھہ میں۔ ان دونوں سرکاروں کو الگ الگ گورنر کنٹرول کرتے تھے۔ ان کے اختیارات کی حدود کے بارے میں کوئی واضح معلومات نہیں ملتی ہیں۔ پوری ایک صدی کے دوران ٹھٹھہ اور بھکر کے گورنروں کا تقرر پہلے ترخان حکمراں اور بعد میں مغل حکمراں کیا کرتے تھے۔ ان گورنروں کا تعلق جاگیردار خاندانوں سے ہوتا تھا جو انتظامیہ کو کنٹرول کرتے تھے۔ شاہ جہاں کے زمانے سے لے کر اٹھارویں صدی کی پہلی دہائی تک سندھ میں مغل اقتدار کو بروئے کار لانے والے وہ صاحبان اختیار ہوا کرتے تھے جو سلطنت کے دوسرے علاقوں سے سندھ بھیجے جایا کرتے تھے۔ شائد ہی اتفاق سے کوئی گورنر ہو جو سندھ کا مقامی ہو۔ کلہوڑا کی اہمیت یہ ہے کہ جب وہ طاقتور سیاسی قوت بن گئے تب اس رجحان میں بھی بدلاؤ آیا اور مقامی سندھ کے امرا گورنر مقرر کیے جانے لگے تھے۔ کلہوڑا درمیانی درجے کے جاگیردار تھے مگر دھیرے دھیرے اتنی طاقت پکڑ گئے کہ ان کو سرکاروں کا گورنر مقرر کیا جانے لگا ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب یہ گورنر بالائی اور زیریں سندھ پر چڑھ دوڑے اور ٹھٹھہ و بھکر کو مراکز بنا لیا۔ 1737 میں نادر شاہ کے حملے

نے ان کو موقع فراہم کر دیا اور انہوں نے آزاد و خود مختاری حاصل کر لی۔ یہ خود مختاری ابھی کچی تھی کیوں کہ دہلی کا بادشاہ اور اس کے صلاح کار بدترین سیاسی بحران میں پھنسے ہوئے تھے اور اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ دہلی سے دور سندھ کے معاملات پر توجہ دیں۔ رسمی طور پر آزادی و خود مختاری کے باوجود کلہوڑا خود کو مغل بادشاہ کے سامنے جواب دہ ضرور سمجھتے تھے۔ محصولات جمع کرنا' اس جمع میں سے دہلی کو اس کا حصہ بھیجتے رہنا اور امن و امان قائم رکھنا ان کی ذمہ داری تھی۔ 1760ء تک جب کلہوڑا حکمرانی قائم ہوئی تھی اور غلام شاہ کلہوڑا کو بادشاہ کہا جانے لگا تھا (ایسٹ انڈیا کمپنی کے خطوط میں بھی اس کے لیے لفظ بادشاہ ہی استعمال ہوا ہے) اقتدار کی خود مختاری کے خلاف مزاحمتی رجحان پایا جاتا تھا۔ زیریں سندھ میں اقتدار پر قبضے اور ایک حکمرانی قائم کرنے کے لیے کلہوڑا حکمراں اور جام کے درمیان ٹکراؤ ہوا۔ ان دونوں زیریں سندھ کے حکمراں سندھی قبیلہ سمہ کے سمو ہوا کرتے تھے۔ ترخان بعد میں آئے تھے اور آخر میں اکبر نے ان کو ختم کر دیا تھا۔

مغلوں کی یہ پالیسی رہی تھی کہ جو بھی فعال ادارے تھے ان ہی کے استعمال کو وہ آسان ذریعہ سمجھتے تھے اور مقامی وڈیرے سرداروں کو نچلی سطح کے اعلیٰ عہدے دیا کرتے تھے اور کسی حد تک ان کے نجی اختیارات کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ یہی اصل میں ایک صحیح راستہ بھی تھا جس پر چل کر جاگیردارانہ سماج کی برائیوں کے باوجود طاقتور منظم اور چاق و چوبند فوجیں خود کو فعال رکھ سکتی تھیں اور دور دراز علاقوں میں نظم و ضبط کا تحفظ کرتی تھیں۔ یہ نظام بہت جامع تھا۔ نچلے درجے کے بااختیار اپنے اوپر والے حکام کی وفاداری نبھاتے تھے اور سب مل کر شاہی گورنر کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے شاہی خزانے کے لیے محصولات جمع کرتے تھے۔ محصولات جمع کرنے کے لیے نظم و ضبط کا برقرار رکھنا ضروری تھا اور مغلوں کا یہ طریقہ کار تھا کہ وہ مقامی معاملات میں بہت زیادہ آزادی دیتے تھے بشرطیکہ مقامی عہدے دار امن و امان قائم رکھیں اور محصولات کا حصہ مہیا کرتے رہیں۔ اس نظام کی خامی یہ تھی کہ وہ مقامی حکام کی بدعنوانیوں کے لیے چیک اینڈ بیلنس کا اطلاق نہیں کرتے تھے اس طرح علاقوں کے گورنر سے لے کر نیچے تک جو زیادتیاں ہوتی تھیں ان پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ (16) اس خامی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مقامی سرکاروں اور شاہی مرکز کے درمیان محصولات کے حصے کی مانگ' مسئلے پر تنازعات رونما ہوتے تھے۔ سندھ پر مغل حکمرانی کا پورا دور اس قسم کے تنازعات کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ تجارتی مقاصد کے لیے جو انگریز بیوپاری سندھ

نے سندھ کو الگ رکھ کر ایک منفرد مسلمان ریاست کی شکل دینے کی واضح پالیسی وضع کر لی تھی چنانچہ باقی دنیا سے سندھ کے رابطے نہیں تھے۔ اس مسلم ریاست کی درون خانہ ساخت کا انکشاف اس وقت ہوا جب سندھ برطانوی عمل داری میں آ گیا تھا (1843) اس دور میں بہت ہی تلخ قسم کا جو تنازعہ رونما ہوا اس نے مقامی حکمرانوں کے دامن کو داغ دار کر دیا تھا جو برطانوی عمل داری سے پہلے راج پاٹ کر رہے تھے۔ اس بات کا تو فوری ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر وکٹورین دور کے مبصر صحیح نہیں تھے انہوں نے مبالغہ پر مبنی اپنی برتری اور ہر معاملے میں عقل کل ہونے کا تاثر دیا تھا۔ انہوں نے الحاق کو جائز قرار دینے کے لیے اپنے تہذیبی مشن کو جواز بنایا اصل میں دونوں کلہوڑا اور تالپور حکمرانوں نے مغل نظام ہی کو اس زمانے کیمطابق بہتر بنا کر رائج کیا تھا جو آبادی کی اکثریت کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا اور یوں صحیح تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس پر نہ ہی چارلس نیپئر اور نہ برٹن کی نظر گئی۔ ان دونوں اہل الرائے نے کلہوڑا اور تالپور حکمرانوں کی حماقتوں ان کے مظالم اور ان کی زیادتیوں کو مبالغہ کے ساتھ اچھالا ہے جن کا یہ حکمران بعض وجوہات کی بنا پر سد باب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو سر چارلس نیپئر کا سندھ، جس کا منظر ہم تمام باریکیوں کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں مختلف ضروری معاملات میں غلام شاہ کلہوڑا کے سندھ سے مطابقت رکھتا ہے جس کا زمانہ حکمرانی شاہ لطیف کی وفات تک قائم رہا تھا۔ غلام شاہ کلہوڑا کا سندھ بہت معمولی بہتری کے باوجود سندھ کے غیر ترقی پسند زمانے تک محدود تھا جو اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے سندھ سے مختلف نہیں تھا۔

اٹھارویں صدی کے نصف اول کا سندھ جب اقتدار مغلوں سے کلہوڑا کو منتقل ہوا

کلہوڑا حکمرانی کی واضح تفہیم کے لیے ہمیں ان تعلقات کو نظر میں رکھنا ہوگا جو ان کے مغل انتظامیہ سے تھے۔ آدھی صدی گزرنے کے بعد کلہوڑا حکمرانوں نے ان تعلقات سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ کیا حالات اور محرکات تھے کہ تالپوروں نے ان سے اقتدار ہتھیا لیا تھا۔ 1592ء میں جب اکبر نے سندھ کو فتح کیا تھا اور وسط ایشیا کے قبیلے ارغون کے ترخان مرزا جانی بیگ کو شکست دی تھی تو سندھ مغل عمل داری کا اٹوٹ انگ ہو گیا تھا۔ سندھ میں وہی مغل نظام

آتی ہے۔مگراس سے پہلے بھی سندھ میں مختلف قسم کے سرکاری سیاح آئے تھے 1799ء میں ناتھن کرو(Nathan Crowe) نے سندھ کا شخصی طور پر مطالعہ کرنے کے بعد کلہوڑا حکمرانی کی اعلیٰ تاریخ قلمبند کی تھی۔1809ء میں برطانوی مشن لے کر ہینکے اسمتھ حیدرآباد پہنچا تھا اس کے چار برس بعد افسران جیسے کہ کرنل پوٹنگر(Pottinger) اور لیفٹیننٹ ڈیل ہوسٹ (Del Hoste) نے سندھ کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے تھے۔1820ء میں ایک امریکی سیاح میسن(Masson) نے افغانستان' بلوچستان' اور سندھ کے سفر کی مہم کی کہانی لکھی تھی۔1828ء میں برنس(Burnes) امیران سندھ کے دربار میں پہنچا تھا۔اس نے حقائق کے تناظر میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے دوران بہت سے مطالعہ کرنے والوں نے سندھ کے حالات کی تفصیلات قلمبند کی تھیں۔ ان میں بعض بہت قیمتی ہیں جیسے کہ پوسٹانس(Postans) اور رائل نیوی کے افسران جن کو دریائے سندھ کا جائزہ لینے کے لیے رکھا گیا تھا۔چالیس کی دہائی میں افغانستان کے خلاف لڑائی کی وجہ سے سندھ سراپا خبرنامہ بن گیا تھا اور لاتعداد سیاح یہاں آئے تھے۔الحاق کے بعد آمت جاوت کی شرح میں اور بڑھوتری ہوگئی۔ اس دور کے حوالے سے برٹن(Burton) کی کتاب لاجواب ہے۔اس میں لمحہ بہ لمحہ اطلاعات ملتی ہیں۔ایسا باریک اور صحیح مطالعہ ایک ایسا ہی لکھاری کرسکتا ہے جس کے مزاج میں تجسس کی ایک خاص صلاحیت ہو اور زبان پر اسے پوری طرح دسترس حاصل ہو۔ان اہم ماخذ کی مدد سے مورخ دوسری تمام مشکلات پر قابو پاکر اٹھارویں صدی کے سندھ کی سماجی زندگی کا صحیح مطالعہ قلمبند کرسکتا ہے۔ان حوالوں سے اخذ کیے جانے والے نتائج حقیقت کا آئینہ دکھائیں گے۔اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ شاہجہاں کے زمانے سے لے کر سر چارلس نیپئر (Charles Napier) تک سرکار کے انتظامی نظام میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا تھا اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں کراچی' حیدرآباد' سکھر اور شکارپور جیسے بڑے شہروں کے بن جانے کے باوجود سندھ کی اقتصادی بنیادیں اپنی جگہ قائم تھیں۔ان بڑے شہروں نے ٹھٹھہ' نصرپور' روہڑی' سہون اور کنڈیارو کو دیوار سے لگا دیا تھا۔یہ شہر اور بعض دوسری جگہیں اقتصادی دھارے سے کٹ گئے تھے۔سماج میں مختلف طبقات کی سماجی صورت بھی اس انداز سے ٹھہراؤ کی حالت میں آ گئی تھی جو اسی صورت میں ممکن تھی جب سندھ باقی ہندستان سے کٹا ہوتا اور سندھ باقی ہندستان سے کٹا ہوا تھا۔کلہوڑا اور تالپور حکمرانوں

آئے تھے ان کی مشکلات کا سبب بھی مقامی حکام ہی کی پالیسیاں ثابت ہوئی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈ میں مفادات کے اس ٹکراؤ کا مکمل حال ملتا ہے۔ جن کے نتیجے میں بہت سے اقتصادی نقصانات کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔

مغل حکمرانوں اور ان کے انتظامی نظام کی کمزوریوں کا احاطہ ونسنٹ اسمتھ نے بڑی مہارت اور صحت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سرکار کا پورا ڈھانچہ فوج کے بل بوتے پر کھڑا ہوا تھا۔ بیشتر حکام جن کو فوجی عہدوں کا اعزاز نہیں حاصل تھا جیسے کہ سردار، اور قاضی وغیرہ وہ خالصتاً مذہبی پیشوائیت کے اور انتظامی وقانونی فرائض انجام دیتے تھے۔ منصب دار کا عہدہ بڑا ہوتا تھا اور ہر منصب دار کو سول اور انتظامی اختیارات وافر مقدار میں حاصل ہوتے تھے۔ کوئی بھی مقامی گورنر نہ تو قانونی ضوابط اور نہ طریقہ کار کا پابند ہوتا تھا۔ قرآن کے احکامات کو بروئے کار لانے میں بھی وہ بالکل آزاد ہوتا تھا۔ وہ اصل میں شاہی اشرافیہ کے طبقے کا نمائندہ ہوا کرتا تھا اور جو کچھ وہ چاہے کر سکتا تھا تاہم اسی وقت تک جب تک کہ اس کی کوئی شکایت مطلق العنان بادشاہ تک پہنچے۔ بادشاہ کسی بھی مقامی گورنر کو واپس بلا کر اسے سزا دینے کا بلاشرکت غیرے اختیار رکھتا تھا۔ (17) اسمتھ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مختصراً سرکار بہت سے نچلی سطح کے مطلق العنان مقامی چلاتے تھے اور ان کو کنٹرول کرنے کے لیے بالائی سطح پر اشرافیہ طبقہ ہوتا تھا جو کبھی قبلہ صحیح کرنے کے لیے ان کی نگرانی کرتا تھا۔ پوری انتظامیہ مکمل طور پر نجی اور بااختیار ہوتی تھی۔ مغل انتظامیہ کا کوئی بہتر اور دلکش تاثر محسوس نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی خامیوں کا جدید انتظامی ڈھانچے اس کی باشعور پبلک اور اعلیٰ خوبیوں کے تناظر میں جائزہ لینا صحیح نہیں ہے۔ ہندستان کے مخصوص ماحول میں جہاں وفاداریاں مشکوک ہوتی تھیں اور سلطنت کے تانے بانے مربوط نہیں تھے کوئی اور انتظامی نظام کا بروئے کار لانا بھی ممکن نہیں تھا۔ محصولات کی وصولیاں کے لیے بھی کوئی بہتر طریقہ کار کا امکان نہیں تھا کیونکہ بادشاہ اور اس کے دربار فضول خرچی کے عادی ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ ہر علاقے سے مال کو ان کو ملتا رہے خواہ وہ کیسے بھی وصول کیا جاتا ہو۔ پرتعیش معیار کے علاوہ فضول خرچی کے علاوہ ایک اور کھاتہ جنگوں کا تھا جو بادشاہ اپنے مخالفوں کے خلاف لڑا کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں جب سندھ کا مغل سلطنت سے الحاق ہو گیا تھا تو سندھ کی انتظامیہ بھی ان ہی خامیوں سے پر تھی جو ہر جگہ پائی جاتی تھیں۔

اٹھارویں صدی میں کلہوڑا اقتدار

مطلق العنان حکمرانی کی قوت کے طور پر کلہوڑا شاہی بہت دھیرے دھیرے نمایاں ہوئی۔ اس کا سقوط بھی اچانک کسی ڈرامائی انداز میں نہیں ہوا۔ ان کا مبہم اور بے ارادہ ابھار طالبعلموں کی سمجھ میں اس وقت آئے گا جب وہ مغل زمانے کی عمومی خصوصیات اور اس کے رجحانات کو ذہن میں رکھیں جن کی تفصیلات اوپر پیش ہو چکی ہیں۔ کلہوڑا شاہی کی ابتدا 1730ء سے ہوتی ہے تاہم 1730ء سے پچاس برس پہلے ہی سندھ کے معاملات کی حد تک ان کے خاندان نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ اسی طرح کلہوڑا شاہی 1778ء میں اچانک ڈھیر نہیں ہوئی تھی اور نہ میر بجار خاں تالپور نے ان کی سرکار کا تختہ الٹ کر تخت و تاج پر قبضہ کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں غلام نبی کلہوڑا کو شکست ہوئی تھی اور وہ مر گئے تھے۔ کلہوڑا شاہی اور اس کے کرتا دھرتا اٹھارویں صدی عیسوی تک زندہ اور فعال رہے اور گڑبڑ پیدا کرتے تھے جس کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ سندھ، قلات، کچھ، افغانستان، جودھپور اور بہاولپور کی سیاست پیچیدہ الجھی ہوئی اور مبہم تھی اور سیاسی بھونچالوں کے لیے ان کی فضا زرخیز تھی جس کے نتیجے میں عبدالنبی کلہوڑا کو بھاگنا پڑا تھا۔ اس کے منفی اثرات 1803ء ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تک تالپور خاندان نے اپنے اقتدار کو قائم کر کے پائیدار بنا لیا تھا۔ کلہوڑا شاہی زمانے کی کوئی مرتب اور موزوں تاریخ نہیں لکھی گئی۔ ان کے بارے میں بہترین 1799ء میں ناتھن کرو نے جو کہ انگریز تھا۔ اٹھارویں صدی کے خاتمے پر وہ سندھ میں تھا اور اپنے شخصی مشاہدات و تجربات کی وجہ سے سندھ کو جانتا تھا۔ اس کا بیانیہ ممبئی سرکار کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ 1843ء میں پوسٹنس نے سندھ پر لکھا تھا مگر اس نے بغیر اعتراف یا شکریہ ادا کیے کرو ہی کے بیشتر بیانات کو لکھ دیا۔ اس کی کتاب ''آبزرویشنز آف سندھ'' میں زیادہ مواد کرو سے مستعار ہے۔ اس کتاب کا مقصد کلہوڑا اقتدار کی تفصیلی تاریخ لکھنا نہیں تھا بلکہ 1760-1690ء کے دوران کلہوڑا اقتدار کے اہم رجحانات کی سندھ کی سماجی تاریخ کے تناظر میں نشاندہی کرنا تھا۔

کلہوڑا اقتدار کو پانچ مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا مرحلہ سندھ کے وہ کلہوڑا گورنر یا وائسرائے تھے جن کو مغل بادشاہ مقرر کرتے تھے۔ اس مرحلے کی ابتدا 1701ء میں ہوئی دوسرا وہ دور جب کلہوڑا گورنروں نے مقامی سطح پر اقتدار اور اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کو مستحکم کیا

یہاں تک کہ 1736ء میں دہلی کے بادشاہ نے ان کی جزوی آزادی اور خودمختاری کو تسلیم کرلیا۔ تیسرا 1739ء میں نادرشاہ کی یلغار کے بعد کا دور جب سندھ میں مغل اقتدار کو ایرانی سلطنت نے دبوچ لیا اور جس کے نتیجے میں کلہوڑا حکمراں ایران کے مطلق العنان شاہ کے ماتحت ہو گئے تھے اور اس کو محصولات ادا کرتے تھے' چوتھا تقریباً 1747ء کا زمانہ جب ایران سے سندھ کا اقتدار کابل کی پٹھان سلطنت کو منتقل ہوا جو احمد شاہ درانی کے کامیاب حملے اور اس کی فتح کا نتیجہ تھا وہ جدید افغانستان کا بانی تھا۔ اس دور میں کلہوڑا حکمراں کابل کے ماتحت ہو گئے تھے اور افغان حکمراں کو محصولات ادا کرتے تھے اور پانچوں مرحلہ جب 1778ء میں کلہوڑا اور تالپور قبیلوں کے درمیان کھینچا تانی شروع ہوئی جو صدی کے خاتمے تک جاری رہی۔ خانہ جنگی کے اس دور میں بلوچیوں کے تعاون سے جو بڑی تعداد میں سندھ کی سرزمین پر آباد ہو چکے تھے تالپور سرداروں نے سندھی حکمراں قبیلے کلہوڑا کے کس بل نکال کر ان کو تباہ کر دیا تھا۔ 1737ء سے لیکر بعد تک کلہوڑا کبھی اپنے اقتدار کے مالک نہیں بن سکے۔ ان کو سالانہ رقم ادا کرنے پر مجبور کیا گیا جبکہ انہوں نے جہاں تک ان سے ہو سکا اس مانگ کو پورا کرنے سے گریز کی کوشش کی۔ ان کو مقامی طور پر جو حمایت حاصل تھی اس کی وجہ سے وہ کسی حد تک اس ادائیگی سے خود کو بچاتے رہے انہیں یہ بھی سہولت حاصل تھی کہ سندھ میں باہر کی قوتوں کی مہم جوئی کبھی آسان نہیں ثابت ہوئی کیونکہ افغان اقتدار کا مرکز کابل تھا اور افغان سلطنت خود 1773ء میں احمد شاہ درانی کی موت کے بعد کمزور ہو گئی تھی جو کہ مشرقی اشرافیہ کا نمایاں رجحان رہا ہے۔ ان حالات میں کلہوڑا خاندان کی طرف سے تالپوروں کو ملنے والی رقم کی مقدار بھی کم ہوتی گئی بلکہ کافی رقم کلہوڑا خاندان پر ادھار ہو گئی۔ ان حالات میں ایک مستحکم اقتدار کا قیام ممکن نہیں ہو سکا۔ اسی زمانے میں انیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دوران انگریز سندھ میں پہنچ گئے تھے۔ وہ بیوپاریوں کی حیثیت سے سندھ میں آئے تھے اور ان کا مقصد بیرونی تجارت کے منافع تک محدود تھا۔ اس دور میں جب تالپور حکمراں تھے سندھ تمام حوالوں سے ایک خودمختار اور محدود مسلم ریاست ہو گیا تھا۔ اسی حالت میں چارلس نیپئر نے 1843ء میں سندھ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری سے منتھی کر دیا تھا۔ 1701ء سے بعد تک اگر سندھ کی پالیسی کا غور سے جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سندھ کو مغل' ایرانیوں اور پٹھانوں سے آزاد رکھا گیا اور ان قوتوں کو محصولات کی بہت کم ادائیگی کی گئی۔ سندھ کی زمین کا تحفظ کیا گیا اور

علاقہ کو بند رکھا گیا جس پر کوئی اور کسی قسم کی بیرونی قوت کو داخل ہونے سے ممانعت تھی۔ بہت مشکل ہی سے کوئی غیر ملکی سندھ پہنچ پاتا تھا۔ یہ حقائق وثوق کے ساتھ سندھ کے عجیب مزاج کی وضاحت کرتے ہیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی اگر چہ سندھ میں موجود تھی اور سترہویں واٹھارویں صدیوں میں اس کی فیکٹریاں قائم تھیں پھر بھی انیسویں صدی کی ابتدا کا سندھ یورپیوں کے لیے بالکل اجنبی تھا اور اس قدر اجنبی تھا کہ سندھ پر اس زمانے میں جتنا بھی لکھا گیا اسی تاثر کو پیش کرتا ہے۔ یہی مواد وسط انیسویں صدی میں دنیا کے لیے اہم حوالہ بھی تھا۔

کلہوڑا خاندان میں وہ صلاحیت اور ذہانت نہیں تھی جو حکمرانی کے لیے ضروری ہوتی ہے سوائے کہ انہوں نے علیحدگی اور اجنبیت کی پالیسی پر عمل کیا اور آب پاشی کی اہمیت کو محسوس کیا۔ کلہوڑا اصل میں مبہم قسم کے ایک سندھی قبیلے تعلق رکھتے تھے۔اس قبیلے کو اب جاموٹ کہا جاتا ہے(18) جو کہ وادی سندھ کے غیر بلوچ فرزندان زمین تھے۔ یہ بالائی سندھ کے ان علاقوں میں رہتے تھے جو اب لاڑکانہ اور سکھر کے علاقے ہیں۔سمہ خاندان کے زوال کے بعد کلہوڑا حکمران پہلی سندھی حکمرانی تھی جس نے مستقل طاقت یکجا کی تھی۔ سمہ حکمرانوں نے ٹھٹھہ کی بنیاد رکھی اور وسطیٰ ایشیا سے آنے والے ارغونوں اور ترخانوں سے پہلے دوسوتیں برسوں تک سندھ پر راج کیا تھا۔ان کا دور حکومت سندھ میں مقبول بھی ہوا تھا۔ان کا شمار مقدس بزرگوں میں ہوتا تھا اور یہی ان کی عمومی مقبولیت کی وجہ ثابت ہوئی تھی۔(19) وہ بزرگ درویشوں کی اولاد تھے اور زیریں سندھ کے مسلمان باسیوں میں بزرگ درویشوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا کلہوڑوں کے دور میں تین خانہ جنگیوں نے گڑبڑ پیدا کی تھی۔ پہلی خانہ جنگی 1754ء میں نور محمد کلہوڑا کی وفات کے بعد برپا ہوئی تھی دوسری 1775ء میں سرفراز خاں کلہوڑا کی معزولی کے بعد اور تیسری جب تالپوروں نے کلہوڑا خاندان کو شکست دی تھی۔سندھ میں تشویش ناک صورت حالات کے علاوہ باہر سے سندھ پر حملوں کا بھی خطرہ تھا۔کلہوڑا حکمراں چونکہ ایران اور افغانستان کے بادشاہوں کو طے شدہ رقم کی ادائیگی نہیں کرتے تھے اس لیے ان بیرونی ملکوں کے حملے کا خطرہ تھا۔لیفٹیننٹ جیمس نے چاندوکہ پرگنہ کی تفصیلات کے بیان میں صحیح لکھا ہے کہ چاندوکہ باقی ماندہ سندھ کی طرح کئی خونی لڑائیوں کا میدان رہا تھا۔ ہلی سلطنت کے کرتا دھرتاؤں کی فوجوں نے ہرے بھرے کھیتوں کو روندا تھا اور نہ جانے کتنے لوگوں کا خون بہایا تھا۔ابتدائی زمانوں میں آزادی کے تحفظ کے لیے جرات مندانہ

لڑائیاں ضرور ہوئیں مگران کے بعد تخت پر براجمان ہونے والے حکمرانوں نے اپنے راج پاٹ کا تحفظ تلوار کے زور پر کیا جس کی وجہ سے سندھ میں قتل و غارتگری اور ظلم و ستم کا بازار ہی گرم رہا۔ کلہوڑا اقتدار سے لیکر تالپوروں تک اور تالپوروں سے انگریزوں تک یہ بازار گرم رہا اور سندھ ریزہ ریزہ ہوتا چلا گیا۔ تالپوروں نے بڑی بے رحمی سے اپنے مخالفوں کو قتل کرنے کا بازار گرم کیا یہاں تک کہ انگریز وارد ہوئے اور انہوں بندوق کے زور سے سندھ میں فتنہ وتباہی پر قابو حاصل کیا اور پرامن فضا قائم کی۔ (20)

اللہ والے درویشوں کے خاندان کا سندھ کے علاقے میں راج پاٹ تک پہنچنے کا اتفاق ایک ایسا اتفاق ہے جس مشرقی تاریخ بہت مانوس رہی ہے۔ سمہ خاندان کی حکمرانی کے دور میں ایک فقیر میاں محمد مہدی سندھ آئے تھے (21) اور یہاں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے مذہبی گروہ کے بہت سے پیروکار بھی تھے۔ ان پیروکاروں میں ایک آدم شاہ کلہوڑا بھی تھے جنہوں نے اپنے زمانے 1558ء میں اپنی تعلیمات کی وجہ سے بہت نمایاں اعزاز حاصل کر لیا تھا اور لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کی شہرت جب بڑھی تو انہوں نے عام حالات میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور اپنے اثرات مرتب کیے۔ یہ اثرات اس حد تک بڑھے کہ انہوں نے اپنے قبیلے کے تعاون سے زمینوں پر قبضے کر لیے اور شاہی اقتدار کی مخالفت شروع کر دی یہاں تک کہ ملتان کے گورنر کا قہر ان پر نازل ہوا جس نے ان کے باغی ریوڑ کو ہرا کر ان کو قتل کروا دیا۔ اس سانحہ کی وجہ سے نہ صرف ان کی شہرت میں بڑھوتری ہوئی بلکہ لوگوں کی ان سے ہمدردی میں بھی اضافہ ہوا۔ ان کا مقبرہ سکھر کی ایک چٹانی پہاڑی پر واقع ہے۔ جہاں ان کے چاہنے والے اب بھی عقیدت و احترام کے ساتھ جاتے ہیں۔ پوسٹنس لکھتا ہے کہ آدم شاہ کے چیلوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور اس کی موت کے بعد آنے والی چھ نسلوں تک اس کی شہرت کا ڈنکا بجتا رہا جن میں سے تخت و تاج کے وارثان آتے رہے اور باری باری حکمراں ہوئے۔ انہوں نے اپنے چاہنے والوں چیلوں اور خدمت گاروں کی اتنی بڑی فوج بنالی تھی جن کی مدد سے وہ ہر قسم کے وسائل پر قابو حاصل کرتے رہے، طاقت کو بروئے کار لا کر اپنی حکمرانی کو منوایا اور سترہویں صدی کے اواخر میں مختلف وڈیروں کی زمینیں بھی ہتھیالیں۔ ان زیادتیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مخالف قوتوں نے مغل فوج سے مداخلت کی مانگ کی اور مغل فوجوں نے طاقتور اور پائیدار درویشوں کے گروہ کو ہرا دیا۔ ان کے نتیا دین محمد

کلہوڑا کو قید کر لیا اور کلہوڑا قبیلے کو قلات کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مذہبی درویشوں کے قبیلے کے حق اقتدار اور اس پر ان کے دعووں کو غلط نہیں کہا جا سکتا ہے۔ دین محمد کے بیٹے ناصر محمد نے اپنے آباؤ اجداد کا وراثتی حق حاصل کرنے کے لیے ملتان کے گورنر سے رجوع کیا' اس سے اپنے حکمراں پریوار کی غلطیوں کی معافی مانگی اور شاہی رحم اور معافی حاصل ہو جانے کے بعد واپس ہوا۔ اس وقت سترہویں صدی ختم ہونے کو تھی اور وہ زمانہ شروع ہو رہا تھا جو میری اس کتاب کا موضوع بھی ہے۔ ناصر محمد کلہوڑا کا بیٹا یار محمد کلہوڑا اصل میں کلہوڑا شاہی اقتدار کا بانی تھا۔ 1701ء میں اس نے شکار پور کو داؤد پوتروں سے چھین لیا تھا جو کہ جلاہوں یعنی دھاگا بننے والوں کا قبیلہ تھا۔ داؤد پوتروں نے 1616ء میں شکار پور شہر کی بنا استوار کی تھی۔ انہوں نے بالائی سندھ کے ایک طاقتور قبیلے مہروں سے لڑائی کی تھی جو اب بھی بہاولپور کے حکمراں خاندانوں میں ملتے ہیں۔ یار محمد نے شکار پور کو اپنا مرکز بنایا اور اورنگ زیب سے دریائے سندھ اور نارا کے درمیان کی زمین حاصل کرنے کا پروانہ وصول کیا۔ اس پروانے کے ذریعہ مغل شہنشاہ نے اسے یہ بھی حق دیا کہ وہ خود کو خدایار خاں کہلوائے۔ وہ اپنے اقتدار کی مختصر سی حد اور لقب سے مطمئن نہیں ہوا چنانچہ 1711ء کے لگ بھگ وہ کنڈیارو اور لاڑکانہ کے علاقوں پر چڑھ دوڑا اور سکھر کے اطراف کا بھی کچھ علاقہ ہتھیا لیا۔ اب اس کے پاس اختیار اور حدود کی اتنی طاقت تھی کہ اسے سندھ کی نمایاں طاقت کہا گیا۔ 1719ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نور محمد کلہوڑا گدی نشین ہوا جس نے داؤد پوتروں کو ہرا کر ان کے ملک شکار پور کو اپنی عمل داری سے منتقی کیا۔ ابتدائی مرحلے میں سلطان محمد شاہ کی وفاداری کا بھرم رکھنے کے لیے جس نے اس کے باپ کی طرح اسے بھی خدایار خاں کا لقب اور 1719ء (22) میں سہون کا صوبہ عطا کیا تھا احتیاط کا دامن تھامے رکھا۔ اسی زمانے میں قلات کے والی میر عبداللہ خاں نے جو براہوی تھا کلہوڑا اقتدار پر حملہ کر دیا تھا۔ اس لڑائی میں اسے ہار ہی نہیں ہوئی بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اس کی طاقت میں اور بڑھوتری ہوئی یہاں تک کہ جب ٹھٹھہ کی گورنری کا منصب خالی ہوا اور جیسا کہ مغل حکمرانوں کی روایت رہی تھی کہ وہ دور دراز علاقوں میں خالی ہونے والی جگہوں کو پر کرنے کے لیے اسی علاقے کے کسی با اعتماد طاقتور سردار یا وڈیرے کا چناؤ کرتے تھے ٹھٹھہ کی گورنری نور محمد کلہوڑا کو مل گئی۔ اب وہ غیر اعلانیہ طور پر زیریں اور بالائی سندھ کا حکمراں ہو گیا تھا۔ مشرق کے ریگستان سے لے کر

مغرب کے پہاڑی علاقوں تک اس کے حدود میں ہو گئے تھے۔ 1739ء میں جب نادر شاہ نے سندھ کو روندا تو صورت حال کا حلیہ ہی بگڑ گیا۔ اس حملے اور اس کی تباہی کے بعد نور محمد کے ذہن سے دہلی کے بادشاہ کا خوف نکل گیا۔ (23)

نور محمد نے نادر شاہ کے خلاف اپنے ہاتھ پیر کھولنے کی جرات ضرور کی مگر نادر شاہی قہر سے بچنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا چنانچہ جب ہندستان سے ایران کے لیے چلا تو سندھ کو روند ڈالا' نور محمد کو پکڑ کر عمر کوٹ کے قلعے میں بند کر دیا اور اسے ہتھیار ڈالنے اور سر تسلیم خم کرنے کا حکم دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا اس نے سر تسلیم خم کیا اپنی غلطیوں کی معافی مانگی اور افغان سردار نے اسے اس شرط پر معاف کر دیا کہ وہ بیس لاکھ روپے بطور تاوان ادا کرے گا۔ اس ادائیگی کو یقینی بنانے کے لیے وہ کلہوڑا حکمراں کے تین بیٹوں مراد خاں' اتر خاں اور غلام شاہ خاں کو پکڑ کر اپنے ساتھ یرغمال بنا کر لے گیا جہاں وہ کئی برس تک رہے تھے۔ (24) 1747ء میں نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا اور یہ تینوں بیٹے جو ایرانی دربار میں یرغمال تھے چھوڑ دیئے گئے اور واپس سندھ آ گئے۔ اتنے عبرتناک سانحے کے باوجود نور محمد شاہ نے کوئی سبق نہیں لیا اور جب نادر شاہ کی گدی احمد شاہ درانی نے سنبھالی اور دہلی لوٹی تو نور محمد نے پھر تاوان کی رقم ادا کرنے سے گریز کیا۔ 1754ء میں تاوان کی رقم حاصل کرنے کے لیے احمد شاہ نے سندھ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور سیوستان کا گھیراؤ کر کے وہاں اپنے خیمے گاڑ دیئے۔ نور محمد ڈر کی وجہ سے مشرق کی طرف ریگستان میں بھاگ گیا اور وہیں مر گیا۔ اس کے نتیجے میں متوفی کلہوڑا کے تینوں بیٹوں کو افغان سردار سے لڑائی کا سامنا کرنا پڑا اور سندھ خانہ جنگی کی حالت میں آ گیا۔ اس خانہ جنگی کی تفصیلات کا بیان غیر ضروری ہے سوائے اس کے کہ 1758-1756ء کے دوران سندھ نراجیت اور تباہی میں مبتلا رہا اور اس وقت تک کوئی بدلاؤ نہیں آیا جب تک 1758ء میں غلام شاہ کلہوڑا بطور فاتح منظر پر ابھرا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سندھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی دوبارہ اپنی فیکٹری بنانے کے لیے کام کر رہی تھی۔ 58-1854ء کے دوران سندھ کی پیچیدہ صورت حال خواہ عجیب کیوں نہ ہو مگر سندھ سے باہر ہندستان میں جو صورت حال تھی اس سے خاص مختلف تھی۔ اقتدار کی کشمکش کا خاتمہ غلام شاہ کلہوڑا کی حکمرانی کے ساتھ ہوا تھا۔ کمپنی کے خطوط میں اس کے لیے پرنس کا لقب استعمال ہوا ہے۔ تاہم وہ احمد شاہ کی خود مختاری کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر بہر حال مجبور ہوا اور کابل کو سالانہ رقم ادا کرنے کی شرط مانی۔ کلہوڑا

خاندانوں کی بدقسمت نسلوں کو صرف اپنوں ہی سے نہیں لڑنا پڑا بلکہ پٹھانوں' قلات' کچھ گھرالو سردار کے ساتھ بھی سیاسی دنگل کھیلنا پڑا۔ گھرالو غالباً زیریں سندھ کے انڈس ڈیلٹا کے سمہ تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح ایک چھوتے سے علاقے پر اپنی حکمرانی قائم کر لی تھی۔ سندھ کی گدی سنبھالنے کے بعد جب اقتدار مستحکم ہو گیا تھا کلہوڑا خاندان کا سب سے باصلاحیت غلام شاہ کلہوڑا نے سندھ کی بدامنی پر قابو پانے میں کوئی قابل ذکر دلچسپی نہیں لی۔ (25) 1771ء میں اس کا دیہانت ہو گیا اور اس کا بڑا بیٹا سرفراز خاں گدی پر براجمان ہوا۔ وہ کم نظر' بے رحم اور نااہل ظالم ثابت ہوا اور اس کے باپ نے اپنے دور حکومت میں جو اچھے کام کیے تھے چند ہی برسوں کے اندر اسے بھی ملیامیٹ کر دیا تھا۔ اسی کے حکم سے 1775ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی فیکٹری بند کرنا پڑی تھی۔ میر بہرام خاں تالپور کو قتل کروانے کی احمقانہ حرکت کا بھی اسی نے ارتکاب کیا تھا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو حالات تھے ان کے تناظر میں عوام کا اس پر اعتماد اٹھ گیا اور آخر میں تالپوروں نے کلہوڑا حکمرانی کا تختہ الٹ پھینکا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ میں بلوچی فوجی طاقت بن چکے تھے پہلے زمانے کے کلہوڑا حکمرانوں نے سندھ میں بلوچیوں کے آباد ہونے کے رجحان کی ہمت افزائی کی تھی تاکہ لڑائی کے میدان میں ان کی برتر فوجی حیثیت کا فائدہ اٹھائیں۔ بہرام کے قتل کی وجہ سے سندھ کے دربار میں خصوصی اختیارات رکھنے والے تالپور بلوچی قبیلے بگڑ گئے تھے اور ان ہی کی ایما پر بدعنوانیوں اور بدانتظامی کے الزام میں سرفراز خاں کو ہٹایا گیا تھا۔ اس کی معزولی کے بعد خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی کے دوران یکے بعد دیگرے میر محمد خاں' غلام شاہ اور غلام نبی کلہوڑا گدی نشین ہوتے رہے مگر یہ تینوں بالکل نااہل ثابت ہوئے۔ دوسری خانہ جنگی اور بعد میں تالپوروں کی حکمرانی کے ابھرنے سے اس کتاب کے موضوع کے حوالے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے البتہ اتنا بتانا ضروری ہے کہ بدامنی کا یہ عرصہ 1778ء سے 1800ء تک قائم رہا تھا۔ جب بعد میں تالپوروں نے صورت حال پر قابو پالیا تو بحران کا یہ زمانہ ختم ہوا۔

کلہوڑا حکمرانی کا پورا منظر نامہ افسوسناک واقعات سے بھرا ہوا تھا۔ سندھ کی آبادی کے عوام الناس کے لیے یہ بدقسمتی تھی کہ ان کے اپنے لوگوں کی حکمرانی جس نے اصل تحریک اپنے مذہب پرست عوام سے مذہب کے نام پر حاصل کی تھی مغل حکمرانوں کی جگہ تو ضرور حاصل کر لی تھی مگر ان کے مقابلے میں کلہوڑا حکمرانی کی کارکردگی مایوس کن ہی رہی ان کے بعد گدی نشین ہونے

والے تالپوروں نے مذہب کوحوالہ بنا کرعوام کو مطمئن نہیں کیا کیونکہ ان میں مذہبی حوالے سے کوئی درویشانہ مزاج نہیں تھا اور نہ اس رجحان سے ان کو کوئی لگاؤ تھا اور نہ ہی انہوں نے کلہوڑا خاندان کی طرح اپنے طویل اقتدار کے دعوے کیے تھے۔کلہوڑا حکمرانوں نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد سندھ کے اپنے ماتحتوں یعنی رعایا پر یہ تاثر تھوپا تھا کہ آدم شاہ کا خاندانی سلسلہ پیغمبر اسلام کے چچا حضرت عباس سے ملتا ہے۔اس دعوے کی کوئی واقعی بنیاد تھی یا نہیں اس کی کوئی سند انہوں نے پیش نہیں کی تھی۔تالپور بالکل سادہ صاف اور کھرے تھے یہ اور بات ہے کہ اواخر وکٹورین دور کے برطانوی سیاست دانوں نے ان کا سواگت نہیں کیا اور برطانوی عوام بھی ان سے متاثر نہ ہو سکے تاہم یقیناً انہوں نے بحران زدہ سندھ میں چالیس برسوں تک امن وشانتی قائم رکھی اور جو بھی انتظامیہ انہوں نے بنائی تھی اپنی حدود میں وہ نہ تو نااہل تھی اور نہ اس کا مقابلہ ماضی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کلہوڑا اور تالپور حکمرانوں میں ایک قدر مشترک تھی کہ دونوں حکمرانوں نے ڈیڑھ سو برسوں تک سندھ کے دروازے باہر سے آنے والوں پر بند رکھے تھے۔ 1843ء چارلس نیپئر نے دیکھا کہ سندھ میں مغل طرز کی انتظامیہ ہی قائم تھی اور اس پر ایسی تہذیب ورواداری کے اثرات مرتب نہیں ہوئے تھے جو ہندستان کے دوسرے حصوں میں ایک صدی سے فعال تھے جس کی وجہ سے لوگوں کی سوچ میں بھی بدلاؤ آ گیا تھا اور ان کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ لوگوں کا اعتماد اور ان کی وفاداریاں حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ کو کیسا ہونا چاہیے۔سندھ میں پہلے پہل تالپوروں کی آمدآمد کا بیان برٹن نے قلمبند کیا تھا۔

حوالہ جات

1- یہ کہنا صحیح نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے ہندستان پر مکمل حکمرانی کی کوئی متعین پالیسی نہیں تھی' 1688ء میں چائلڈ کی تحریک پر ایک قرارداد میں کہا گیا تھا کہ کمپنی کو اپنی تجارتی بالادستی کے دفاع کے لیے علاقائی خودمختاری پر یقین رکھنا چاہیے تاکہ دوسری صدی میں ہندستان کا الحاق ممکن ہو جائے۔البرٹ' گورنمنٹ آف انڈیا ص24۔ کمپنی آمدنیہ میں جو بڑھوتری پیدا کر رہی تھی ہمیں اس کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے جس کے نتیجے میں ہم ہندستان میں قوم کا درجہ حاصل کریں گے۔ایضاً ص 27۔ڈائیرکٹرز کے مطابق ایک وسیع برطانوی

ڈومینین کی بنا استوار کرنا جو مضبوط اور مستقل ہو کمپنی کا مقصد تھا۔ میریٹ (Marriott) دی انگلش ان انڈیا۔ ص 62-64

2- ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی کامیابیوں کا سبب ان کی فوج تھی جس میں تنخواہ دار مقامی سپاہی بھی شامل تھے ان کا مسئلہ معاوضہ تھا کسی کی وفاداری ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس زمانے کی ہندستانی فوج ایسے گروہوں کا مال اینٹھنے والا مجموعہ تھی جن کو مختلف کمپنیوں کے کپتان بھرتی کر لیتے تھے۔ وہ اپنے خیال میں ایسے سرداروں کا چناؤ کرتے تھے جو ان کے لیے مفید ثابت ہوں۔ وہ آزاد اور چھڑے تلوار بازوں کو جمع کر لیتے تھے جن میں بیشتر ایشیائی علاقوں کے ہندستانی آبادکار تھے اور جو ہندستان کے لیے بھی خطرہ تھے۔ سر الفریڈ لائل۔ ہسٹری آف انڈیا۔ جلد 7 ص 170۔

ریکارڈ کے مطابق بہت سے پیدل فوجی مل جاتے تھے یہاں تک کہ صرف چھ ہفتوں کی نوٹس پر ہندستان کی بہترین افغان تاتار' ایرانی اور مرہٹہ لڑاکا بھی آ جاتے تھے۔ ان میں کثرت ان لوگوں کی ہوتی تھی جو دشمن کی صفوں سے باہر نکال دیئے گئے ہوں۔ ایضاً ص 87۔

3- ایس۔ لین پول۔ اورنگ زیب' ص۔ 204۔ اس نے جو افسوس ناک بیان قلمبند کیے تھے ان میں لکھا تھا کہ میرا سارا وقت کسی فائدے کے بغیر گزر گیا۔ میرے اندر خدا موجود تھا مگر پھر بھی میری نظروں پر پتھر پڑ گئے تھے اور میں روشنی نہیں دیکھ سکا تھا۔ امید آنی جانی کیفیت ہوتی ہے اور اچھے دن دوبارہ لوٹ کر نہیں آتے ہیں۔ میں دنیا میں صاف اور معصوم پیدا ہوا تھا مگر جاتے ہوئے اپنے کندھوں پر گناہوں کا بوجھ لاد کر جاؤں گا۔ ایس۔ لین۔ پول۔ انڈیا انڈر محمڈن رول۔ ص 408۔

4- لائل ہسٹری آف انڈیا۔ جلد 8 ص 78۔

5- موہن جو داڑو اور چنڈ ڈیرو کے آثار قدیمہ۔ الور کے علاقے' برہمن آباد کوئی اتفاقاً ملنے والا اسٹوپا' ٹھٹھہ کے آثار قدیمہ کے تباہ اور گلتے سڑتے نمونے اور صدیوں کی پرانی عمارتوں کا متبادل نہیں ہو سکتی ہیں جو ہندستان کے دوسرے علاقوں میں ہیں۔

6- برٹن (رچرڈ برٹن) ہسٹری آف سندھ باب ایک کا نوٹ 16 ص 377۔

7- گولڈ اسمتھ ہسٹاریکل میمائیر آن شکار پور۔ص 5۔ ممبئی گورنمنٹ ریکارڈ نیو سیریز نمبر 17۔

8- دونوں حیدر آباد اور کراچی اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف کی پیداوار ہیں۔ شکار پور کی بنا 1616ء میں داؤد پوتڑوں نے استوار کی تھی۔ اٹھارویں صدی کے اواخر تک شکار پور کی کوئی حیثیت نہیں تھی البتہ جب شکار پور کے ہندو بیوپاریوں نے افغانستان کے راستے سے وسطی ایشیائی تجارت میں کامیابی حاصل کی تو اس کی اہمیت ہوئی۔ اس سے پہلے وہ دریا کے کنارے کا ایک دیہات تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اہم تو دریائے کے دوسرے طرف روہڑی تھا۔

9- میکے۔ دی انڈس سولائیزیشن۔ص 7۔

10- تازہ دریافتوں سے پتہ چلا ہے کہ موہن جوداڑ و تہذیب کے آثار وادی گنگا میں بھی پائے گئے ہیں۔

11- مورلینڈ۔ فرام اکبر ٹو اورنگ زیب۔ص۔ 323-322۔ ضمیمہ سی مغل آمدنی کے اعدد وشمار۔

12- گولڈ اسمتھ۔ لائف آف آوٹ رم۔ جلد اول' ص 331۔

13- ایلیٹ۔ اصل دیباچہ۔ص۔ 20-19۔

14- جانسن انگلینڈ۔ دیباچہ' ص۔ 411۔

15- ایس۔ آئی۔ ایل۔ بی۔ نمبر 4 سال 44-1743ء' ص 191۔

16- دیکھئے رے (Ray) ڈائی نسٹک ہسٹری آف ناردرن انڈیا۔

17- اکبر دی گریٹ مغل۔ص۔ 69-368۔

18- میر محمد کلہوڑا نے پنہور قبیلے کو شکست دی تھی۔ یہ فتح بہت آسانی سے حاصل ہوئی۔ انہوں نے بہت عام سے ہتھیار سے فتح حاصل کی تھی۔ میر محمد نے اس کامیابی کے بعد اپنے حامیوں اور پیروکاروں کو ہدایت کی مرنے کے بعد ان کے مزار پر ان ہتھیاروں کو نصب کر دیا جائے جو ان کی کامیابی کی یادگار رہو۔ خدا آباد میں ان کے مزار کے سامنے یہ ہتھیار اب بھی نصب ہیں۔ رپورٹ کپتان پریڈی۔ ممبئی گورنمنٹ ریکارڈ نمبر 17 نیو سریز ص 671ء۔

19- پرگنہ چانڈوکا پر لیفٹیننٹ جیمس کی رپورٹ 1847ء ممبئی گورنمنٹ ریکارڈ ایضاً ص

709-74۔

20- گولڈاسمتھ نے اپنے بیان میں اسے جام پور کا شیعہ سید لکھا ہے۔ ہسٹاریکل میمائیرز آف شکار پور۔ص 22۔ ممبئ گورنمنٹ ریکارڈ 17 نیو سیریز سے انتخاب۔

21- دیکھیے امپیریل گزیٹیر آف سندھ۔

22- ہندستان پر یلغار اور نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی کی تباہی کے دور میں سندھ ملتان سے منتھی تھا اور صوبہ ملتان کا اٹوٹ انگ بنا ہوا تھا۔ سلطنت دہلی کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد وہ حصہ جس کو مغلائی کہا جاتا تھا اور جو سکھر، بھکر، شکار پور اور اسکے ماتحت علاقوں پر مشتمل تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے جس کا پایہ تخت کابل تھا درانی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ سندھ میں افغان علاقہ شمال مشرق میں کاشمور تک دراز تھا جو روجہاں کے شمال میں ملتان کی سیما پر واقع تھا۔ اس کا دوسرا سرا ریگستان اور مندجی کے جنوب میں دریائے لاڑکانہ تک پھیلا ہوا تھا۔ میجر گولڈنی کی رپورٹ۔ ممبئ گورنمنٹ ریکارڈ نمبر 17 نیو سیریز ص688۔

23- گولڈاسمتھ نے اس واقعہ کا ذرا مختلف منظر دکھایا ہے۔ ہسٹاریکل میمائیز آف شکار پور۔ص 17-18۔

24- گو کہ اس اصل کارنامے کوئی خاص نہیں تھے پھر بھی سیوستان کے کھوسوں اور بہادر خاں کے علاقے بہاولپور پر اس نے قابو حاصل کیا تھا۔ کچھ کے خلاف ایک مہم بھیجی تھی۔ 1764ء میں حیدر آباد کی بنا استوار کی تھی اور اپنے ہی ایک محسن دوست اور مدد کرنے والے کو کھرالو کے جام حاجی پر حملہ کیا تھا۔

❁

سندھ میں ولندیزی تجارت۔ تاریخی پس منظر

مظہر یوسف/ ظہور چوہدری

(یہ مضمون ولیم فلور کی کتاب The Dutch East Indian Company and Diewel Sind. In the 17th and 18th Centuries پر بطور تعارف لکھا گیا ہے)

ولندیز' بلاشبہ جنوبی ایشیا کے ساتھ تجارت کے بانیوں میں ہیں جو سیلون (سری لنکا) اور بٹاویہ (انڈونیشیا) جیسے دور دراز ملکوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ لیکن تمام یورپی ممالک میں پرتگال واقعتاً پہلا ملک تھا جس نے ہندوستان کی مرکزی سرزمین اور اس کی ساحلی پٹی' دونوں پر اپنی موجودگی کا احساس اس طرح دلایا کہ پرتگالی باشندے یہاں پر پادری' تاجر اور بحری قزاقوں کی صورت میں موجود تھے۔

رومیلا تھاپر کے بقول' بھارت کے ساتھ مغربی تعلق 1498ء میں واسکوڈے گاما کے کامیاب بحری سفر سے شروع ہوا جب پرتگالی پہلے پہل ہندوستان کے مغربی ساحل پر نمودار ہوئے۔ یہ واضح تھا کہ اس وقت وہ چھوٹی کالونیاں بنانے کی غرض سے تجارتی مراکز کی تلاش میں تھے اور اس کی خاطر لڑنے مرنے کو بھی تیار رہتے تھے حالانکہ ان سے پہلے ابتدائی عربوں نے یہاں محض آباد ہونے کی خواہش کی تھی۔

البوقیرقے گوا پر 1510ء میں قبضہ کیا اس کے بعد جلد ہی فرانسس زاویئر پہلے عیسائی پادری کی حیثیت سے ہندوستان پہنچا اور یوں خاص طور سے' ہندوستان کے مغربی ساحل پر عیسائیت اختیار کرنے کے ایک باقاعدہ طریقہ کار کا آغاز ہوا۔ ان پادریوں نے مغلِ اعظم اکبر سے آگرہ

کے نزدیک، فتح پور سیکری میں ملاقات کی اور اسے مہربان پایا۔ اکبر کٹر مذہبی عقائد سے بہت دور تھا اسنے نہ صرف ایک راجپوت خاتون جودھابائی سے شادی کی تھی بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک عیسائی عورت سے بھی بیاہ رچایا تھا۔ انہی دنوں ایک عیسائی امیر مرزا ذوالقرنین نے حکومت میں ایک بلند مرتبہ حاصل کیا اور سانبھر کا فوجدار بنا بعد میں لاہور کا گورنر مقرر ہوا۔

ہندوستان کے دیگر حصوں اور سندھ میں بھی پرتگالی، مغربی ساحلوں پر اچھے خاصے متحرک تھے۔ 1513ء تک پرتگالی اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ وہ لاہری کی بندرگاہ کے لیے خطرہ بنے رہے جس کی بنا پر سندھ کے اس وقت کے ''سمہ حکمران'' اندرون سندھ تک محدود ہو گئے تھے۔ پرتگالیوں نے غالباً اس وقت تک سندھی حکمرانوں کی مرضی یا بغیر مرضی کے لاہری میں ایک فیکٹری بھی قائم کر لی تھی۔ یہ فرض کرنا بھی بعید از قیاس نہ ہوگا کہ انہوں نے فیکٹری کے قیام کے لیے طاقت کا استعمال کیا ہوگا جیسا کہ وہ ہندوستان میں ہر جگہ کر رہے تھے۔

جان کوریز آفنسو Jesuit Letters of Indian History میں لکھتے ہیں کہ 17 ویں صدی اس پہلودار جدوجہد کا منظر پیش کرتی ہے کہ جو عظیم مغلوں، چھوٹے ہندوستانی رجواڑوں، پرتگالیوں، ولندیزیوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر مرہٹوں نے یہاں پرتگالیوں کے زوال میں ایک کردار ادا کیا تھا تو بلاشبہ ولندیزیوں نے اس گڑبڑ کا فائدہ اٹھایا اور وہ سمندر کے حکمران بن گئے۔ فیرولی نے بھی ہمعصر Jesuit Letters (1602-33) میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کیسے ولندیزیوں نے ہندوستان اور سری لنکا میں کامیابیاں حاصل کیں اس تحریر سے ولندیزیوں کی نوآبادیاتی طاقت کے عروج کی گہرائی سے مطالعہ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

سندھ کے ساحل کے ساتھ پرتگالی اور ولندیزی تعلق پر جہاں پاکستان کے سرکاری ریکارڈ میں بہت کم دستاویزی معلومات ملتی ہیں وہاں پر 16 ویں، 17 ویں اور 18 ویں صدی میں ہندوستان (بشمول سندھ) کے متعلق ہالینڈ، فرانس، پرتگال اور انگلستان میں دستاویزات کے خزانے موجود ہیں۔ ہندوستانی ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کی اشاعتی کمیٹی نے ان ممالک سے گزارش کی تھی کہ ایسے تمام ریکارڈ کی مائیکروفلمیں مہیا کی جائیں۔ چنانچہ ہندوستان کے قومی دستاویزات کے دفتر نے کئی دستاویزات (بالخصوص ہندوستانی تجارت اور جہازرانی کے موضوعات پر) کی

مائیکروفلمیں حاصل کر لی تھیں اور ان کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔

پرتگالی طاقتوں نے 1555ء میں ٹھٹھہ پر قبضہ کیا تھا اور گمان اغلب ہے کہ انہوں نے لاہری کی بندرگاہ سے ہی کوچ کیا ہوگا جس کو ہیگ نے غلطی سے ''بینڈل'' لکھا ہے۔اس کا معنی دراصل ''بندر'' یا ''بندرگاہ'' ہے۔البوقیرق نے گوا کو ہندوستان میں پرتگالیوں کا مرکز بنا کر پرتگالی غلبے کو سارے ایشیائی سواحل پر خلیج فارس میں ہرمز سے مالاکا اور باطاقہ تک پھیلا دیا۔انہوں نے ساحل پر واقع ہندوستانی علاقوں پر قبضہ کیا اور تجارت پر اپنی بالادستی جاری رکھنے کے لیے مستقل لڑائیاں چھیڑیں اور طاقت کا ہر ممکن استعمال کیا۔

قریباً ایک صدی تک پرتگال کو ازحد منافع بخش مشرقی تجارتی پر مکمل بالادستی حاصل رہی اور 15 ویں اور 16 ویں صدی کے پہلے نصف میں وہ اپنے بڑے حریفوں یعنی انگریزوں اور ولندیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئے البتہ 16 ویں صدی کے دوسرے نصف میں' ولندیزیوں' انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ان کی اس بالادستی میں آہستہ آہستہ نقب لگانا شروع کر دی تھی۔

اسی اثناء میں پرتگال' سپین کا مرہون منت بن گیا۔یہ ذکر 1580ء کا ہے اور دونوں ممالک یکجا ہو گئے۔سپین نے ولندیزی مزاحمت کے باوجود' ہالینڈ پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔سپین اور پرتگال کے مابین ''پوپ'' کی کھینچی ہوئی حد فاصل کی بنا پر سپین میں میکسیکو کی چاندی اور پرتگال میں ہندوستانی سونا اور انڈونیشیائی گرم مصالح' پہنچنا شروع ہو گئے تھے البتہ 1588ء میں انگلستان نے اسپینی آرمیڈا کو شکست دی۔اس طرح انگریزی اور ولندیزی تاجروں کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ ہندوستان پہنچنے کے لیے راس امید کے راستے کو استعمال کر سکیں اور یوں مشرق میں ''مملکت سازی'' کی دوڑ میں شریک ہو سکیں۔

ولندیزی ایک عرصے سے یورپ میں مشرقی مال پہنچانے کے لیے ''دلال'' کا کام کر رہے تھے۔وہ پرتگالیوں سے مصالحے' خوشبویات اور کپڑا خریدتے اور سارے شمالی یورپ کو فروخت کر دیتے۔ بپن چندر Modern India (1971) میں رقمطراز ہیں کہ اس خرید و فروخت نے ولندیزیوں کو اس راہ پر لگا دیا تھا کہ وہ زیادہ بہتر جہاز بنائیں' سائنسی بحری طریقے اور کاروباری فراست استعمال کریں اور نوآبادیاتی نظام کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو دور کریں۔

1595ء میں پہلی بار چار ولندیزی کشتیوں نے راس امید کے راستے ہندوستان کا سفر کیا اور

یہ ایک کامیاب بحری سفر ثابت ہوا۔ 1602ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی جس کا سب سے بڑا مفاد گرم مصالحوں کی تجارت تھا اور اس مقصد کے لیے ان کا نشانہ ملایا کی ریاستیں اور انڈونیشیا تھے جو اس وقت ''مالاکا'' اور ''بٹاویہ'' کہلاتے تھے۔ جلد ہی وہ اتنے طاقتور ہو گئے کہ انہوں نے پرتگالیوں کو ان علاقوں سے نکال باہر کیا اور 1625ء تک وہ مصالحوں کی ایشیائی تجارت میں سب سے زیادہ منافع بخش حصے کے مالک بن چکے تھے۔ اسی وقت ولندیزیوں نے ہندوستانی تجارت میں بھی اپنی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے' سورت' بھڑوچ' کھمبے' گجرات میں احمد آباد' کیرالہ میں کوچین' مدراس میں ناگاجتن' آندھرا میں مسولیہ پٹم' بنگال میں چنسورہ' بہار میں پٹنہ اور یو پی میں آگرہ کے مقام پر اپنے تجارتی مراکز قائم کر لیے۔ وہ ہندوستان سے نیل' خام ریشم سوتی کپڑا نمک اور افیون برآمد کرتے تھے۔ البتہ انگریزوں اور ان کے درمیان انڈونیشیا کے جزائر سے مصالحوں اور ہندوستان میں وسیع تجارتی مواقع بڑھنے پر رقابتوں کا سلسلہ جاری تھا اسی دوران میں انگریزوں کو انڈونیشیا اور ولندیزیوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ دونوں سامراجی طاقتوں کے درمیان' ہندوستان میں کئی بار چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی ہوئیں اور 1654ء اور 1667ء میں دو بڑی جنگیں بھی لڑی گئیں۔ 1795ء میں آخری معرکہ ہوا جب انگریزوں نے آخرکار ولندیزیوں کو ان کے آخری ہندوستانی مقبوضے سے بھی نکال باہر کیا۔

1602ء میں قائم ہونے والی ڈچ کمپنی کا نام Verenigde Ostindische Compagnie (متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی) تھا اور اسے بالعموم VOC کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے صدر دفتر ایمسٹرڈم اور برانچیں مڈل برگ' ڈیلفٹ' روٹرڈم' ہورن اور انخوزین میں قائم تھیں۔ یہ واحد ڈچ کمپنی تھی جسے مشرق الہند تک بحری سفر کی باقاعدہ اور قانونی اجازت تھی۔ اسے قلعہ بندیاں قائم کرنے' گورنر مقرر کرنے اور نوآبادیوں میں فوج بھیجنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ VOC کے اپنے شپ یارڈ تھے جہاں جہاز سازی اور مرمت کا کام ہوتا تھا۔ سب سے بڑے جہاز تقریباً 1000 ٹن وزنی اور 50 میٹر لمبے ہوتے تھے VOC کی بحری طاقت تیزی سے بڑھتی چلی گئی چنانچہ 1692ء سے 1710ء تک چلنے والے 26 جہاز 30-1720ء تک 400 کی تعداد کو پہنچ چکے تھے۔ 1602ء اور 1795ء کے درمیان 4722 جہازوں نے مشرقی ایشیا تک سفر کیا جن میں سے صرف 3395' ہالینڈ واپس پہنچے۔ 17ویں صدی عیسوی میں VOC کو ہر 10 سال کے

بعد 40,000 افراد کی ضرورت تھی لیکن 18 ویں صدی کے آخر تک یہ ضرورت 87000 افراد تک جا پہنچی۔ جہازوں پر زیادہ تعداد ملاحوں اور سپاہیوں کی ہوتی تھی اور ان میں افسر شاہی' تاجروں اور ان کے اہل خانہ نمایاں ہوتے تھے۔ چونکہ ہالینڈ میں افرادی قوت کی کمی تھی لہٰذا غیر ملکیوں مثلاً جرمن اور سکینڈے نیوین افراد کو پسندیدہ خیال کرتے ہوئے بھرتی کیا جاتا تھا۔

ہینڈرک کے بیمر کہتے ہیں کہ سفر کے دوران میں عام طور پر ہر جہاز کے 13 تا 23 فیصد مسافر جاں بحق ہو جاتے تھے۔ واپسی کے سفر میں چینی' انڈونیشیائی اور ملائی لوگ اکثر ملازم رکھے جاتے۔ بعض اوقات ان جہازوں پر کھلی بغاوتیں بھی پھوٹ پڑتیں اور ان کی بڑی وجہ ناقص اور کم خوراک کی فراہمی یا بیماروں کے لیے طبی امداد کا نہ ملنا ہوتا تھا۔

VOC کو سندھ میں تجارت کے لیے زیادہ مواقع تلاش کرنے میں بہت دلچسپی تھی اس کے جہاز متواتر' ٹھٹھہ تک سفر کرتے تھے۔ ولیم فلور نے اپنی کتاب میں ان کوششوں کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح 1619ء میں VOC کی سورت فیکٹری کے ایک ڈائریکٹر نے یہ اطلاع دی کہ ٹھٹھہ سندھ میں بہت خوبصورت کپڑا تیار ہوتا ہے لہٰذا۔ یہاں پر تجارتی مرکز قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ 1629ء تک VOC نے ایران میں بندر عباس اور ہندوستان میں سورت کے مقام پر فیکٹریوں کا آغاز کر دیا تھا سندھ دونوں مذکورہ مقامات کے درمیان واقع تھا جس کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے کپڑے کی مصنوعات کی بہت مانگ ہے اور وہ اچھا منافع دیتی ہیں چنانچہ 1631ء میں ولندیزیوں نے ایک تجارتی جہاز ٹھٹھہ روانہ کیا جس پر تجارتی اشیاء لدی ہوئی تھیں۔ اس جہاز کا نام Brounershaven تھا (بحوالہ ہیگ ٹرانسکرپٹس سیریز جلد ix نمبر 318)

فوسٹر کا کہنا ہے کہ ضلع ٹھٹھہ میں قحط کی خراب صورت حال کے باوجود جہاز کا مال اچھے منافع پر بک گیا اور 14000 گلڈن کی آمدنی ہوئی۔ واپسی پر یہاں سے بعض اشیاء کے نمونے' سوتی دھاگہ' نمک اور کمتر درجے کا نیل لے جایا گیا لیکن ان اشیاء کی قیمت مقابلتاً زیادہ ادا کرنا پڑی جس کی وجوہات میں ولندیزی تاجروں کی ناتجربہ کاری' اشیاء کی کمیابی اور پرتگالیوں کے ہتھکنڈے شامل تھے کیونکہ ان اشیاء کی اچھی خاصی تجارت ٹھٹھہ سے ایران' عرب اور افریقی ساحلوں وغیرہ تک ہوتی تھی۔

فلور کے مطابق ٹھٹھہ میں رہنے والے پرتگالیوں نے ولندیزیوں کی زندگی تلخ کردی تھی اور گورنر کو دھمکی دی تھی کہ اگر ولندیزیوں کو تجارت کی اجازت دی گئی تو وہ ٹھٹھہ چھوڑ جائیں گے بلکہ شہر پر حملے کے لیے بیڑہ بھی لایا جائے گا۔لیکن اس وقت کے گورنر کو داد دینا چاہیے کہ اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور ولندیزیوں کو کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی اور ان کے دو ماہ کے قیام کے دوران ان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔اس کے باوجود ولندیزیوں نے سندھ کی تجارت سے ہاتھ کھینچ لیا شاید وہ ایک نئے آغاز کے لیے کسی اچھے موقعے کے منتظر تھے۔اور یہ وقت 1652ء میں آ گیا جب ایک زیادہ تجربہ کار ولندیزی تاجر کو ٹھٹھہ بھیجا گیا۔اس مرتبہ پرتگالیوں کے علاوہ انگریزوں نے بھی ولندیزیوں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور ٹھٹھہ کے سرکردہ افرادہ کو ترغیب دی گئی کہ انہیں سندھ میں تجارت کی اجازت نہ دی جائے۔ جب یہ کوشش ناکام ہوگئی تو انگریزوں نے راجپوت لٹیرے اسی رام کو شہ دی کہ ولندیزی جہازوں پر حملہ کردیا جائے۔اس ضمن میں انگریزوں کا مخاصمانہ رویہ قابل فہم ہے کیونکہ دولتِ مشترکہ اور ہالینڈ نہ صرف تلخ تجارتی حریف تھے بلکہ ایک دوسرے کے خلاف یورپ میں جنگوں میں بھی الجھے ہوئے تھے۔

اس وقت ٹھٹھہ کا سرکردہ تجارتی مقام ''بومبائی'' تھا جیسا کہ ہندوستان میں انگریزی فیکٹریوں کے ریکارڈ میں درج ہے۔غالباً یہ جگہ ایک ہندو ''بمبولال'' کی ملکیت تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ کاروبار کرتا تھا اور اسکے کارندے دیہاتوں میں پھیلے ہوئے تھے ان لوگوں کی یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ 60-1659ء میں سندھ، قحط اور پلیگ کی لپیٹ میں تھا جس کی بنا پر معیشت کو بہت نقصان پہنچا تھا اور عوام سخت مصیبت زدہ تھا۔اس وقت کے ٹھٹھہ کے گورنر مغل خان نے انگریزوں کے احتجاج پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ ولندیزی مشن کے سربراہ ''ڈی۔ بائی'' سے وعدہ کیا کہ اسے بھی وہی مراعات اور سہولتیں مہیا کی جائیں گی جو انگریزوں کو حاصل ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ 1631ء اور پھر 1652ء میں بھی سندھی حکمرانوں کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔انہوں نے تجارت کو آزاد رکھنے کی کوشش کی اور کسی قسم کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوئے البتہ 1657ء میں بصرہ کی ولندیزی فیکٹری ختم ہوجانے سے وہاں سندھی ملبوسات کی کھپت بند ہوگئی اور ولندیزیوں نے ٹھٹھہ کی فیکٹری از خود بند کردی۔

فلور کا کہنا ہے کہ 1757ء میں ولندیزیوں نے دوبارہ سندھ کا سفر کیا دراصل یہ سفر اس تجارتی مہم کا شاخسانہ تھا جو دراصل مسقط کے لیے روانہ ہوئی تھی اور دیول سندھ کے سلطان کے پرزور اصرار کے جواب میں تھی جس کا کہنا تھا کہ VOC اس کے علاقے میں آ کر تجارت کرے۔ بدقسمتی سے سندھ کے سفر کے لیے یہ وقت موزوں نہ تھا اور یہاں میاں محمد مراد یاب خان کی حکومت تھی جو میاں نور محمد کلہوڑا کا بڑا بیٹا تھا لیکن مقبول اور محبوب ہونے کے باوجود نااہل تھا۔ میاں نور محمد کلہوڑا کا دورِ حکومت بڑا اغمناک تھا جب سندھی دو مرتبہ تاراج کیا گیا۔ ایک تو 1740ء میں نادر شاہ کے ہاتھوں اور پھر دوسری بار 1748ء میں احمد شاہ ابدالی کے قہر کا نشانہ بنا۔ شہزادہ مراد یاب خان کو امورِ سلطنت کا زیادہ تجربہ نہ تھا اور پھر اس کو اپنے دو بھائیوں میاں غلام شاہ اور میاں محمد عطر خان کے ہمراہ نادر شاہ کا یرغمال بننا پڑا۔ یوں وہ سندھ کی سرزمین سے 1739ء سے 1751ء تک دور رہا اور یہی وہ عرصہ تھا جس کے دوران میں وہ میاں نور محمد کلہوڑا کے وارث تخت ہونے کی بنا پر امورِ جہاں بانی سیکھ سکتا تھا۔ نادر شاہ کے قتل اور احمد شاہ ابدالی کے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد تینوں شہزادوں کو سندھ واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ میاں غلام شاہ اور میاں عطر خان تو براہ راست سندھ چلے گئے جبکہ میاں مراد یاب خان قریباً 2 سال تک مسقط میں مقیم رہا اور 1753ء میں ٹھٹھہ پہنچا۔

جب 1755ء میں میاں نور محمد کلہوڑا کا انتقال ہوا تو امراء نے بغیر وقت ضائع کیے اس کے بڑے بیٹے میاں مراد یاب خان کو تخت نشین کر دیا۔ یہ رسم تخت نشینی انتقال کے دس روز بعد ادا کی گئی۔ اس کام میں دیوان گدومل کا بڑا ہاتھ تھا جو نور محمد کلہوڑا کا پرانا جانثار اور وفادار تھا۔ اقتدار سنبھالتے ہی مراد یاب خان نے نصرپور کے قریب ایک نئے قصبے کی بنیاد رکھی اور اپنے نام پر اس کا نام ''مراد آباد'' رکھا۔

1757ء کے اس ولندیزی سفر کی مکمل روئیداد فلور نے ان دونوں کپتانوں کے حوالے سے لکھی ہے جو تجارتی جہازوں کے ساتھ گئے تھے۔ یہ ایک نایاب دستاویز ہے اور اس وقت کے سندھ کی سماجی، معاشی اور سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالتی ہے جب یہ علاقہ بدترین ایام سے گزر

رہا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے ملک اور عوام کو غربت کے غار میں دھکیل دیا تھا اور سب سے بدترین دور، مراد یاب خان کا دور تھا جو اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر حکمرانی کے لیے غیر موزوں تھا۔ وہ نہ تو ملک میں خوشحالی لا سکا اور نہ ہی عوام کا عزم بلند کر سکا۔ قدرتی طور پر اس کی زندگی ایک یرغمالی کے طور پر ایران میں بسر ہوئی جو کسی طرح بھی راحت و آسائش کی زندگی نہ تھی اس وجہ سے وہ بڑا لالچی اور حریص ہو گیا تھا پھر دیوان گدومل اور دیگر امراء کی حمایت سے مسندِ اقتدار پر فائز بھی ہو چکا تھا اور اس احمد شاہ ابدالی سے قبولیت کی سند بھی حاصل تھی۔ ولندیزی کپتانوں کی رپورٹ میں ایسے کئی واقعات کا ذکر ملتا ہے جو 8 مئی 1757ء کو VOC کی انتظامیہ کو پیش کی گئی تھی۔

ولندیزیوں کی رپورٹ کے مطابق اس وقت اورنگ بندر، ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ فلور کہتا ہے کہ وہ اس نام کا کوئی قصبہ دریائے سندھ کے ڈیلٹا میں تلاش نہیں کر سکا۔ اس کا اندازہ ہے کہ شاید ''لاہری بندر'' کو ہی ''اورنگ بندر'' کہا جاتا ہوگا۔ یہ درست نہیں ہے۔ سورلے کے مطابق 17ویں صدی کے درمیان ٹھٹھہ کی انگریزی فیکٹری اور اس کی لاہری بندر کی بیرونی چوکی آہستہ آہستہ ترقی کی راہ گامزن تھی لیکن اسی وقت لاہری بندر کی اہمیت زوال پذیر تھی جس کی وجہ دریا کا اٹ جانا تھا۔ اس معاملے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملتان کے مغل صوبیدار (گورنر) اورنگ زیب (1648-52) نے اوپر کی جانب ایک نئی بندرگاہ ''اورنگ بندر'' قائم کی سلپر اور سکریونز نے اس بندرگاہ ''کو چرھلا'' کا نام دیا ہے۔ ''اورنگ بندر'' کبھی بھی ایک کامیاب بندرگاہ نہ تھی بعد میں یہ ''شاہ بندر'' کی ایک چھوٹی اور غیر اہم بندرگاہ کا حصہ بن گئی اور آخرکار اپنی کئی پیشرو ساحلی بندرگاہوں کی طرح قعر گمنامی میں گم ہو گئی۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہندو لوگ یا تو اجارہ دار تاجر تھے جو ٹھٹھہ پر متمکن تھے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، دیوان گدومل، سندھ کے اعلیٰ عہدے داروں میں سے ایک تھا جسے مراد یاب خان اور اس کے جانشین میاں غلام شاہ اور والد میاں نور محمد کلہوڑا پر بہت اثر ورسوخ حاصل تھا۔ دیوان گدومل کا ایک بھائی جسپت رائے بھی ایک اعلیٰ عہدے دار تھا۔ ہندو بنیوں کے مقابلے میں

ان دنوں عام سندھی لوگ' اپنی روزی' کشتی رانی کے ذریعے حاصل کرتے تھے اور مسقط' کھمبے' کناریس' کن کین اور مالا بار کی بندرگاہوں تک جایا کرتے تھے۔

1758ء کے لگ بھگ ٹھٹھہ میں قریباً 30 ''مغرز'' کاروباری مراکز موجود تھے جن کو ملتانی اور کچھ سورتی تاجر چلاتے تھے لیکن 1775ء تک صرف ایک ملتانی اور ایک سورتی تاجر رہ گئے تھے۔ ملتان والا مرکز بمباروپ چند کا تھا جو ایک طویل عرصے سے مسٹر سمپٹن کی ملازمت میں بطور وکیل یا دلال کام کرتا تھا اور بعد میں جارج بوشیر اور رابرٹ ارسکن کے ساتھ بھی رہا۔ ارسکن نے 14 نومبر 1760ء کو لکھا کہ ''باما'' ایک بیحد کارآمد' باصلاحیت اور ایماندار شخص ہے۔ ''باما'' اشیاء کی خرید وفروخت پر محض ایک فیصد کمیشن وصول کرتا تھا اس کا دیگر ملتانی ایجنٹوں اور دیگر سندھی تاجروں پر گہرا اثر تھا اور وہ اس قابل تھا کہ اون کی تقریباً 100 گانٹھیں سالانہ کا سودا کر سکے اور ان کے رنگ اور خصوصیات کو جانچ سکے۔ تجارت کی شرائط کے مطابق اشیا کی آدھی قیمت پہلے چھ ماہ کے دوران جب وہ کمپنی کی فیکٹری میں پہنچ جائیں اور بقیہ آدھی قیمت ایک سال کے اندر ادا کی جاتی تھی۔ گمان غالب ہے کہ ''بمباروپ چند وہی تجارتی مرکز ہے جس کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے 52-1647ء میں تعلقات تھے اور اس کا نام ''بمبائی'' یا ''بامبول'' تھا۔ کمپنی کے ریکارڈ کے مطابق اس تاجر نے 1768ء میں ٹھٹھہ میں ایک نیا مرکز تعمیر کیا تھا تاکہ انگریزی کمپنی کا مال ذخیرہ کیا جا سکے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھٹھہ میں کسٹم ماسٹر بھی ایک ہندو تھا جس کا نام عامل گلاب رائے تھا۔

ولندیزی تجارتی مشن کی رپورٹ میں مسقط کا ذکر بار بار آتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مسقط ان دنوں تجارت کا ایک اہم مرکز تھا۔ مزید برآں مرادیاب خان کے لیے مسقط کی اہمیت بہت خاص تھی کیونکہ ایران چھوڑنے کے دو سال بعد اور سندھ جانے سے پہلے وہ وہاں مقیم رہا تھا اور اس عرصے کے دوران میں مسقط کے امیر سے خصوصی تعلقات قائم کر لیے تھے یہاں تک کہ اس نے امیر کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔

مرزا قلیچ بیگ لکھتے ہیں کہ میاں مرادیاب خان نے ملک پر خاموشی اور اطمینان سے قریباً 2 سال تک حکومت کی مگر اپنے اقتدار کے چوتھے سال اس کے بھائی میاں غلام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا

گیا۔ سندھ کی اندرونی صورتحال کے بارے میں ہندو دلالوں نے وسط دسمبر 1757ء میں ولندیزیوں کو جو رپورٹیں دی تھیں ان کا تعلق میاں مراد یاب خان کے ظلم وستم' اسے تخت سے محروم کرنے کی سازشوں اور اسے ہٹا کر میاں غلام شاہ کو تخت نشین کرنے سے ہے۔ ولندیزی مشن کی رپورٹ غالباً واحد ذریعہ ہے جس سے ہمیں مراد یاب خان کی مسقط کے امیر کی بیٹی سے شادی کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ پیر حسام الدین راشدی نے اپنے علمی کارنامے ''منشور الوصیت'' میں بیان کیا ہے کہ مراد یاب خان نے بالترتیب 1137ھ اور 1146ھ میں تین شادیاں کی تھیں۔ اس کی تیسری بیوی مراد علی کی بیٹی تھی جو قلات کے سردار عبداللہ بروہی کا بھانجا تھا۔ مرزا قلیچ بیگ نے ایک اور حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک وقت مراد یاب خان اپنا سارا خزانہ خفیہ طور پر مسقط منتقل کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس بات امیر مسقط کی بیٹی سے شادی ہونے کی اصلیت ثابت ہو جاتی ہے۔

جبکہ VOC کے پاس 1000 ٹن وزنی اور 50 میٹر طویل جہاز موجود تھے' اس کے پاس ساحلی سفر کے لیے چھوٹے جہاز بھی تھے جو سورت اور گمرون کے درمیان چلتے تھے اور راستے میں سندھ کے ساحلوں کو بھی چھو کر گزرتے تھے۔ مزید برآں ولندیزوں کے ساتھ چھوٹی تیز رفتار جنگی کشتیاں بھی تھیں جو پایاب پانیوں میں خاص طور پر چلتی تھیں۔ کیپٹن ووڈز نے اپنی کتاب ''Journey to the Source of Oxus River'' میں لکھا ہے کہ اس نے ''وکر'' کے نواح میں دریائے سندھ کے دہانے کے قریب ایک ولندیزی جنگی کشتی دیکھی جس پر 14 توپیں نصب کرنے کی گنجائش تھی۔ یہ کشتیاں کم گہرے پانیوں کے لیے بنائی جاتی ہیں کہ ان کے بادبان گول' فرش چپٹے اور تمام خصوصیات پایاب پانیوں میں چلنے والی ہوتی تھیں۔ جس کشتی کو ووڈز نے دیکھا' اس کی لمبائی قریباً 7 فٹ' شہتیر کی چوڑائی 25 فٹ' زمین سے 2\1-2 فٹ بلند اور یہ نزدیکی ندی سے 200 گز دور تباہ شدہ ڈھانچے کی شکل میں تھی۔ یہ 1835ء کی بات ہے۔ اس کے علاوہ 300 سے 400 گولے' 20 نالیاں اور پیتل اور لوہے کے کچھ ٹکڑے بھی کشتی پر موجود تھے۔ گولے ایک اونس سے 12 پاؤنڈ تک وزنی تھے۔ یہ سارا جنگی سامان مع دیگر زنگ آلود اشیاء کے حیدرآباد

بھیج دیا گیا تا کہ تالپوروں کے دربار میں نمائش ہو سکے۔ اس بدنصیب ولندیزی کشتی کے ساتھ کب اور کیسے یہ ہوا؟ یہ تو یقین سے کہنا مشکل ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ پایاب پانیوں چلنے اور جنگوں میں استعمال ہونے کے لیے بنی تھی۔ گمان ہے کہ یہ جنگی کشتی ایک طرح کی ''پٹرولنگ'' کشتی تھی تا کہ کسی مصیبت کی صورت میں مدد فراہم کرے اور دشمن سے لڑائی کی صورت میں بھی کام آسکے۔

فلور نے کراچی کے قریب ایک اور جہاز کی تباہی کے بارے میں بھی بیان کیا ہے۔ یہ 1742ء کا واقعہ ہے جب نادر شاہ کے حکم پر ولندیزیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایرانی حکومت کو ایک جہاز عاریتاً دے تا کہ سندھ کے نادر شاہی گورنر مظفر علی خان کا مال اسباب' سندھ پہنچایا جا سکے۔ اس جہاز کا نام ''De-Redderkerk'' تھا لیکن جو جنگی کشتی کپتان ووڈز نے ''وکر'' کے قریب دیکھی (1835ء) وہ بہت چھوٹی تھی لہٰذا ایرانیوں کے زیر کمان بڑے جہاز کے طور پر شناخت نہیں کی جاسکتی۔

جب 18 ویں صدی کے دوسرے نصف میں ولندیزیوں کی قسمت پر مہر ثبت ہو چکی تھی تو بھی انہوں نے ایران اور ترکی سلطنت کے دیگر مشرقی حصوں سے تجارت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''مالکم'' کی تاریخ ایران (ترجمہ مرزا حیرت) میں ایک واقعہ تفصیلاً درج ہے کہ کس طرح ولندیز ان مملکتوں کے مشرقی ساحلوں پر اپنے دیگر یورپی حریفوں کو کہیں پیچھے چھوڑ گئے تھے لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ولندیزی قوت (ماسوائے انڈونیشیا کے) مائل بہ زوال تھی۔

❁

سندھ میں سمہ دور: عروج اور زوال

ڈاکٹر تنویر جونیجو / ریاض آگرو

تعارف:

''سمہ'' اصل میں کون تھے کہاں کے رہنے والے تھے۔ اس کے لیے تاریخ دانوں کے درمیان اختلاف رائے رہا ہے۔ کچھ مورخین کی رائے ہے کہ سمہ عربوں سے تعلق رکھنے والی کوئی قوم یا نسل ہے۔ جب کے باقی تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ سمہ سندھ کے قدیم باشندے ہیں۔ راجپوتوں کے چندر ونسی شاخ سے ان کا تعلق ہے۔ ان کا سلسلہ نسب راجا کرشن سے جا ملتا ہے۔ دوارکا کے راجا کرشن کی ساتویں رانی ''جامبوتی'' کے بڑے بیٹے ''سامبو'' سندھوندی کے دونوں کناروں پر زابلستان تک ایک حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جس کی تخت گاہ ''سمنگر'' ساموئی تک تھی۔ اس حکومت کو سندھ سمہ کہتے تھے۔ سامبل اس خاندان کا راجا تھا۔ جس نے سکندر اعظم سے جنگ کی تھی۔ جامبوتی کے بطن سے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کا لقب ''جام'' تھا۔

سمہ کا تعلق کس علاقے سے تھا؟ اس بارے میں نبی بخش بلوچ کی رائے ہے کہ ''سموں (سمہ) کے کچھ قبیلے پرانے زمانے سے لے کر سندھ کے درمیانے علاقوں میں رہتے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی کی شروعات میں محمد بن قاسم کے فتح سندھ کے وقت ''ساوندہ سمہ'' یعنی ''سموں کی ساوک'' موجودہ سن ساموئی کے علاقے یعنی نواب شاہ تعلقہ میں ہے جو سموں کا اہم مرکز رہی ہے۔ (مذہبی حوالے سے سمجھا جاتا ہے کہ سمہ بنیادی طور پر ہندو تھے اور محمد بن قاسم کے آنے کے بعد انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ سمہ اور چند قبیلوں نے سب سے پہلے

سندھ میں اسلام قبول کیا تھا۔

سمہ حکومت کا آغاز:

بنیادی طور پر سمہ ایک دولت مند اور طاقتور قبیلہ تھا۔ ان کے طاقت کا عروج چودھویں صدی عیسوی کے درمیان میں ہوا۔ ''جام انڑ'' جس کے لیے سمجھا جاتا ہے کہ وہ یقینی طور پر سموں کے انڑ برادری کا سردار ہوگا۔ اور اس برادری میں کم سے کم پانچ ملیہ قبیلے انڑ' ڈاہری' سانڈ' ساریا اور کیریے شامل ہوں گے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ اس وقت سیوھن میں سردار انڑ اور قیصر رہتے تھے جو سلطان کے تابعدار تھے اور ان کے پاس اٹھارہ سو سوار تھے۔ اور اس دور میں وہاں پر ایک ''رتن'' نام کا ہندو رہتا تھا جو حساب کتاب میں ماہر تھا۔ دہلی کے حکمران سلطان محمد شاہ تغلق نے اس کو ''سندھ سردار'' کا لقب دے کر سیوھن کا حاکم مقرر کیا تھا اور سیوھن کے اردگرد جو علاقے تھے وہ ان کی جاگیر میں دے دیئے تھے۔

سردار انڑ اور امیر قیصر کو اس کی اطاعت کرنا مشکل لگی اس لیے انہوں نے ملک رتن کے خلاف بغاوت کی ملک رتن کو قتل کرنے کے بعد جام انڑ مال ملکیت اور رعیت امیر قیصر کے حوالے کرنے کے بعد وہ اپنے قبیلے کے طرف واپس آیا۔

ایم۔ ایچ پنہور کی رائے کے مطابق وہ دور 37-1333ء کا ہوگا۔ اس دور میں سومروں کے ساتھ اس کی جھڑپیں چلتی رہیں اور بالآخر اس کا بیٹا ''جام بابینا'' نے سومرا خاندان کے حاکم ہمیر دودو کے بیٹے کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ پنہور صاحب کی رائے کے مطابق ہمیر سومرو نے سندھ سے بھاگ کر جان بچائی۔ اور وہ اس کو 1351 کا زمانہ کہتا ہے۔

اس طرح سمہ نسل نے سندھ میں ایک خودمختار حکومت قائم کی۔ نبی بخش بلوچ سمہ کی حکومت کا سنہ 1350ء قرار دیتے ہیں۔

سموں کا دارالخلافہ:

سمہ کی اوائلی تخت گاہ ''سمانگر'' تھی۔ جو ساموئی سے تین میل شمال میں تھی۔ یہ سندھ کا قدیم شہر تھا کوئی مرتبہ اجڑا اور آباد ہوا۔ اس کے آثار مکلی سے شمال مغرب کی طرف ٹیلوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ مرزا قلیچ بیگ ساموئی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ سومروں کا بڑا شہر ''محمد طور'' سومروں کے ساتھ تباہ ہوا۔ اور سموں نے اس کے آس پاس کچھ نئے شہر آباد کیے۔ جن میں سے اہم ''ساموئی'' تھا۔ وہ درک کا پرگنہ (علاقہ) کہلواتا تھا۔ کچھ مورخین کی رائے کے مطابق وہ شہر جام انڑ کے باپ بابینہ نے آباد کیا تھا۔ اور جام انڑ نے اس کو مزید وسیع کیا وہ سنہ 1351ء میں تخت پر بیٹھا مگر سمہ دور کے مشہور حاکم جام نظام الدین (جام نندو) نے اپنا دارالخلافہ ٹھٹھہ کو منتخب کیا۔ وہ شہر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ جام نندو کے دور حکومت میں اس شہر میں کئی مساجد اور مدارس تعمیر کیے گئے اور یہ شہر علم و ادب کا مرکز ہو گیا۔

سمہ دور اور کچھ:

''کچھ'' میں سندھی قبیلے کب سے آباد ہوئے' مورخین کی ایک بات پر متفق نہیں ہیں۔ البتہ کہتے ہیں کہ عربوں کے زمانے میں کچھ سندھ میں شامل کیا گیا۔ سومروں کے دور میں وہ رشتے اور بھی مضبوط ہوئے اور اس دور میں سندھی قبائل خاص طور پر ''سمہ'' نے کچھ کو آباد کیا۔ ان کی آبادی اور قبیلوں کے صورت میں ''سندھی سمہ'' اور ''جاڑیجا سمہ'' کے ناموں سے سارے کچھ پر چھا گئے اور یہاں تک کہ سمہ کے عروج سے یہ قبیلے کاٹھیاواڑ اور گجرات تک پھیل گئے۔ علاوہ ازیں سمہ کے عہد میں کچھ اور سندھ کے درمیان خاص قسم کے سیاسی تعلقات قائم ہو گئے جو سمہ کے آخری دور تک قائم ہے۔ سندھ اور گجرات کے حکمرانوں نے دہلی سے آزاد ہو کر خود مختار حکومتیں قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ جس کی وجہ سے ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ اور جام تغلق سمہ کے عہد مئیں وہ تعلقات سیاست سے مضبوط ہو کر رشتے داری میں تبدیل ہوئے۔

سمہ حکمرانوں کے دورحکومت کے ترتیب

-1	جام انڑ	1333-1352ء
-2	جام جونو	1352-1368ء
-3	جام بابینو	
-4	جام تماچی	1368-1370ء
-5	جام توگاچی	1368-1370ء
-6	جام جونو دوئم	1371-1381ء
-7	جام تماچی دوئم	1389-1392ء
-8	صلاح الدین بن تماچی	1392-1404/5ء
-9	جام نظام الدین (جام نندو)	1404/5-1416/7ء
-10	جام علی شیر	1404/8-1412/13ء
-11	جام کرن	1412-/13ء
-12	جام سکندر اول	1412/13ء
-13	جام فتح خان	1412/13-1428ء
-14	جام تغلق	1428-1453ء
-15	جام مبارک	1453ء
-16	جام سکندر ثانی	1453-1455ء
-17	جام رائدان/ رائے ڈنو	1454-1461ء
-18	جام سنجر	1461-1469/70ء
-19	جام فیروز	1470-1517ء

فیروزالدین جام انڑ اول: (دورحکومت 1352-1351ء)

جام انڑ نے ہمیر بن دودو سومرو کو شکست دے کر فیروز ملک کے نام سے مسند اقتدار پر بیٹھے۔ اس کی حکومت کے دوران دہلی کے حاکم محمد تغلق کے خلاف بغاوت کرنے والے طغی نے ٹھٹھہ میں آ کر امان پائی۔ جسکی وجہ سے محمد تغلق نے ٹھٹھہ پر چڑھائی کردی۔ مگر وہ 50 میل دور تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ جب کے پنہور کے رائے ہے کہ طغی نے سومروں کے پاس پناہ لی تھی۔ مولائے شیدائی لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ کچھ شر پسند لوگوں نے فساد برپا کیا جن کو سبق سکھانے کے لیے جام انڑ نے اپنے بھتیجے کاہ تماچی کو بھیجا مگر کاہ ان لوگوں کے پاس قید ہو گیا۔ جس کی جام انڑ نے کوئی خبر گیری نہ کی۔ قید سے آزاد ہونے کے بعد کاہ نے بکھر سے علی شاہ اور ملک فیروز ترک کو ساتھ لے کر جام انڑ پر حملہ کر دیا۔ جس میں جام انڑ قتل ہو گیا۔ جب کہ دوسری رائے یہ ہے کہ جام انڑ اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے آ رہا تھا تو وہ راستے میں ہی فوت ہو گیا۔

صدرالدین جام بابینو (ثانی) (دورحکومت 1368-1352ء)

باپ کے وفات کے بعد جام بابینا نے اپنے چچا علاؤ الدین جام جونو کے ساتھ مل کر سندھ پر حکومت کی۔ بابینا وطن دوست حکمران تھا اور سندھ پر کسی بیرونی مداخلت کا سخت مخالف تھا۔

بابینا نے مغلوں کی مدد سے گجرات اور پنجاب پر کئی حملے کیے۔ یہاں تک کہ ملتان کے گورنر عین الملک ماہرو نے فیروز الدین تغلق کو درخواست کی کہ "ہمیر دودو آپ کی شفقت کا پروردہ ہے' فسادی اور باغی بابینا کو ختم کرنے کے لیے اس کو مقرر کیا جائے۔ بابینا ایک مرتبہ مغلوں کا ہجوم ساتھ لے کر پنجاب کے علاقوں میں لوٹ مار کرنے آیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق' سندھ کا پانی زیر تسلط لانے کا سخت خواہاں تھا۔ اس لیے اس نے عین الملک ماہرو کو خط لکھا "یہ فرمان فیروز شاہ کا ہے جس کے ذریعے اس نے اپنے بیٹے ناصرالدین فتح کو سندھ کا ملک سپرد کیا ہے۔ سندھ کے باشندوں کو اطاعت کی تلقین کی جاتی ہے۔

جام بابینا نوجوان اور باہمت تھا' اس نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجے میں فیروز شاہ تغلق نے سندھ پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ 1365ء میں اس نے بہت بڑے لشکر کے ساتھ

سندھ پر حملہ کیا۔ جہاں پر جام بابینا اور جام جونہ نے اس کی فوجوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ فیروز شاہ شکست کھا کر گجرات کی طرف بھاگ نکلا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے بڑے ساز وسامان کے ساتھ سندھ پر حملہ کیا۔ کافی جانی اور مالی نقصان کے بعد بھی وہ سندھ کو فتح نہ کر سکا اور مجبور ہو کر مخدوم جہانیاں کو اچ سے منگوایا۔ اس بزرگ نے آ کر شاہی لشکر گاہ میں اپنے لیے جائے نماز منگوائی اور سندھی لشکر کو زیر کرنے کے لیے دعائیں مانگیں۔ عبادتوں کے نتیجے میں معجزہ رونما ہوا اور سندھ کے لشکر نے حالات کے نزاکت کو دیکھتے ہوئے فیروز شاہ تغلق سے صلح کی۔ اس صلح کے پیچھے بھی مخدوم جہانیاں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس صلح کے نتیجے میں سمہ سرداروں کو کچھ شرائط قبول کرنے پڑے۔ مقصد یہ تھا کہ اور زیادہ خون خرابے سے بچا جا سکے۔ جام جونہ نے وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے وہ شرائط قبول کیے شرائط یہ تھے کہ سندھ دہلی کو خراج ادا کرے گا۔ اور جام جونو اور جام بابینو دہلی فیروز شاہ کے ساتھ چلیں گے۔ پیچھے ان کے بیٹے اور بھتیجے حکومت کریں گے۔ 1368ء میں جام جونا اور جام بابینو فیروز شاہ تغلق کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے سندھ میں جام تماچی بن جام انڑ اور جام (خیر الدین) تو گاچی بن جام جونو حکمران بنے۔

رکن الدین جام تماچی بن فیروز الدین جام انڑ: (دور حکومت 1370-1368ء اور 1389-1392ء)

جام تماچی نے جلد ہی آزادی کا اعلان کیا۔ سندھیوں کو جیسے کے سیدھے طریقے سے زیر نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے ایک مرتبہ پھر فیروز شاہ تغلق نے مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاری سے مدد مانگی۔ جو اس وقت دہلی میں شاہی مہمان تھا۔ اور دہلی کی شہنشاہت سے اس کے دینوی دوستی کے قریبی تعلقات تھے۔ اس مرتبہ بھی مخدوم جہانیاں بیچ میں آیا۔ اور سندھی نیک دل نیک نیت پیر فقیر کو ماننے والے۔ چنانچہ مخدوم ٹھٹھہ پہنچ کہ نامعلوم عہد پیماں پر جام تماچی کو ساتھ لے کر دہلی روانہ ہوا۔ جام جونو جس کو مخدوم بخاری ساتھ لایا تھا ایک مرتبہ پھر سندھ کا حکمران ہوا۔ اور 1371-1383/89ء تک حکومت کی 1388ء تک سلطان فیروز شاہ تغلق نے وفات کی۔ جس کے بعد اس کا پوتا غیاث الدین بن فتح خان تغلق تخت پر بیٹھا۔ جس نے جام بابینا' جام تماچی اور

اس کے بیٹے صلاح الدین کو آزاد کیا (جو اپنے والد کے ساتھ دہلی روانہ ہوا تھا) دورانِ سفر جام بابینا کا انتقال ہو گیا اور 1389ء میں جام جونہ نے بھی وفات پائی۔ جس کے بعد رکن الدین جام تماچی نے 1389-1392ء تک حکومت کی۔

سلطان صلاح الدین جام انڑ بن جام تماچی: (دورِ حکومت 1392-1404/5ء)

سلطان صلاح الدین نے سندھ پر گیارہ برس حکومت کی سندھ کے الگ الگ حصوں میں فوجیں بھیج کر سندھ کو اپنے خود مختار تسلط کے نیچے لایا۔ سلطان صلاح الدین کے بعد اس کے بیٹے نظام الدین نے سندھ پر حکومت کی۔

سلطان نظام الدین اول بن سلطان صلاح الدین: (دورِ حکومت 1404/5-1406/7ء)

جام صلاح الدین بن جام تماچی کی وفات کے بعد جام نظام الدین اول سندھ کے تخت پر مسند نشین ہوا۔ اور اپنے قیدی چچاؤں جام سکندر، جام کرن، جام بہاؤ الدین اور جام عامر کو آزاد کیا، اور نیک نیتی سے حکومت کرنے لگا۔ مگر اس کے چچاؤں نے ان کے خلاف بغاوت کی جس کے نتیجے میں وہ گجرات کی طرف بھاگا اس کی حکومت تقریباً 12 برس اور کچھ ماہ چلی۔ جام علی شیر بن تماچی، جس کو کچھ مورخ سلطان نظام الدین کا بیٹا کہتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر بلوچ کی رائے کے مطابق وہ سلطان صلاح الدین کا بھائی اور جام تماچی کا بیٹا ہے۔ اس نے سندھ پر سات سال حکومت کی کچھ مورخین کی رائے ہے کہ اس کو قتل کیا گیا تھا، وہ ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس کو مارنے میں اس کے عزیز جام کرن، سکندر اور فتح خان شامل تھے۔ اس کی وفات کے بعد امیروں نے جام کرن کو حکومت پر بٹھایا۔

جام کرن بن خیر الدین بن جام طغاچی بن جام جونو اول: (دورِ حکومت 1412/13ء)

کچھ تاریخ دان جام کرن کو سکندر، بہاؤ الدین اور عامر کا بھائی تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں وہ بھائیوں کی کوشش سے حاکم ہوا۔ مگر دوسرے امراء کو یہ بات پسند نہ آئی اور جیسے ہی وہ مجلس سے اٹھ کر محل میں سویا تو سرداروں نے اس کو قتل کرا دیا۔ اس نے صرف چوبیس گھنٹے حکومت کی اس گروہ کا سربراہ فتح خان تھا جو کرن کے بھائی جام صدر الدین کے بعد سندھ کا حاکم بنا۔

خیرالدین بن جام تماچی: (دورحکومت 1412/13ء)

بہاولپور سے ملنے والے ایک سرائیکی زبان کے کتبہ کے مطابق اس نے آٹھ ماہ یا ایک سال تک حکومت کی۔

جام فتح خان بن صدرالدین جام سکندر: (دورحکومت 1428-1412/13ء)

سندھ کے مختلف قبیلوں کے سرداروں نے اس کا نام تجویز کیا۔ اس کی حکومت کے دوران امیر تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ملک کو ویران کیا۔ اس کے پوتا مرزا پیر محمد نے اچ اور ملتان کے قلعے فتح کیے۔ بکھر کے بزرگ ابوالغیث کی سفارش پر سندھ والے مغلوں کے حملے سے بچ گئے اور امیر تیمور سمرقند واپس چلا گیا۔ فتح خان نے پندرہ برس کامیابی سے حکومت کی اور اپنی وفات سے تین دن پہلے اپنے بھائی جام تغلق کو جانشین بنا گیا۔

جام تغلق جام جونو ثانی بن صدرالدین جام سکندر: (دورحکومت 1453-1428ء)

اپنے بھائی جام فتح خان کی وفات کے بعد جام تغلق سندھ کا حاکم بنا۔ وہ شکار کا بے حد شوقین تھا۔ بکھر اور سیوھن کے باگیں اس نے بھائیوں کے ہاتھ میں دے دیں۔ جیسا کہ امیر تیمور کے سبب طوائف الملو کی کا دور دورہ تھا۔ سمہ کی حکومت کی حدیں اباوڑو تک تھیں۔ جام تغلق کے دور میں بکھر کے بلوچوں نے بغاوت کی مگر جام بکھر اور سیوھن کا انتظام رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے کلاہ کوٹ پر تغلق آباد کا نام رکھ کر قلعہ بنانے کا کام شروع کیا۔ جو ان کے دنوں میں مکمل نہ ہو سکا۔

مکران جھالاواں اور کچھ کے سردار، سومروں کے سرداری میں تھے۔ جنہوں نے بعد میں جھانوالاں میں میر عمر میرواڑی نے براہوی نے سموں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ خاراں کے نوشیرواں کے ملکوں نے بھی عمر کا ساتھ دیا ملکی صورتحال کے پیش نظر اور سیاسی مضبوطی کے لیے جام تغلق نے اپنے دو بیٹوں کی رشتے داری گجرات کے حاکموں سے کی۔ اس لیے کہ ملک میں اندرونی بغاوتوں اور دہلی والوں کی یلغاروں کو روکا جاسکے۔

جام مبارک: (دورحکومت 1453ء)

جام تغلق کے بعد جاموں کے ایک رشتے دار اور وزیر نے سندھ کی حکومت پر قبضہ کیا۔ مگر اس کی حکومت صرف تین دن چلی۔ کیونکہ سرداران سمہ نے ان کو نکال دیا۔ جس کے بعد سب کے مشورے سے سکندر ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا۔

جام سکندر (ثانی) جام انڑ (ثانی) بن فتح خان: (دورحکومت 1455-1453ء)

کچھ تاریخ دانوں کی رائے کے مطابق جام سکندر ثانی' جام تغلق کا بیٹا تھا۔ ان کے دنوں میں سیوھن اور بکھر کے صوبیداروں نے بغاوت کردی۔ وہ جیسے ہی لشکر لے کر بکھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ایک عزیز مبارک نے اپنے آپ کو حاکم کہلوایا۔ مگر جیسے کہ اوپر آیا ہے کہ اس کو نکال دیا گیا۔ جام سکندر اپنے نائبوں سے صلح کی باتیں کر کے واپس آیا۔ تقریباً ایک سال تک اس نے حکومت کی۔

جام رائداں بن سلطان صلاح الدین: (دورحکومت 1461-1453/54ء)

اپنی ذاتی خصوصیات کی بنا پر اور عدل وانصاف کے باعث اس کو سندھ کے سموں نے یک رائے ہو کر حکومت دی۔ سمندر سے لے کر اباوڑے کے گاؤں تک اس کی حکومت رہی۔ اس نے نو برس تک حکومت کی۔ یہ کچھ میں رہتا تھا۔ سکندر ثانی کے وفات کے بعد وہ لشکر سمیت سندھ آیا۔ 18 ماہ تک اسنے اپنے حکومت' ماتھیلو' اباوڑ واور گجریلو تک پھیلا دی۔ اس کے ایک دوست سنجر خان نے زہر دے کر اس کو ہلاک کر دیا۔ اس کے دنوں میں گجرات نے بہت ترقی کی۔ سلطان مظفر کے پوتے زین العماد نے احمد آباد کا شہر تعمیر کرایا۔ گجرات کی طاقت کے پیش نظر سندھ کے سموں نے سوڈھوں اور بلوچوں کو سرحد پر مقرر کیا۔ جنہوں نے جودھ پور پر حملہ کیا اور راجا جودھا راٹھوڑ کے بیٹے کو شکست دی۔

جام سنجر

تاریخ نویس اس مسئلے پر بھی متفق نہیں ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ صدرالدین جام سنجر جام

رائدان یا رائے ڈنو ایک ہی شخصیت کے نام ہیں جب کہ کچھ مورخوں کی رائے ہے کہ رائیدان اور سنجر الگ الگ شخصیتوں کے نام ہیں۔

جام رائدان کے بعد جام سنجر تخت پر بیٹھا (دور حکومت 1469/70-1461ء) جو بیحد خوبصورت جوان تھا۔ ایک درویش اس کے حسن پر مفتوں تھا۔ اس کی دعا سے یہ بادشاہ بنا اور آٹھ برس حکومت کی۔ سلطان محمود بیگڑو سے رشتہ داری کی۔ جام سنجر کے زمانے میں بکھر کا قاضی رشوت لیتا تھا۔ جام سنجر نے رشوت ختم کرنے کے لیے سرکاری ملازموں کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ جس کے بعد وہ گجرات بھاگ گئے۔ جام سنجر نے اپنے بیٹے کا رشتہ سلطان مظفر ثانی کے خاندان میں 1518ء میں کر دیا۔

جام نظام الدین جام نندو بن صدرلا دین بن صلاح الدین: (دور حکومت 1517-1470ء)

تاریخ نویس ان کو بہترین حکمران اور بہترین بادشاہ تصور کرتے ہیں۔ وہ نہایت ہی دیندار حکمران تھے۔ علم سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اس کی خارجہ پالیسی امن اور آشتی پر مبنی تھی۔

جام نظام الدین ہر ہفتے اصطبل میں جاتا تھا اور گھوڑوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا تھا اے خوش بختو جہاد کے سوا تم پر سواری کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری چاروں سرحدوں پر اسلامی حکمران ہیں۔ دعا کرو کہ شرعی سبب کے سوا تم پر سواری نہ کروں اور نہ ہی کوئی یہاں پر آئے۔ مبادا مسلمانوں کا خون بہے اور خدا کے آگے مجھے رسوا ہونا پڑے۔

عبدالرحیم خان خانان اس کو ہندوستان کا مہذب ترین شخص تصور کرتا تھا۔ جام نندو نے اپنے پڑوس کے سارے عالموں اور بزرگوں کو سندھ میں بلوایا۔

اس کی حکومت کی سرحدیں سبی اور شال (کوئٹہ) تھیں اس نے ٹھٹھہ کو دوبارہ بہتر نمونے میں آباد کروایا۔ اس کے زمانہ اقتدار میں بہت سے لوگ ایران اور خراسان سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ جن کے لیے ٹھٹھہ میں الگ محلے تعمیر کرائے گئے۔

مولانا عبدالعزیز ابھری اور اس کا بیٹا مولانا اثیر الدین ٹھٹھہ آئے اور مدرسے جاری کیے۔
میر شمس اور میر معین بھی ٹھٹھہ آئے جنہوں نے علم اور ادب کی ترویج کے لیے کام کیا۔
ان کا سلوک مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں سے بھی نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔

جام نظام الدین زبردست مردم شناس انسان تھا۔ اس کے وزیر بھی اعلیٰ درجے کے لوگ تھے۔ اس کا پہلا وزیر دلشاد خان تھا جس کا شجاعت اور انسانیت میں کوئی ثانی نہیں تھا۔ بکھر میں اس نے کئی اصلاحات کیں۔ جو تاریخ میں نمایاں ہیں۔

جام نظام الدین کی حکومت کے حوالے سے دولہہ دریا خان کا ذکر لازم وملزوم ہے۔ دریا خان کا اصل نام قبولیو تھا۔ وہ جام نظام کے دیوان لکھمیر خان کا غلام تھا۔ جہاں سے جام نظام اس کو اپنے پاس لایا۔ بادشاہ نے اس کی نہایت اعلیٰ درجے کی پرورش کر کے وزیر اعظم کے درجے پر فائز کیا۔ مبارک خان اور خان اعظم کے خطاب دے کر سندھ کی فوجوں کا سپہ سالار بنایا۔ اور دریا خان نے بھی نمک حلالی کا اعلیٰ مظاہرہ کیا اور سلطنت کا سر فخر سے اونچا کیا۔ نہ صرف وہ سلطان کے زمانے میں مگر سلطان کی وفات کے بعد بھی سندھ کی آزادی اور بقا کی خاطر لڑتا رہا۔ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ سندھ نے ایسا زمانہ نہ پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا۔ دریا خان کا سارا خاندان وطن کے محبت سے سرشار تھا۔ اس کا بیٹا علاؤالدین عالم تھا۔ جب کہ محمود خان اور متھن سپاہی تھے۔ اس کا چوتھا بیٹا سارنگ بھی زبردست سپاہی تھا۔ اور انہوں نے ارغونوں سے کافی عرصہ تک جنگ کرتے رہے۔ 1485/86ء میں منگولوں کے دنوں میں سلطان حسین مرزا بائقراء خراسان کا حاکم تھا۔ وسطی ایشیا کے بیوپاریوں کے اشارے پر سندھیوں نے ان کی لوٹ مار کی ان کو سبق سکھانے کے لیے سلطان نے سندھ پر حملہ کیا۔ مگر کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

امیر ذالنون ارغون ان دنوں میں ہرات کی جانب سے قندھار میں گورنر تھا۔ جس نے اپنے بیٹے شاہ بیگ کو بھیجا۔ جس نے جام نظام الدین کے سبی والے قلعے پر قبضہ جمایا۔ جو اس زمانے میں جام کے ایجنٹ بہادر خان کے پاس تھا۔ شام بیگ نے وہ قلع اپنی بھائی سلطان محمد کے حوالے کیا۔ سلطان محمد دریا خان ہاتھوں جلوہ گیر بولان کے پاس جنگ میں مارا گیا۔ جس کے بعد مغلوں نے جام کے زمانے میں سندھ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

ناصر الدین ابوالفتح فیروز شاہ: (دورِ حکومت 1528-1517ء)

جام نندو کی وفات کے بعد جام فیروز سندھ کا حاکم ہوا۔ جیسا کہ وہ کم عمر کا تھا اور اس زمانے میں سمہ قبیلے کے اندر بھی اختلاف تھا۔ سندھ کی حکومت کا دعویدار جام صلاح الدین بھی اس کے

قریبی عزیزوں میں سے تھا۔ اس نے بھی تخت پر بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر دریا خان اور مبارک خان جن کا اثر تھا ایسا کرنے سے اس کو روکا۔ صلاح الدین ناراض ہو کر گجرات چلا گیا۔ سلطان مظفر گجراتی جو اس کے چچا زاد بہن کا شوہر تھا۔ اس کے پاس رہ گیا۔

اس دوران فیروز پر فیروز کی دریا خان سے ان بن ہو گئی۔ دریا خان نوکری چھوڑ کر اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ یہ موقع بہتر جان کر صلاح الدین گجرات کے لشکر کے ساتھ فیروز پر حملہ کیا۔ فیروز کی فوج کمزور تھی اور وہ مقابلہ نہ کر سکا۔ صلاح الدین سندھ کا حکمران بن گیا اور اس نے نو ماہ تک حکومت کی۔

اب فیروز کو دریا خان کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کے والدہ اور کچھ دوسرے لوگ دریا خان کے پاس گئے اور اس کو منت سماجت کی کہ وہ فیروز کا ساتھ دے۔ دریا خان نے بکھر اور سیوھن کے علاقوں سے فوج اکٹھی کر کے صلاح الدین کو شکست دی۔

اس طرح اقتدار ایک مرتبہ پھر فیروز کو ملا۔ اس سارے عمل نے سندھ کے سماج کو انتشار کا شکار بنا دیا۔

ارغونوں کی آنکھیں سندھ کے سرزمین اور دولت پر لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ منصوبہ بنانے لگے۔ کہ کس طرح سندھ کو ہڑپ کیا جائے، اس لیے پہلے انھوں نے اپنی گماشتے سندھ کی طرف بھیجے جو مسافروں اور کاروباری لوگوں کی صورت میں ٹھٹھہ میں داخل ہوئے۔ جام فیروز ان کو پہچان نہ سکا اور ان کے خوشامدانہ رویے کے باعث ان کو ٹھٹھہ کا ایک علاقہ عطا کیا جو ''مغل محلے'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔ جس میں دولت شاہی، نور گاہی، اور کبیک ارغون رہنے لگے۔ اس دوران میر قاسم کبیک نے دربار میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ جو ہر صورتحال سے شاہ بیگ کو باخبر کرتا رہتا تھا۔ دوسرا گروہ جو شاہ بیگ نے سندھ پر نازل کیا تھا وہ پیروں اور مرشدوں کے روپ میں آیا۔ وہ لوگ چار دوستوں کی چوکڑی کے نام سے مشہور تھا۔ قاضی شکر اللہ شیرازی، سید منبہ، سید کمال اور سید عبداللہ ان میں ایک خاص قسم کا اتحاد تھا۔ وہ خود کو پیران پیر (عبدالقادر شاہ جیلانی) کی اولاد کہلواتے تھے اور وہ لوگ ارغونوں کی حکومت کے سندھ میں پاؤں جماتے رہے۔

تیسرا گروہ جس نے سندھ کے عالموں اور عام لوگوں میں انتشار پیدا کیا وہ شاہ بیگ ارغون کے مرشد مرزا محمد احمد جونپوری کے قیادت میں مہدوی تحریک کا فتنہ لیکر سندھ میں وارد ہوا۔

جیسا کہ سندھ جام فیروز کے زمانے میں کمزور ہو چکا تھا۔ اس سارے عمل نے سندھ کو اندر سے منتشر کر دیا۔ اب حالات ساز گار دیکھ کر شاہ بیگ نے 1518ء میں سندھ پر حملہ کر دیا۔ جیسے ہی شاہ بیگ ارغون سندھ کے علاقہ باغبان سے گذرا تو دریا خان کے بیٹے اس سے جنگ کرنے کے لیے ٹلٹی کے میدان میں نکل آئے۔ شاہ بیگ نے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور راستہ تبدیل کر کے ٹھٹھہ نکل گیا۔ جہاں پر دریا خان کی قیادت میں سندھ کے طبقوں نے مل کر جنگ کی۔ مگر سمہ لشکر ارغونوں کا مقابلا نہ کر سکا اور دریا خان نے بیس دسمبر 1520ء میں سندھ کے لئے جام شہادت نوش کیا۔ وہ بھی ماہ محرم تھا، دریا خان گیارہ محرم الحرام کو سندھ کے اوپر سر قربان کر کے سرخرو ہوا۔ مغلوں کی فوج برابر دس دن تک ٹھٹھہ کے دولتمند شہر میں لوٹ مار کرتی رہی۔ جام فیروز اور دوسرے معززین شہر کے بچے قید کر لیے گئے۔ ارغونوں لے ہاتھوں سندھ کی فتح کو ایک خرابی قرار دیا گیا ہے۔

میر معصوم بکھری اس واقعے کی تشریح کرتے ہوئے قرآن پاک کی ایک آیت لکھتے ہیں کہ:

''بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتا ہے تو وہ اس ملک کو ویران کر دیتا ہے۔''

جام فیروز جس کے بال بچے سندھ میں رہ گئے، اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں شاہ بیگ کو پیغام بھیجا کر'' وہ ارغونوں کی اطاعت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مغل صلاح مشورے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ساری سندھ پر کنٹرول کرنا مشکل ہے۔ اس لیے آدھے سندھ کو جام فیروز جیسے بے ضرر بادشاہ کے حوالے کیا جائے۔ اس طرح جام فیروز کو کار آمد سمجھ کر اس کے اوپر اپنے قابل اعتماد آدمی نگران مقرر کر کے خود سیوستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں پر سہتوں اور سوڈھوں نے اس کی ساتھ جنگ کی۔ اور جب تک وہ زندہ رہے لڑتے رہے۔ اس کے بعد دریا کے بیٹوں میاں محمود خان، مٹھن خان، جام سارنگ اور رن مل سوڈھو اور مخدوم بلاول کی قیادت میں ایک بڑا لشکر تیار ہوا۔ شاہ بیگ نے اس دوران شال سے تازہ دم لشکر منگوایا۔ سندھیوں نے بہادری سے ان کا مقابلہ کیا مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ ارغون تین دن تک ٹلٹی کا شہر لوٹتے رہے اور جدا جدا قبیلوں کے لوگ قتل کیے۔

جب جام صلاح الدین کو پتا لگا کہ وہ سندھ کو آزاد کرانے کے لئے جاڑیجوں، سوڈھوں، سموں اور کنگھاروں کا ایک بڑا لشکر ساتھ لیکر سندھ کے لئے روانہ ہوئے۔ مگر جب یہ بات جام

فیروز تک پہنچی تو ان کو جام صلاح الدین کی مدد چاہیے تو اس نے الٹا ارغونوں سے مدد لی چنا چہ ٹھٹھہ کے نزدیک جام صلاح الدین کے لشکر کو فیروز اور ارغونوں کے مشترکہ لشکر نے شکست دے دی۔ صلاح الدین اور اس کا بیٹا ہیبت خان ارغون کے ہاتھوں مارے گئے۔

اب سندھ پر ارغون کا قبضہ مضبوط ہوا۔ وہاں سے فارغ ہوکر شاہ بیگ بکھر اور سیوستان روانہ ہوا۔ ارغون لشکر جب صلاح الدین سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوا تو دھاریجو نے قلعہ میں بند ارغونوں کو تکالیف دیں۔ شاہ بیگ نے واپس آ کر رات میں ان سب لوگوں کو قتل کرا کے انھیں برج کے نیچے پھنکوا دیا جو خونی برج کے نام سے مشہور ہے۔

شاہ بیگ نے اس ایک سال کے عرصہ کے مہم جوئی میں کئی لوگوں کو قتل کیا۔ بہت نقصان پہنچایا بہت دولت لوٹی۔ جب شاہ بیگ کو پتا چلا کہ بابر بادشاہ ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو خوف کے سبب اس کا دل ٹوٹ گیا اور 1524ء میں فوت ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسن ارغون سندھ کا بادشاہ ہوا۔ شاہ حسن نے جلد ہی ٹھٹھہ پر حملہ کیا کیونکہ اب ان کو فیروز کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ فیروز اس مرتبہ بھی کچھ کے طرف بھاگ گیا۔ شاہ حسن نے ٹھٹھہ میں داخل ہوتے ہی قتل عام کا حکم دیا۔ اور اتنی حد تک قتل وغارت کی گئی کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے بچے قتل کر دیے گئے۔ کئی عورتوں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔ جو بچ گئیں ان کو انتہائی تکالیف دی گئیں۔ جام فیروز کچھ سے بڑا لشکر لیکر سندھ کی طرف آیا۔ سندھیوں اور ارغونوں کے درمیاں آخری بڑی لڑائی تھی۔ بیس ہزار سپوت کام آ گئے اور فیروز واپس کچھ کی طرف روانہ ہوا۔ گجرات میں اس نے اپنی بیٹی سلطان بہادر کے نکاح میں دی سلطان بہادر کی مدد سے فیروز سندھ پر دوبارہ حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ کہ ہمایوں اور بہادر کے درمیاں جنگ ہوگئی۔ بہادر نے شکست کھائی اور ہمایوں کے حکم سے فیروز کو قتل کر دیا گیا۔ مرزا شاہ حسن چھ ماہ تک ٹھٹھہ میں سموں کے ساتھ نہایت ذلت آمیز سلوک کیا۔ پڑھے لکھے لوگ، سپاہی اور سرداروں کو جنگل کی طرف بھیجا گیا کہ وہ کسان بن جائیں۔ غلامی کی صورت میں ان کو زندہ رہنے پر مجبور کیا گیا۔ انحرافی کی سزا قتل تھا۔ نتیجے میں کئی لوگ کچھ، کاٹھیاواڑ، گجرات اور عرب کی طرف چلے گئے۔

سمہ کے دوَر میں سندھی خواتین کی حالت

سمہ دوَر حکومت میں کئی عورتوں کے نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ جس سے محسوس ہوتا ہے کہ سمہ کو عورتوں کے لیے نہایت ادب واحترام تھا اور عورتوں کے لیے نرمی والا رویہ رکھتے تھے۔

سمہ دوَر حکومت میں سب سے پہلے نوری کا نام نظر آتا ہے۔ وہ ایک مچھیرن تھے۔ مگر بادشاہ وقت جام تماچی نے ان کو اپنی پٹ رانی بنایا۔ عزت واحترام کے اس درجے پر پہنچایا کہ وہ تاریخ ان مٹ ورق بن گئی۔

اس طرح جام نندو کی بیوی مرینہ، ماچھیانی بھی سندھ کی تاریخ میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ جام نندے کی وفات کے بعد سندھ کی حکومت اس کے اپنے بیٹے جام فیروز کو ملی۔ جام فیروز نے اس زمانے کے مشہور سپہ سالار دولہہ دریا خان سے تعلقات خراب کر لیے۔ جس کے نتیجے میں گجرات سے جام صلاح الدین حملہ آور ہوا۔ اور آٹھ ماہ تک راج کیا۔ یہ صورتحال دیکھ کر 1512ء میں ز جام فیروز کے والدہ مدینہ ماچھیانی دریا خان کے پاس بیٹے کے ساتھ اس کی جاگیر گاہ میں گئی۔ دریا خان نے اس کی آمد کا احترام کرتے ہوئے جام فیروز کا ساتھ دیا اور اس طرح جام فیروز نے دو بارہ سندھ پر حکومت کی۔

سمہ دوَر میں یہ بھی دیکھا گیا کہ سیاسی مصلحتوں کے بنا پر اور خود کو مضبوط بنانے کے لئے حکمرانوں نے اپنے لڑکیوں کی رشتہ داریاں گجرات کے سلطانوں کے ساتھ کیں۔ گجرات والوں کے ساتھ ان کے پرانے دوستانہ تعلقات تھے جس کو مضبوط کر کے رشتے داری کا روپ دیا۔ گجرات والے بھی غیر مسلم تھے۔ اور سورج ونسی شاخ سے ان کا تعلق تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جام تغلق جام جونو کا نام نظر آتا ہے۔ جس نے اپنے مرشد مولانا محمد صدیق ملتانی کے کہنے پر اپنی دو بیٹیاں گجرات بھیجیں۔ یہ وہ دوَر تھا جب ایک طرف بیرونی حملہ آوروں کا خطرہ تھا اور دوسری طرف اندرونی اختلاف تھا۔ جام جونو نے اپنی بیٹیاں اپنے بیٹوں جام خیر الدین اور جام صلاح الدین اور اپنے مرشد کے ساتھ گجرات بھیجیں۔

1442/43ء میں بی بی مغلی کی شادی گجرات کے حاکم سلطان محمد کے ساتھ ہوئی اور بی بی مرکی کے شادی عالم دین شاہ عالم سے ہوئی۔

1445/46ء میں بی بی مغلی کے بیٹا ہوا جس کا نام فتح خان رکھا گیا۔ 1451ء میں سلطان محمد فوت ہو گیا۔ وہاں کے امیر سلطان قطب الدین کی خواہش تھی کہ کسی بھی طریقے سے فتح خان کو قتل کرایا جائے۔ اس صورتحال میں بی بی مغلی نے اپنے بہن بی بی کے پاس پناہ لی۔

مگر بی بی مرکی کے ساتھ بھی زندگی نے وفا نہ کی اور اس صورتحال میں بی بی مغلی نے اپنے بہنوئی شاہ عالم سے نکاح کیا اور اس لیے اپنے چچا فیروز سے اجازت طلب کی جس نے اس کو اجازت دی۔ اس وقت فتح خان کی عمر نو یا دس برس تھی۔ اس مثال سے محسوس ہوتا ہے کہ سموں کے پاس بیوہ کے ساتھ شادی کو عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

گجرات کے حاکم قطب الدین کی وفات کے بعد اس کا بھائی داؤد حاکم ہوا۔ مگر امیروں نے اسے سال کے اندر قتل کرا دیا اور فتح خان کو سلطان محمود کو لقب دے کر 1459ء میں گجرات کے تخت پر بٹھایا۔ اس وقت اس کی عمر چودہ برس تھی۔ اور اس نے اپنی والدہ کے مشورے سے حکومت چلائی۔ اور اپنی والدہ کی یاد میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جو بھوڈیسر میں ہے۔

اس طرح 12-1511ء میں سمہ شہزادی بی بی رانی کی شادی گجرات کے حاکم سلطان مظفر سے ہوئی۔ بی بی رانی سلطان صدرالدین جام سنجر کی پوتی تھی۔ بی بی رانی کے ساتھ سلطان کو بڑی محبت تھی۔ بی بی رانی کو سلطان کے ذہن اور سلطنت کے معاملات پر کامل قبضہ تھا۔ بی بی رانی نے وفات کے وقت اپنی بیٹی سکندر کو اپنے خاص غلام خوشقدم عمادالملک کے حوالے کیا۔ تخت پر بٹھانے کے بعد خوشقدم کو وزارت بھی ملی۔ جس وجہ سے اس نے دو مہینوں اور اٹھارہ دنوں کے بعد سکندر کو قتل کیا۔ بی بی رانی کی ایک بیٹی بی بی عائشہ، فتح خان بن سلطان فیروز سمہ کی بیوی تھی اور دوسری بی بی رتنیہ سلطان عادل شاہ فاروقی سلطان پورہ والے کی بیوی تھی اور سلطان مظفر سمہ کی ایک بیٹی جو کسی راجپوت بیدی سے تھی وہ ہیبت خان بن صلاح الدین سمہ کی بیوی تھی۔ صلاح الدین بی بی رانی کا چچازاد بھائی تھا۔ جام فیروز سے کی گئی جنگ میں مظفر نے صلاح الدین کا ساتھ دیا۔

جام فیروز بن جام نندو مسلسل جنگوں اور حملوں کے باعث گجرات میں امان لیتا رہا۔ وہاں پر بھی اس نے اپنی ایک بیٹی سلطان بہادر بن سلطان مظفر کو دی ہوئی تھی وہاں فیروز سلطان بہادر کی مدد سے جنگ کی تیاری کر رہا تھا کہ ہمایوں اور بہادر کے درمیاں جنگ ہوگئی۔ جس میں بہادر مارا گیا اور ہمایوں کے حکم سے جام فیروز کو قتل کیا گیا۔ جب کہ جام فیروز کی دوسری بیٹی شیخ ابراہیم کے

نکاح میں دی گئی تھی۔شیخ ابراہیم شاہ حسن کے حملے میں مارا گیا۔

ان مثالوں سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ سمہ شہزادیوں کا اپنے شوہروں پر اثر تھا۔1472ء میں سلطان محمود بیگڑو کچھ سے گذر رہا تھا کہ اس کو خبر ملی کہ کچھ باغی سلطان جام نظام الدین کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے والے ہیں۔سلطان نظام الدین نے شکریہ کا خط تحائف کے ساتھ معہ اپنی بیٹی گجرات بھیجا جس کی شادی حسن خان کے پوتے قیصر خان کے ساتھ ہوئی جس نے اس زمانے میں گجرات میں پناہ لی تھی۔سلطان محمود بیگڑو نے اس دور میں جاڑیجا ہمیر سے اپنے حرم کے لئے بیٹی لی۔

سمہ دور میں مغلوں اور ارغونوں نے ٹھٹھہ پر حملے کئے۔جنھوں نے یہاں کی عورتوں کے ساتھ سخت غیر انسانی اور وحشیت والا سلوک کیا۔جب کہ مغل ارغون اپنی آپ کو اسلام کا علمبردار کہتے تھے۔انھوں نے نہ صرف عورتوں کی عزتیں لوٹیں مگر حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے ہونے والے بچے تلواروں کی نوک پر لٹکائے۔عورتوں کی ناک اور کانوں سے زیور اتارے گئے،اور ان کے ساتھ سخت ناروا سلوک کیا گیا۔جس کی گواہی تاریخ دیتی ہے۔مگر سمہ دور میں اس قسم کی کوئی روایت نہیں ملتی۔

سمہ دور کی سماجی اور ثقافتی حالت کا جائزہ

مذہبی رویے:

سمہ دور میں سندھ کے اندر جو رویے نظر آتے ہیں،تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سمہ نہایت دیندار اور کامل مسلمان تھے۔پیروں فقیروں اور اولیاء کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔اُچ اور ملتان کے مشائخ ان کے مرشد تھے۔جن کے مشوروں پر وہ بڑے بڑے کام سرانجام دیتے تھے۔مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاری بابینہ ثانی اور جام جونو اول جو فیروز شاہ تغلق سے صلح اور دوسری مرتبہ اس کے ہی کہنے پر جام تماچی کا اپنے بیٹی کے ساتھ غیر مشروط طور پر دہلی جانا اور جام جونو کا واپس آنا ایسے واقعات ہیں جو اولیاؤں کے لیے ان کی عقیدت کا ثبوت ہیں۔نہ صرف یہ مگر جام تغلق کا اپنے ملتانی مرشد مولانا محمد صدیق کے کہنے اور مرضی پر گجرات میں رشتے داری کرنا۔ان کی اس محبت کے پیش نظر چار چاروں کی چونکڑی کے نام سے قاضی شکر اللہ شیرازی،سید منبہ،سید

کمال اور سید عبداللہ ٹھٹھہ میں آئے اور ارغونوں کی حکومت سندھ میں قائم کرنے کی کوشش کی۔ اور سموں کے ساتھ غداری کی، باوجود اس کے وہ پیروں اور اولیاء کو بے انتہا عقیدت دیتے تھے۔ مگر یہاں کے لوگوں میں بنیاد پرستی اور تعصب نہیں تھا۔ رسوم ورواج ایک جیسے تھے خاص طور سندھ کے صحرائی خطے تھر میں اس زمانے میں رہنے والی سومرو، کلہوڑہ اور سوڈھو ذاتیں جن کے طور طریقے ہندوؤں جیسے تھے۔ اس کے سوا کچھ کے میمن جو شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے طور طریقے ہندوؤں جیسے تھے۔ گوشت نہیں کھاتے تھے اور مسلمانوں سے نہایت محبت سے رہتے تھے۔

پدرسری خاندانی روایت:

دنیا کے دوسرے لوگوں کی طرح سمہ دَور میں بھی پدرسری سماجی سرشتہ موجود تھا اور وہ لوگ اپنی باپ دادا کے ناموں سے عقیدت رکھتے تھے۔ یعنی ان ناموں کو اپنی اولاد پر رکھتے تھے۔

تقریبات:

سمہ دَور حکومت میں اجتماعی تقریبات کے منظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ خاص طور پر جام نندو کے دَور حکومت میں۔ ٹھٹھہ کا عروج دیکھنے والا تھا، ہر ماہ کے پہلے پیر کو لوگ روٹیاں اور کھانا باندھ کر مکلی جاتے تھے۔ آپس میں بیٹھتے تھے، کچھ درگاہوں پر سماع کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ اس پیر کو ان دنوں ''شیخ پیر'' کہتے تھے۔ اس کے سوا چاند کی چودھویں رات پر بھی مکلی پر خاص رونقیں ہوا کرتیں تھیں۔

کاروبار و تجارت:

جام نندو نے ٹھٹھہ کو نئے طرز پر منصوبہ بندی کے ساتھ تعمیر کروایا۔ یہ شہر احمد آباد کی طرح علم و ہنر کی وجہ سے ایشیا کے اہم تجارتی مراکز میں شمار کیا جانے لگا۔ ملک کے کونے کونے سے کاریگر اور ہنرمند افراد یہاں آ کر جمع ہوگئے۔ دیسی اور ریشمی کپڑوں کے کارخانے یہاں قائم ہوگئے۔ لاکھ، کپڑا اور عاج کا بنا ہوا سامان باہر بھیجا جاتا تھا۔ چیزوں کا بھاؤ مقرر تھا۔ ڈاکوؤں اور رہزنوں کو یہاں سے بھگایا گیا تھا۔ جام سنجر نے اپنے دَور میں سرکاری ملازموں کے تنخواہیں بڑھا کر رشوت

خوری کی لعنت کو بند کیا تھا۔

سید مراد شاہ شیرازی کے رسالے قطبیہ میں احوال ہے کہ ایک مرتبہ وہ کسی بیابان سے گذر رہا تھا، تو ایک قبر سے ایک شخص نکلا اور اس نے کہا کہ مجھے لٹیروں نے لوٹ کہ شہید کر کے یہاں پر پھینک دیا۔ میرے بال بچے گجرات میں میرا انتظار کر رہے ہونگے۔ حاکم وقت کو کہو کہ میری ساتھ انصاف کرے، شاہ صاحب نے یہ اطلاع حاکم وقت کو دی اس نے لٹیروں کو پکڑا اور مال گجرات بھیجا۔

ایسا ہی ایک واقعہ خیر الدین جام تماچی کے وقت میں نظر آتا ہے کہ ایک جگہ پر ہڈیوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا، معلوم کرنے پر پتا چلا کہ سات سال پہلے ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ایک قافلے کو لوٹا اور ان کو قتل کر کے یہاں پھینک دیا جام تماچی نے ڈاکوؤں کو پکڑ وایا اور ان کو گجرات کے حاکموں کے حوالے کیا کہ ان کو سزا دیکر مال ان کے وارثوں کے حوالے کیا جائے۔

ڈاک کا نظام:

اس زمانے میں ابن بطوطہ سندھ میں آیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق سیوھن سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دہلی تک 50 دن کا راستہ ہے۔ مگر بادشاہ کو پانچ دن کے اندر خبریں مل جاتی تھیں۔ گھوڑے سوار ڈاکیے کو ''اولاق'' کہتے ہیں ڈاکیہ بارہ میل بعد گھوڑا تبدیل کرتا تھا۔ پیدل چلنے والے ڈاکیے کو ''ہرکارہ'' کہتے تھے، ڈاک کے نظام کو ''برید'' کہتے تھے۔

زبان:

سومرہ دور میں سندھی زبان میں بیان کو وسعت ملی، یہ کہانیوں اور ادبی صلاحیتوں کی نشونما والا دور تھا۔ جس میں جنگوں اور واقعات کے بیت اور عشقیہ داستانیں مشہور ہوئیں۔ سندھی شاعری رزمیہ نظموں میں چمکی، سمہ دور میں اس تعمیر کی زیادہ تکمیل ہوئی۔ سمہ دور کے شروعات میں سندھی زبان کی خصوصیات و روایات تو سومرہ دور والی رہیں۔ البتہ قوت بیان میں زبردست اضافہ ہوا، اور لغت کے سرمائے میں وسعت پیدا ہوئی۔ داستان اور قصے قصہ گو ''چارنوں'' (فقیر گائک) نے ادبی فن کے اعلیٰ اور معتبر درجہ پر پہنچایا گیا۔ تعلیمی اور سرکاری زبان کے حوالے سے بلوچ صاحب کا

بیان ہے کہ عربوں کے حکومت کے بعد سومروں کے دوُر حکومت میں بھی غالباً عربی سرکاری زبان رہی۔اور عربی کے ذریعے تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔سمہ قبیلوں نے جیسے کہ شروع سے ہی دین اسلام قبول کیا تھا، اس لیے سموں کے عہد میں بھی عربی سلسلہ تعلیم رائج تھا۔سمہ حاکموں نے ذاتی طور بھی درسی کتاب لکھانے کی کوشش کی۔مگر بعد میں فارسی زبان نے بھی سرکاری زبان کا درجہ حاصل کیا۔ کیونکہ دہلی کے حکمرانوں کا اثر سندھ پر پڑا۔اور ان سے سندھی حکمرانوں کی خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔

علم وادب کے مرکز اور عالم:

سمہ سلطان شرع کے پابند تھے، سمہ سلطان اُچ کے گیلانی ، بخاری اور ملتان کے سہرودی مشائخ کے مرید تھے۔ سندھ میں حنفیت کا زور تھا ویدانیت اور وحدانیت کے فلسفوں کا ایک دوسرے پراثر تھا۔صوفیوں کی روحانی تبلیغ اور تلقین کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشترکہ ہوا۔
اونچ نیچ کہ بندھن یہاں پر اتنے شدید نہیں تھے جتنے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں تھے۔ٹھٹہ میں علم اور ادب کے باقاعدہ مراکز قائم کیے گئے۔ نہ صرف ٹھٹہ بلکہ بکھر، سیوھن اور کاہان میں تعلیمی مرکز تھے۔ بوبک اور ٹلٹی میں عالم، قاضی اور درویش رہتے تھے۔
سمہ سلطانوں سے پہلے مدارس مساجد میں قائم تھے، مگر سموں کے بعد مدرسوں کے لیے جدا عمارتیں تعمیر کی گئیں، اور اس زمانے میں سندھ میں مدارس کی تعداد چار ہزار سے زیادہ تھی۔
سلطان نظام الدین کا چھوٹا بھائی بایزید خود عالم تھا اور علماء کا قدردان تھا جام نندو کی بی النفاقی کے باعث ملتان کے لانگاہ حاکموں کے پاس آیا جنھوں نے ان کو شورکوٹ اور چھوٹی بھائی ابراہیم کو اُچ کا پرگنا جاگیر کے طور پر دیا۔مخدوم بلاول اس دوُر کا عالم اور درویش تھا۔ جو سموں کے لشکر کا بڑا حامی تھا۔اور جس کو ارغونوں نے کفر کا الزام لگا کر چکی میں ڈلوایا۔مخدوم بلاول ٹلٹی کا بڑا عالم اور کامل بزرگ تھا۔علم حدیث کا بڑا عالم اور تفسیر کا بڑا ماہر تھا۔کبھی کبھی موزوں شعر بھی کہتا تھا۔
سید جلال محمود ثانی بن سید علی اول تفسیر اور فقہ کا بڑا جید عالم اور حافظ تھا۔
شیخ عیسیٰ لنگوٹی بند جو اصل میں (سی۔پی) ہند کا تھا۔جام نندو کے زمانے میں سندھ میں آیا تھا۔مکلی پر روحانی درس دیتا تھا، شیخ حماد جیلانی ساموئی میں خانقاہ کے اندر درس دیتا تھا۔ وہ سارا

وقت اپنے حجرے میں چہرے پر کپڑا ڈالے رہتا تھا، اس کا ایک بیت ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے کتاب میں درج کیا ہے۔

جونومت اونو، جام تماچی آءُ
سبا جھے باجھ پئی، توسیں ٹھٹوراءُ

(مطلب یہ کہ جام جونو کی عقل اڑگئی ہے اس لیے اے جام تماچی تم آ ؤ تو ہماری کوئی بات بنے اور تم ہی ٹھٹھہ نگر کی بادشاہی کے لائق ہو۔)

قاضی عبداللہ بن تاجیہ اصل سیوھن کے قاضیوں میں سے تھا، جام نظام الدین کے زمانے میں اس کی لاش مکلی سے ظاہر ہوں۔ بزرگوں نے خواب میں اس کے مدفن کا نشان دیکھا اور کسی کو اشارا ہوا اس کی جنازہ نماز وہ شخص پڑھائے جو ہر وقت وضو میں رہا ہو۔ اور خود اس نے اپنی شرم گاہ کبھی نہ دیکھی ہو۔ ایسا آدمی فقط جام نندو تھا جس نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی ان کے سوا مولانا ظہیر الدین بکھری مولانا برہان الدین، خطیب بغدادی، قاضی ڈنو سیوھانی، مخدوم اسحاق بھٹی، مخدوم احمد، مخدوم محمد سخی جام ڈاتار، سخی داد واہی، خلیفو وہیوں، درویش سیہڑو، شیخ ہریہ ویرداس، شیخ طاہر، پیر پٹھو، مخدوم عبدالباقی، سید حیدر سنائی بھی سمہ دور کے مشہور عالم اور بزرگ تھے۔

❋

سکھر بیراج کی تعمیر اور اس کی اقتصادی اہمیت

پروفیسر اعجاز قریشی

سندھ میں زراعت گذشتہ کئی دہائیوں سے مصنوعی نہروں سے کی جاتی رہی ہے۔ انگریزوں کی آمد (1843ء) کے بعد ان نہروں کی حالت بے حد ابتر ہوگئی تھی' کیونکہ اس شعبہ سے وابستہ افسر شعبہ سے ناواقف تھے۔ سرچارلس نیپیر نے فتح سندھ کے بہت جلد بعد آبپاشی کھاتہ ترتیب دیا' جو کہ لیفٹیننٹ کرنل والٹر اسکاٹ کی نگرانی میں منظّم کیا گیا۔ اس کے ماتحت کوئی انجینئر نہ ہونے کی وجہ سے یہ کھاتہ فعال نہ ہوسکا' اس لیے یہ ادارہ 1849ء میں ختم ہوگیا اور 1855ء تک ویسا ہی رہا' جب تک کہ جنرل فائیف نے حکومت کے سامنے نہروں کی بہتری کے لیے کچھ سنجیدہ تجاویز پیش نہ کیں۔ موصوف نے صوبے کی ساری نہروں کو دوبارہ ترتیب دینے کے لیے ایک رپورٹ پیش کی جو کہ ان دنوں کے کینال سسٹم پر روشنی ڈالتی ہے اور بہت حد تک اس کا حوالہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ سندھ میں کینال دریا کی ڈھلوانی رخ میں رکھے جاتے تھے تاکہ پانی کی زیادہ مقدار حاصل کی جا سکے۔ ان کی چوڑائی 10 سے 100 فٹ تک اور لمبائی 4 سے 10 فٹ تک ہوتی تھی۔ ان میں سے کسی کا بھی سرا دریا کے مستقل کنارے کے ساتھ نہیں لگتا تھا۔ ان میں سے کسی میں بھی اتنی گہرائی نہ تھی وہ دریا کی تلہٹی سے سیلاب کے علاوہ پانی لے سکے۔ دریا میں سے وہ تب پانی لے سکتے تھے جب وہ بہت اوپر آتا تھا' نہروں کا رخ عمومی طور پر اچھا تھا۔ لیکن Meandering Pattern کی وجہ سے ان کا بہاؤ اچھا نہ تھا ان کی شکل غیر مستقل تھی اور ان کی ڈھلان بھی غیر مستقل تھی کہیں کہیں وہ ایک فٹ ایک میل کے حساب سے تھا ورنہ عام طور پر تین یا چار انچ فی میل کے حساب سے ہوتا تھا۔ دراصل ان کی مشابہت نہروں سے زیادہ پانی کی قدرتی گزرگاہوں سے کی جاسکتی

تھی، بہت سی جگہوں پر وہ سبھی دریائے سندھ کی، سیلاب کی وجہ سے گاد سے اٹی ہوئی شاخیں تھیں جن کو صاف کر کے کھولا گیا تھا، سبھی نہروں میں بڑی بڑی خامیاں تھیں، ان میں پانی لینے کی باقاعدہ صلاحیت نہ ہوتی تھی، تیز بہاؤ کے حالت میں کبھی بہت پانی لیتے تھے اور کبھی کم کیونکہ ان کے دہانے مٹی سے ہمیشہ بند ہو جاتے تھے۔

- فائیف نے آب رسانی کے نظام کو زمین کے ڈھلان کے حساب سے تین اقسام (Heads) میں تقسیم کیا ہے۔

1- وہ زمین جس کو بغیر مشینری کے پانی پہنچایا جا سکے۔

2- وہ زمین جس کو مشینری کی مدد سے پانی پہنچایا جا سکے، جب نہروں میں پانی کی سپلائی کم ہو جبکہ تیز بہاؤ کے وقت میں ان میں پانی زیادہ ہوتا ہے۔

3- جو زمین بہت نیچے ہے، اگر کینال کے تین حصے بھرے ہوئے ہیں تو وہ مشینری کے علاوہ بھی آباد ہو سکے۔

پہلی حالت میں آبادکاروں کو 15 مئی تک اپنے مال مویشی اور مزدور تیار حالت میں رکھنے پڑتے ہیں۔ تاکہ وہ نار کے ذریعے پانی کھینچ کر زمین کو آباد کر سکیں۔ جیسا کہ پانی کا دارومدار سیلاب پر ہوتا ہے۔ وہ تین چار سال مسلسل کبھی بھی متوقع وقت پر نہیں آتا، جیسے ہی پانی آتا ہے تو اس کے کم ہونے تک کام جاری رکھا جاتا ہے، دوسری بار پانی کی سطح بلند ہونے پر پھر سے کام شروع ہوتا ہے لیکن ہوتا سست رفتار سے ہے۔ کھیتی باڑی کے لیے مزدوروں اور بیلوں کی ضرورت ہوتی ہے اور زمیندار کے لیے مشکل ہوتا ہے کہ وہ مزدوروں اور بیلوں کا خرچہ برداشت کر سکے، سخت زمین کی آبیاری لازم ہوتی ہے جب تک وہ ساری زمین آباد کرے تب تک کاشتکاری کا بہتر وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

دوسری حالت میں کچھ پانی مشینری کے ذریعے دیا جاتا ہے اور، اور کچھ سیلاب کے ذریعے آبادکار، مزدوروں اور بیلوں کو زیادہ انتظار کرنا پڑتا ہے، جیسے پہلی حالت میں ہم نے دیکھا کہ ان کا کام پانی آنے پر شروع ہوتا ہے، پانی اگر اتر جائے تو ان کو دشواریاں درپیش ہو جاتی ہیں۔ اگر دریا تین یا چار انچ اترتا ہے تو نہر ایک فٹ تک اتر جاتی ہے، کیونکہ اس کا دہانہ مٹی سے بھرا ہوتا ہے، پانی اٹھانے کے علاوہ زمین کو دینا دشوار ہوتا ہے، نار کے ذریعے کاشت شدہ فصل کو پانی دینا مشکل ہوتا

ہے اور فصل خشک سالی کا شکار ہو جاتی ہے۔

تیسری حالت میں جب زمین مشینری کی مدد کے علاوہ آباد کی جاتی ہے تو ایسی صورت میں وہاں آبادکار پانی کی سطح کم ہونے کے بعد زمین آباد کر سکتا ہے' اسی اثناء میں زیادہ تر موسم گزر چکا ہوتا ہے اگر وہ جوار یا باجرہ کاشت کرتا ہے تو اس کی فصلوں کو پت روگ تباہ کر دیتا ہے۔

کہا یہ جاتا تھا کہ اس نوعیت کی آبپاشی دو اقسام کے خطروں میں رہتی تھی' ایک تو پانی کی سطح وقت سے پہلے کم ہونا شروع ہو جائے' اگر تین یا چار انچ پانی کی سطح کسی کینال سے گر جائے تو فصل کو پانی دینا ممکن نہیں ہوتا تھا اور یہ کہ کبھی کبھی توقع سے زیادہ پانی آ جاتا اور وہی پانی نہروں میں بھی زیادہ آ جاتا تھا' جس کی وجہ سے نہروں کے کنارے ٹوٹ جاتے تھے اور زمین پانی میں ڈوب جاتی تھی جس سے یا تو ساری فصل یا اس کا کچھ حصہ تباہ ہو جاتا تھا۔

ایسے حالات میں زراعت کو بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا جو پانی کی غیر مستقل روانی کے سبب پیدا ہوتے تھے۔ اگر کوئی آبادکار ایک سال زیادہ اچھی فصل اٹھاتا تھا تو دوسرے سال پھر اس کو خشک سالی کا سامنا رہتا تھا۔ زیادہ یا کم پانی کی صورتحال کے سبب کبھی موسم سے پہلے پانی کا آنا اور کبھی موسم کے بعد اور کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی تھی کہ نئے موسم میں فصل کتنی مقدار میں ملے گی۔ زراعت جو کہ خوراک کے لیے ضروری ہے اور کھانا زندگی کے لیے' اس کو وقت پر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے زراعت کے ارتقاء میں غریب کسانوں اور خانہ بدوشوں کا اہم کردار رہا ہے لیکن یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے جب کہ زرعی مقاصد حاصل کرنے کے لیے فصلوں کو سبھی موسموں میں پانی دستیاب ہو اگر ہم اسی نقطہ نظر کی روشنی میں برصغیر' مصر اور دنیا کی دوسری زراعت پر انحصار کرنے والی اقوام کو دیکھیں تو ان کی زراعت کے لیے مصنوعی پانی کی مناسب مقدار اسکیموں کے وسیلے مہیا کی جاتی رہی ہے' اس لیے اقتصادی ترقی' ثقافتی ہم آہنگی اور بہتر زندگی کے لیے فصلوں کو پانی کی یقینی بہتاب اور فراوانی ضروری ہے۔

وادیٔ سندھ میں دریائے سندھ بہتا ہے' جس کے اتار چڑھاؤ نے تہذیبوں کو جنم دیا اور زوال پذیر کیا۔ سندھ تاریخی طور پر زرعی خطہ رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ یہاں کوئی بھی سنجیدہ اور باترتیب کوشش نہیں کیہ گئی کہ دریائے سندھ کے پانی کو اس طرح استعمال کیا جائے

کہ وہ باشندگان سندھ کے لیے مجموعی طور سے خوشحالی اور شادابی کا پیغام لائے۔ تاریخی طور پر برصغیر میں جدید ٹیکنالوجی کی واقفیت اور مقبولیت کا سہرا برطانوی راج کے سر پر ہے۔ سال 1855ء میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ فائیف اور دوسرے آبپاشی کے ماہرین نے آبپاشی کے نظام کا باریک بینی سے جائزہ لیا تاکہ اس کو جدید سائنسی بنیادوں پر استوار کر کے پانی کی فراہمی کو مستقل بنیادوں پر یقینی بنایا جائے اور وہ سندھ کی ترقی کا ضامن ہو سکے۔ ان کی رپورٹ پرانی روہڑی اور حیدرآباد کینال کے متعلق ہے۔

فائیف کی یہ رائے تھی کہ سندھ حکومت ہر سال فصلوں پر محصولات کی وجہ سے 31 لاکھ روپے خسارہ میں جاتی ہے' کیونکہ آبپاشی کے نظام میں بہت سے نقصانات ہیں۔ فائیف کی سوچ کے مطابق یہ ضروری ہے کہ:

1- موجودہ نہروں کی صفائی کی جائے اور ان کو گہرا کیا جائے۔

2- نہروں کے دہانے دریا کے مستقل کنارے پر بنائے جائیں۔

3- پانی کی رفتار اتنی ہو کہ وہ مٹی کو بہا لے جائے۔

4- کینال کا ڈھلوان اس طرز کا ہو جو مٹی کو بہا لے جانے کے ساتھ ساتھ 30 میل تک زمین بھی آباد کر سکے۔

اس تجویز کے خاص نکات حکومت کو قبول نہ ہوئے' فائیف کے پاس نہروں کو دائمی بنیاد پر چلانے کے لیے مزید قیمتی خیالات تھے' مگر اس عرصہ کے دوران کسی بھی کینال کی تعمیر کا کام شروع نہیں کیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ برطانوی حکومت نے موجودہ آبپاشی نظام کو برقرار رکھا۔ 30 سالوں تک فائیف کی تجاویز پر کوئی بھی سنجیدہ غور و فکر نہ کیا گیا۔

19 ویں صدی کے اواخر میں سندھ کی آبپاشی کو درپیش دشواریوں میں ہمیں دو نقطہ ہائے نظر ملتے ہیں' کچھ لوگوں نے اس بات کی تائید کی کہ سندھ ایک ایسا ملک ہے جہاں سیلاب ہمیشہ سے آتے رہے ہیں' پانی زیادہ مقدار میں موجود ہے۔ اس لیے وہاں ان نہروں کی تعمیر اور مرمت کی جائے' جو سیلاب کے ذریعے پانی لیتی ہیں' دوسرے مکتب فکر کے ماہرین کی رائے تھی کہ موجودہ نظام میں شروع سے بہت سی خامیاں موجود ہیں' جس کا علاج ممکن نہیں' اس لیے دائمی بہنے والے نہروں کی از سر نو تعمیر کی جائے۔ 2 ملین ہیکٹر زمین کو اس زمانے کے نظام کے تحت جو پانی ملتا تھا' جو

کبھی وقت پر آتا تھا کبھی نہیں، اس کو یقینی بنایا جائے، ان کا یہ بھی مقصد تھا کہ آبپاشی کے تحت آنے والی آباد زمین کی تعداد کو بڑھایا جائے۔ لیکن ان تجاویز کو 1920ء تک کوئی بھی سنجیدہ اہمیت نہیں دی گئی اور نہ ہی ان تجاویز کا مطالعہ کیا گیا، اس سے قطعہ نظر نظام کو کچھ بہتر بنانے کے لیے اقدام لیے گئے۔ 1905ء تک سندھ میں موجود سبھی نہروں کی لمبائی 7741 میل تھی اور ان سے جو زمین آبادی کے لائق تھی وہ 95,37,670 ہیکٹر تھی لیکن حقیقت میں جو زمین آباد ہوئی تھی 92.25.92909ہیکٹر تھی۔

1880ء سے 1900ء تک سندھ میں آبپاشی کے بہت سے سروے کیے گئے، 1882ء میں بمبئی حکومت نے ایک کمیٹی کا تقرر کیا جس نے سیلاب پر دارومدار رکھنے والی نہروں کی مخالفت کی، کیونکہ ان کی تعمیر پر بہت خرچہ آتا تھا۔ لیکن بمبئی حکومت ان کی رپورٹ سے مطمئن نہ ہوئی اور اس نے (Perinnial System) تحت چلنے والی نہروں کی تعمیر کی حمایت کی۔ جب کہ انڈین اریگیشن کمیشن 1903-1901ء جس نے سندھ کی آبپاشی کو بمبئی کمیٹی کے بعد مطالعہ کیا۔ اس نے بمبئی گورنمنٹ کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا، لیکن اس کی جگہ پر انہوں نے تین رخوں والا پروجیکٹ پیش کیا۔ جس کے مطابق ایک بیراج تعمیر کیا جائے جس کے دائیں اور بائیں حصوں سے نہریں نکالی جائیں۔ کمیشن پراجیکٹ کو قابل عمل قرار دیا۔ لیکن انہوں نے کچھ دشواریوں کی نشاندہی بھی کی، جو کہ نہروں کی اہمیت کو کس قدر کم کرتی تھیں۔ رپورٹ میں کمیشن نے وکالت کی کہ موجودہ نہروں کی کارکردگی بڑھائی جائے اور ان کے نقصانات کم کیے جائیں۔ انہوں نے لکھا کہ دریائے سندھ پنجاب کے سب دریاؤں کے پانی پر مشتمل ہے اور فطری طور پر بارش کے موسم والی نہروں کے لیے وہ پانی غیر یقینی ہے اور اس پر جو دوسری نہریں ہیں، پانی آنے کے لحاظ سے ایک بہتر سال اور خراب سال کے بیچ میں پانی کا فرق کم نوٹ کیا گیا ہے۔ سندھ کے تین اہم نہروں میں سے سکھر اور پھلیلی نہروں کے درمیانے درجے کی مستقل سپلائی ہے۔ جو فی الحال ان کی ضروریات کو پورا کرتی ہے، لیکن اگر پانی کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے تو ان کی صلاحیت کو بڑھایا جاسکے گا۔

اس کے علاوہ کمیشن کا یہ بھی نقطہ نظر تھا کہ جیسا کہ سندھ آبادی کے حوالے سے گنجان آباد علاقہ نہیں اور نہ ہی یہ خشک سالی کی لپیٹ میں آنے والا علاقہ ہے۔ اس لیے اتنی جلدی نہیں کہ یہ نہریں تعمیر کی جائیں۔ لیکن انہوں نے یہ اشارہ ضرور دیا کہ پنجاب میں تعمیر ہونے والی نئے مستقل

نہریں دریائے سندھ کو متاثر کریں گے' اس لیے ضروری ہے کہ جلد اقدامات اٹھائے جائیں تاکہ اس چیلنج کا سامنا کیا جاسکے۔ آخر میں سپریٹنڈنٹ انجینئر مسٹر ثمر نے حکومت کو کہا کہ ان کو اجازت دی جائے کہ وہ کینال جو روہڑی شہر سے نکلے اور خیر پور سے گزر کر آگے بڑھے اس کا سروے کرے' ثمر نے منصوبے کے فوائد کا ذکر کر کے لکھا کہ:

''پنجاب میں مسلسل آبپاشی کے نظام کا بڑھاوا ہمیں مجبور کرے گا کہ ہم دریا کو چھاب (Wier) دیں' لیکن جو نہر ہم نے تجویز کی ہے وہ آئندہ سالوں تک کارگر رہے گی اور ضرورت پڑنے پر دوسری نہروں کو ان سے ملایا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ایک نہر ان کے دائیں کنارے پر ہو۔

1910ء میں ثمر نے روہڑی کینال پراجیکٹ پیش کیا اور اس بات پر زور دیا اس کا کام جلد شروع کیا جائے (Triple Project) جس کے لیے کمیشن 1901ء میں سفارش کی تھی۔ اس لیے اب ثمر کے روہڑی کینال کی وکالت شروع ہوگئی۔ لیکن ثمر وہ پہلا شخص تھا جس نے پنجاب کی طرف سے دریاؤں کا پانی لینے سے سندھ پر مرتب ہونے والے اثرات کی نشاندہی کی۔ جیسا کہ یہ اختلاف رائے بہت دیر سے آیا کیونکہ پنجاب اور یوپی صوبہ جات میں آبپاشی کے بہت سے منصوبوں پر کام شروع ہو چکا تھا۔ پنجاب کے فائدے کا مطلب یقیناً سندھ کا نقصان تھا' سندھ کی رائے غلط نہ تھی کہ اس کو اس کے جائز حق سے محروم رکھا جارہا ہے۔ بمبئی حکومت سخت تنقید کا نشانہ بن گئی کہ وہ سندھ کے حقوق کا تحفظ نہیں کرسکتی' ہوسکتا ہے کہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا ایک سبب یہ بھی ہو۔

پنجاب کے مقابلے میں سندھ کی آبپاشی کے منصوبوں کو بہت کم توجہ دی گئی ان باتوں کے واضع گواہیاں سردست موجود ہیں کہ سندھ کا کینالوں کی ترقی کا کیس نہایت ہی مضبوط تھا۔

دریائے چناب پر بوری داب کینال کا کام 1884ء میں شروع ہو چکا تھا اور جہلم میں 1902ء میں شروع ہو چکا تھا۔ جب کہ سندھ میں ماہیوار' نصرت اور جمڑاؤ کینال کا کام بالترتیب 1899ء' 1901ء اور 1904ء میں شروع ہوا۔ دیر سے شروع کرائے گئے یہ منصوبے آبپاشی کو تھوڑا ہی فائدہ دے سکے۔ نہ صرف پنجاب سندھ کو پانی سے محروم کر رہا تھا' لیکن بمبئی حکومت بھی اپنا متعین اور ممکنہ سرکاری کردار پیش کرنے سے قاصر رہی۔ بمبئی پریذیڈنسی میں ان چالیس سالوں

کے عرصہ میں پیداواری اور بچاؤ کے کاموں کے لیے آنے والی ایریا میں چار گنا اضافہ ہوا' جب کہ سندھ میں اس عرصہ کہ دوران صرف دو گنا اضافہ ہوا۔ ثمر نے اس سلسلے میں متعلقہ ثبوت بھی پیش کیے' ٹیبل نمبر 11 سے پوائنٹ کو واضع نمونے سے ظاہر کرے گی اور وہ دکھائے گی کہ سدا بہنے والی نہریں سندھ کی ترقی کے لیے کتنی اہم تھیں۔

آخرکار سندھ کی مدد کے لیے حکومت ہند آگے بڑھی اور اس نے بمبئی حکومت کو ذہن نشین کرایا کہ جاڑے کی سخت گیر سردیاں اور پنجاب کے پانی لینے سے آخر ''سندھو'' کا بہاؤ' سیلاب والے کینالوں کے لیے کم کر کے بلکہ ختم کر دے گا۔ سندھ اور پنجاب کی آبپاشی نظام پر آنے والی لاگت ناہموار اور سندھ میں آبپاشی نظام کی تباہی ہے۔ حکومت ہند نے پختہ ارادہ کیا کہ سندھ میں ایک بیراج بنایا جائے۔ حکومت ہند کی تجویز اور سندھ کے لوگوں کی ناراضگی نے بمبئی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ کوئی منفی قدم نہ اٹھائے۔ 1910ء میں بمبئی حکومت نے آخرکار ایک بیراج کی تعمیر اور روہڑی کینال کی کھدائی کے لیے رقم کا تخمینہ لگایا' جس کے مطابق بیراج کی تعمیر کے لیے 215 لاکھ روپے اور کینالوں کی کھدائی کے لیے 438 لاکھ روپے لگائے۔

باوجود ان تجاویز منصوبے کی تعمیر کو جلد شروع نہیں کیا گیا۔ دلیل اور جوابی دلیل منصوبے پر عمل درآمد کو التوا میں ڈالتے رہے' آخرکار 1912ء میں حکومت کے سیکرٹری نے ایک کمیٹی نامزد کی کہ وہ منصوبے کی نگرانی کرے۔ بدقسمتی سے کمیٹی کی تجاویز کو نظرانداز کر دیا گیا۔ اس کی 1913ء کی رپورٹ نشاندہی کرتی ہے کہ ماضی میں اس الزام کا کوئی ثبوت نہیں کہ پنجاب کی طرف سے لیا جانے والا پانی سندھ پر اثر انداز نہیں ہوا ہے' مستقل میں بھی کوئی امکان نہیں کہ سندھ پانی کے حق سے محروم ہو۔ جبکہ کمیٹی نے اس امکان کو رد نہیں کیا کہ سندھ پر برے اثرات پڑیں گے۔ کمیٹی نے پراجیکٹ کو مہنگا اور غیر پیداواری ظاہر کیا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی حیران کن ہے کہ کمیٹی اسکیم کو تیار رکھنے کے لیے تجویز اور پنجاب کی طرف سے اٹھانے والے پانی پر نظر رکھنے کو کہا اور اس بات پر بھی زور دیا کہ بیراج کی جگہ کا بھی انتخاب کیا جائے تاکہ بوقت ضرورت فوراً اس کی تعمیر شروع کی جائے۔

حالانکہ بمبئی حکومت نے کمیٹی مجوزہ مشوروں سے اتفاق نہیں کیا جس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ موجودہ آبپاشی نظام سندھ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ سندھ اپنے آبپاشی نظام کی اصلاح کا

بھرپور مطالبہ کررہی تھی۔ کیونکہ پنجاب اور متحدہ صوبے (یو پی) پہلے ہی اس قسم کے فائدہ حاصل کر رہے تھے عام طور پر یہ کہا گیا کہ سندھ کو بارش والا ملک تسلیم کرنے کا مطلب سندھ کو نظر انداز کرنے والی پالیسی کے برابر ہے۔ بمبئی حکومت نے پہلے والے منصوبے کو آگے بڑھاتے ہوئے دریا کے دائیں طرف بھی کینال تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس منصوبے کی تعمیر پر آنے والے خرچے کا جو تخمینہ لگایا گیا۔ وہ 1120 لاکھ روپے تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ یہ منصوبہ سندھ کی آمدنی اس قدر بڑھا سکے گا کہ سندھ دس سالوں کے اندر اندر منصوبہ پر آنے والا خرچ اور اس پر پڑنے والا سود اتار سکے گا۔ بمبئی حکومت نے یہ پلان حکومت ہند کو بھیجا تا کہ اس پر آنے والے خرچے کی سرکاری منظوری لی جاسکے۔

یہ منصوبہ 1913ء میں ای ای مسٹو (Executive Engineer) کی نگرانی میں دیا گیا۔ تا کہ وہ سکھر بیراج منصوبے کا نئے سرے سے جائزہ لے سکے۔ مسٹو نے سارے منصوبے کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ دریائے سندھ پر ایک بیراج اور سات نہریں جلد تعمیر کی جائیں۔ اس اسکیم کو اسٹیٹ سیکریٹری کو منظوری کے لیے بھیجا گیا۔ مسٹو کی ان سفارشات کو منظور ہونے میں آٹھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ آخرکار جولائی 1923ء میں اس کی تعمیرات کے آخری احکام جاری ہوئے۔ مزید دو سالوں تک احکامات پر فوراً عمل درآمد نہیں ہوا اور دو سال اور بھی گزر گئے۔ تعمیر کا کام جولائی 1925ء میں شروع ہوا۔ تعمیراتی کام 1932ء میں مکمل ہوا۔ یعنی یہ منصوبہ مکمل ہونے میں پورے دس سال لگ گئے۔ کیونکہ فائیف نے جو تجاویز 60 سال پہلے دیں تھیں اور اریگیشن کمیشن 30 سال پہلے یعنی 30-1901ء میں بھی پہلے والی تجاویز کی منظوری کر چکا تھا۔

ساری اسکیم کا مختصر طور پر نیچے جائزہ دیا جارہا ہے۔

(الف) دریائے سندھ پر سکھر کے مقام پر بیراج کی تعمیر۔

(ب) سات خاص نہروں والے بیراج کے دونوں طرف سے کھدائی۔ ان میں سے نکلنے والے چھوٹے نالے، شاخیں اور واٹر کورسز کی بھی کھدائی۔

سکھر بیراج سے خریف میں 46,583 کیوسک اور ربیع میں 25.648 کیوسک لینے کی صلاحیت۔ آبپاشی کی ایریا 6.75 ملین ہیکٹر ہے دیکھئے ٹیبل نمبر 4 اور 3۔

پنجاب جو اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے زیادہ سے زیادہ پانی رکھنا چاہ رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پنجاب پانی کے مسئلے پر کبھی بھی اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہا' اور نہ ہی اسی نے کبھی سندھ سے کیے گئے معاہدوں کی پاسداری کی۔ سکھر بیراج کی منظوری کے دوران پنجاب نے چاہا کہ ان کا اپنا وادیٔ ستلج کا منصوبہ منظور ہو۔ آخرکار حکومت ہند نے دونوں منصوبے (Secretary of State) کی طرف بھیجے کہ وہ کوئی مناسب فیصلہ دے۔ جب سیکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے سکھر بیراج کی منظوری کا فیصلہ دیا گیا' تو پنجاب نے سمجھا کہ پہلے راؤنڈ میں سندھ نے اپنا کیس جیت لیا ہے۔ پنجاب کسی بھی قیمت پر اپنا دعویٰ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے احتجاج کرنا شروع کیا کہ سندھ دریائے سندھ اور ان کو فیڈ (Feed) کرنے والی دوسرے دریاؤں سے زیادہ پانی نہیں لے سکے۔ بمبئی حکومت نے پنجاب کے اس نقطہ نظر پر زبردست اعتراض کیے' انہوں نے آبپاشی کے انسپکٹر جنرل تھامس ورڈ کے بیان پر زور دیا جس نے کہا تھا کہ مستقبل میں پنجاب کی ساری اریگیشن اسکیموں کی باریک بینی سے چکاس کی جائے کہ ان کا اثر سکھر بیراج پر نہ پڑ سکے۔ بمبئی حکومت نے شکایت کی جب ستلج ویلی پراجیکٹ پر غور کیا جا رہا تھا تو پنجاب نے ہم سے کوئی بھی مشورہ نہ کیا اور خدشہ ظاہر کیا کہ اس منصوبے کے سکھر بیراج پر بہت ہی خراب اثرات پڑیں گے۔ حقیقت میں پنجاب حکومت کے پاس تین منصوبے عمل درآمد کے لیے تیار تھے۔ ان میں بکرا' ترمو اور تھل یہ منصوبے یقیناً وہ سکھر بیراج پر اثر انداز ہونے تھے۔

حقیقت میں پنجاب حکومت 1923ء سے سندھ پر تین محاذوں سے حملہ کر رہی تھی' بکر' تریمو ورتھل اس وقت فائدے مند نظر آ رہے تھے۔ جب کہ سندھ دفاعی پوزیشن میں تھا۔ جب تک سکھر بیراج مکمل ہو سندھ کوئی بھی تجویز پیش نہ کر سکی۔ پنجاب مختلف شکلوں میں اپنا تھل کینال کا منصوبہ پیش کرتا رہا اور انہوں نے مرکزی حکومت سے اسی طرح معاہدہ بھی کیا۔ لیکن سیکریٹری آف اسٹیٹ نے ان کا کیس رد کر دیا۔ تھل کے علاوہ پنجاب بہت سے دوسرے منصوبے بھی پیش کرتا رہا کہ سکھر بیراج کی تعمیر رکوائی جا سکے اور سندھ خوشحالی نہ ہو سکے۔

افسر شاہی کی رکاوٹوں اور پنجاب کی زیادہ پانی لینے کی ہوس کے علاوہ دوسرے بھی اسباب تھے جو سکھر بیراج کی تعمیر میں التوا کا سبب بن رہے تھے۔ سندھ کے وڈیرے اور مقامی آبادکار بھی

اس عمل میں دخل اندازی کر رہے تھے' کیونکہ اب تک وہ اپنی مرضی کے مطابق پانی لے رہے تھے اوران کوخوف تھا کہ منصوبہ شروع ہوا تو وہ اپنی مرضی کے مطابق پانی نہ لے سکیں گے۔ باثر وڈیروں نے اپنادفاعی کرنے کے خیال سے کوششیں کیں اور بمبئی لیجسلیٹو آسمبلی میں اپنے بہت سے ساتھیوں سے مدد حاصل کر لی۔ اسمبلی ممبران نے باوجود اس کے کہ یہ منصوبہ خدا کی رحمت ثابت ہوگا بمبئی سرکار پر تنقید شروع کی کہ بمبئی حکومت نے مہنگی ذمہ داری میں ہاتھ ڈالا ہے اور سندھ حکومت قرضے کے تلے دب جائے گی۔ اور قرضہ اتارنے کے لیے عوام پر نئے ٹیکس نافذ کیے جائیں گے۔ تنقید کرنے والوں کا خیال تھا کہ سندھ وہ قرضہ 1986ء تک مشکل سے ادا کر سکے گا۔

اس کے علاوہ فنی بنیادوں پر بھی اعتراضات اٹھائے گئے۔ لیکن یہ دلچسپ بات ہے کہ بیراج کے مخالفوں کے اٹھائے گئے سارے اعتراضات جھوٹ کے پلندے ثابت ہوئے اور حکومت سندھ نے سارا قرضہ بمع سود دس سالوں کے اندر ادا کر دیا۔

سکھر بیراج کے بننے سے سندھ کی زراعت میں ایک نیا انقلاب آ گیا۔ حتیٰ کہ بیراج صوبہ کے سبھی علاقہ جات کا احاطہ نہیں کر رہا تھا۔ سندھ کے کچھ شمال اور جنوبی کے حصوں تک اس بیراج سے پانی پہنچ نہ پا رہا تھا' لیکن پھر بھی وہ سندھ کے لیے ایک نعمت ثابت ہوا۔ بیراج کے دائرہ میں آنے والی ٹوٹل زمین 7.5 ملین ہیکٹر تھی۔ آبپاشی والی زمین 6.25 ملین ہیکٹر تھی۔ جب کہ 1940ء تک اصل آباد زمین 3.8 ملین ہیکٹر تھی۔ اس کے بعد جو نئی زمین آبادی کے نیچے آئی وہ 1.95 ملین ہیکٹر ہے۔

بیراج دریا پر بہت بڑا ریگیولیٹر ہے جو 66(Spans) پر مشتمل ہر ایک Span کی لمبائی 60 فٹ ہے۔ جس سے پانی کی گزرگاہوں کو بڑے فولادی دروازوں کے ذریعے کھولا اور بند کیا جاتا ہے۔ ہر ایک دروازے کا وزن 50 ٹن ہے' ان کو بجلی کے ذریعے چلایا جاتا ہے۔ لیکن اگر بجلی بند ہو جائے تو ہاتھ سے بھی چلایا جا سکتا ہے۔ ریگیولیٹر پر دو برج بھی بنائے گئے ہیں ان میں سے بڑی برج کا نام (Gate Bridge) ہے' جو ٹریفک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہ مین روڈ کو بائیں سے دائیں کنارے سے ملاتا ہے۔ بیراج کی لمبائی ایک میل ہے۔ واٹر کورسوں کی ساری لمبائی 47800 میل ہے۔ سارے نالوں کی کل لمبائی 6473 ہے۔

بیراج کی تعمیر سے کچھ سال پہلے ان کی تعمیر ہونے والی جگہ کے بارے میں انجینئروں میں

اختلاف ہو گئے۔ کچھ کا خیال تھا کہ ان کو سکھر (Garge) کے اوپر تعمیر کیا جائے' دوسروں نے کہا کہ ان کو (Garge) کے نیچے تعمیر کیا جائے۔ آخر کار اس کو گارج کے نیچے بنایا گیا۔ بیراج کو ریت پر تعمیر کیا گیا' ریتی اس کی پائیداری میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں بنی۔

بیراج کی تعمیر میں مشینری اور انسانی محنت شامل ہے خاص قسم کے مکینیکل طریقے نالوں کی کھدائی کے لیے استعمال کیے گئے۔ کیونکہ 135,000 مزدوروں کا انتظام اس وقت مشکل تھا۔ اور مشین کا کام مسلسل چلتا رہتا ہے۔ جب کہ فصل کٹائی اور کاشت کے وقت مزدوروں کے کام میں رکاوٹیں آ سکتی تھیں۔ اس کام کے لیے 46 مشینوں کے بیڑے کا انتظام کیا گیا جس پر ایک کروڑ روپے لاگت آئی۔

مشینوں کی کھدائی اور مٹی کو محفوظ کرنے کی مکمل صلاحیت 74 ٹن ایک منٹ تھی۔ مشینوں کے علاوہ 32000 (آدمی سارا سال کام کرتے رہے' اس کے علاوہ 3800 '2100 اور 1100 آدمیوں کو بڑی درمیانی اور چھوٹی مشینوں پر ملازم رکھا گیا۔ سکھر بیراج پر مکمل لاگت 20 کروڑ روپے آئی۔ یہ ساری رقم حکومت ہند قرضے کی صورت میں مہیا کی۔ حقیقت میں حکومت ہند کی حیثیت بینکر والی تھی۔ اور اس ساری رقم پہنچانے کا انتظام بمبئی حکومت نے کیا۔ تعمیر کے بعد یہ خرچہ لگان کی صورت میں ملنے والے ریونیو سے حاصل کیا گیا۔ اس کے علاوہ سرکاری زمین جو بیراج کے سبب آبادی لائق ہوئی تھی ان کی بکری بھی آمدنی کا بڑا ذریعہ بنی۔ غریب آبادکاروں کو بھی معمولی رقم پر زمین دی گئی۔ پنجاب سے بھی ایک بڑی آبادی جو زمین حاصل کرنے کی خواہشمند تھی سندھ میں ہجرت کر کے آئی۔ یہی وجہ تھی کہ سندھ حکومت نے دس سالوں کے اندر سارا قرضہ بمع سود ادا کر دیا۔

کینال اریگیشن کی اقتصادی اہمیت یہ ہے کہ ان کے ذریعے زراعت کی جلد ترقی ہوتی ہے۔

سندھ کے گاؤں کی آبادی 500 یا اس سے بھی کم افراد پر مشتمل تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ ساری آبادی زراعت سے وابستہ ہو۔ سندھ کی ساری اراضی 29,919,289 ہیکٹر تھی جس میں سے آدھی یعنی 14,958,235 ہیکٹروں پر جنگلات' پہاڑ اور ریگستان تھے۔ باقی زمین کے لیے مناسب اور مطلوبہ پانی کا انتظام نہ تھا۔ 14961054 ہیکٹروں میں فقط 8350363 ہیکٹروں کو

فوائد کے لائق سمجھا گیا۔لیکن 5-1904ء میں فقط 3357266 ہیکٹر یا 23% زمین کاشت کی گئی تھی۔ جس میں 2802962 ہیکٹروں کو نالوں کے ذریعے پانی مہیا کیا گیا تھا اور 353457 ہیکٹر دریا کے ذریعے آباد کیے گئے تھے۔ زمین کے کافی ٹکڑے موسمیاتی بارش پر آباد ہوتے تھے' یا تو وہ پہاڑی چشموں پر آباد ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر کراچی اور لاڑکانہ ضلعوں کی 6891 اور 10332 ہیکٹر زمین کا دارومدار بارش اور پہاڑی نالوں پر تھا۔ تھر پارکر کی 253352 ہیکٹر زمین کا ذریعہ فقط بارش کا پانی ہی تھا۔ لیکن سندھ کے دوسرے علاقوں میں نار اور چرخیوں پر فصلوں کو آباد کیا جاتا تھا۔ پانی کی غیر یقینی موجودگی کے نتیجے میں سندھ کی زراعت پر خراب اثرات پڑے اور موسم کے مزاج میں تنوع کے سبب غیر متوازن اور متزلزل رہتی تھی۔ نیچے دیئے گئے اعدادوشماروں سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے۔

	01-1900	5-1904
Acerage occupied	8001941	8350363
Acerage under crops	3729436	3357266

پانی کی اسی ناہموار فراہمی نے نہ صرف فصلوں کو متاثر کیا بلکہ اس سے آبادکاروں کی قسمت بھی ابتر حالت میں رہتی تھی۔ انسانی غفلت اور سستی باشندگانِ سندھ کو قدرت کے عظیم عطیہ یعنی دریائے سندھ کی نعمتوں سے محروم رکھتی آ رہی تھی' جس کو درست نمونے سے استعمال کر کے ان کی تقدیر سنواری جا سکتی تھی۔ سکھر بیراج سے پہلے سندھ کی اہم فصل فقط چاول تھی' جس کے لیے ایک ملین ہیکٹر زمین وقف کی گئی تھی' لیکن وہ فقط زیادہ پانی یا سیلاب کے وقت بوئے جاتے تھے۔ خاص طور دریا کے دائیں کنارے والے حصوں میں' دوسرے نمبر پر جوار' باجرہ اور گندم کاشت کی جاتی تھی۔ اس کے بعد چنہ' مٹر اور سرسوں کا ساگ بویا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کپاس کے بہت ہی کامیاب تجربے ہوئے تھے۔ لیکن وہ ساری امیدیں پانی کی غیر ہموار سپلائی کے سبب متاثر ہوئی تھیں۔ ایک تو فصل کا معیار کم ہوتا تھا اور اس کی پیداوار موسمی تبدیلی کا شکار ہوتی تھی فقط پانی کی دائمی فراہمی نے کچھ تکالیف کو ختم کیا۔

بہت ساری زمین کو آباد کرنے کی امید کو بیراج نے پورا کیا بیراج نے سندھ کو زرعی ترقی

کے لحاظ سے ایک نئے دور میں داخل کر دیا' اور گندم کی کاشتکاری سے بھی خاطر خواہ نتائج ملے۔ اس سے کاشت آدھا ملین سے 2 ملین ہیکٹروں تک بڑھ گئی' اس فصل کو بہتر کرنے کے لیے نئے ادارے قائم کیے گئے۔ زیادہ پیداوار دینے والی اجناس متعارف کرائی گئی۔ 1940ء تک اس فصل میں بہت زیادہ ترقی آ گئی گندم کی فصل کے تجربات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر فصل کو بونے سے پہلے زمین میں رَبج (پانی) دیا جائے اور اس کے بعد زمین کو ہل دیا جائے تو پیداوار پر کوئی بھی اثر نہیں پڑے گا۔ دیسی اور باہر سے لائی گئی گندم کے بیجوں (Sample) کو انگلینڈ' ہالینڈ' اسکاٹ لینڈ اور امریکہ بھیجا جائے جیسے اس کو پیس کر اس پر تجربے کیے جائیں تاکہ حوصلہ افزا نتیجے ظاہر ہو سکیں۔ اس کے بعد بیراجی علاقہ جات میں ایسی کوششوں کے سبب پیداوار بڑے پیمانے پر شروع ہوئی۔ اس کے لیے ٹیبل نمبر 6 دیکھی جاسکتی ہے۔

گندم کے ساتھ پھٹی (کپاس) کی پیداوار کو بھی بیراج والے علاقوں میں بڑھایا گیا۔ ایک کمیٹی مقرر کی گئی کہ وہ کپاس کے فصل کے مسئلوں پر غور بچار کرے۔ 1930ء تک کپاس فقط 300000 ہیکٹر پر اگائی جاتی تھی' جس کی سالانہً پیداوار 100000 (Bales) تھی۔ دائمی آبپاشی کے سبب کپاس کی پیداوار 750000 ہیکٹرز تک بڑھ گئی' اور یہ امید بھی کی گئی کہ یہ اور بڑھے گی۔ بیراج کھلنے کے بعد کپاس کی تین اجناس متعارف کرائی گئیں:

(i) Sindhi Desi (ii) Punjab American Cotton

(iii) Imported Egyptian Cotton

بہت ساری تحقیقات کے بعد زیادہ پیداوار دینے والا دیسی بیج تیار کیا گیا۔ بہتر بنائی گئی جنس 27-w.x مارکیٹ میں لائی گئی۔ جو جلد تیار ہوتی تھی اور وہ 16.20 عام رواجی دیسی جنسوں سے زیادہ پیداوار بھی دیتی تھی' جس کو بعد اسے معیاری دیسی جنس کا نام دیا گیا' اس کو کپاس اگانے والے علاقوں میں تیزی سے پھیلایا گیا' پنجاب امریکن کپاس اتنی اچھی نہ تھی' جتنا سندھی دیسی اور امریکہ اور مصر سے برآمد کیے گئے بیج سندھ کی آب وہوا میں بہتر کارکردگی دکھائی۔ اسی لیے ان کو ابھی تک بویا جاتا ہے۔ سندھی دیسی اور یہ بیج بہتر معیار کے ہیں' ان کی کپاس اعلیٰ معیار کی ہے' اس کپاس کو ہندوستانی ملیں استعمال کرتی تھیں' حکومت کپاس والی ایریا کو بڑھانے کے لیے تحقیق کے کام کی حوصلہ افزائی کی۔ 1939ء میں انڈین سینٹرل کمیٹی 296540 روپے تحقیق کے کام کے

لیے مختص کیے۔ وہ کام بیراج زون کے 18 مختلف جگہوں پر شروع ہوا۔ اس ساری کوشش کے نتیجے میں کپاس کی فصل کو بڑھانے کے اچھے نتیجے برآمد ہوئے۔ نیچے دیئے گئے ٹیبل میں ان اعداد و شمار میں متعلقہ معلومات مل سکتی ہے۔ (پیداوار ٹنوں میں اور ایریا ہیکٹروں میں ہے)

سال	پیداوار	ایریا	Y\A
1931	758	4321	67
1932	896	4223	83
1933	875	4225	83
1934	825	4280	77
1935	1120	4931	91
1936	1151	4632	99
1937	1088	4833	90
1938	1018	4555	89
1939	988	4576	86
1940	1280	4816	106

اس کے علاوہ لاڑکانہ کے سرکاری فارم پر چاول پر تحقیق شروع کی گئی۔ چاول کی تین نئی اقسام بھی متعارف کرائی گئیں، جو نہایت کامیاب ثابت ہوئیں، جو لوکل اجناس سے زیادہ اعلیٰ قسم کی تھیں۔ جن کو سندھ کے اوپر والے حصے میں بویا گیا چاول کے لیے سندھ کا اوپر والا حصہ منتخب کیا گیا کیونکہ نیچے والی سندھ یعنی ''لاڑ'' میں اس پر مکھی اور رتی کی بیماری کا خطرہ تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ نیچے والی سندھ میں چاول بویا ہی نہیں جاتا لیکن حقیقت میں چاول ایسے علاقہ جات میں زیادہ بویا گیا، جہاں بیماری کا اثر کم تھا۔ حیدرآباد اور اس کے گردونواح میں بھی چاول کی نئی اقسام متعارف کرائی گئیں۔ دریں اثناء بیماری پر تحقیق کے لیے لاڑکانہ میں بھی سینٹر کھولے گئے۔ چاول کی بوائی وہ نتائج تو نہ دے سکی جو سوچے گئے تھے لیکن پھٹی نے اچھا ہدف سر کر لیا۔ لیکن پھر بھی اس کی ترقی مایوس کن نہ تھی۔ نیچے والی ٹیبل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(پیداوارٹنوں میں سمجھی جائے اورایریاایک ہزار ہیکٹر دں میں)

Y\A	ہیکٹر	پیداوار	سال
1012	3159	1427	1931
968	3136	1355	1932
999	3140	1363	1933
938	3177	1331	1934
888	3097	1228	1935
859	3012	1155	1936
937	3268	1367	1937
881	3271	1286	1938
780	3190	1111	1939
812	3390	1229	1940

جواراور باجرہ کی کاشت بھی دوسری فصلوں سے مستقل پانی کی فراہمی کے سبب شروع ہوگئی تھی۔ دس سالوں کے عرصہ میں فصلوں کی نئی اقسام نے پرانے بیجوں کے مقابلے میں فی ہیکٹر پر30-15 فیصد تک زیادہ پیداوار دینا شروع کی۔ زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کوان علاقوں میں پھیلایا گیا جہاں اس فصل کی پیداوار ہوتی تھی۔

ان فصلوں کے علاوہ اور بھی فصلیں مثلاً تیل والے بیج' دالیں' سویابین' پیاز اور مختلف اقسام کی باغوں میں بوائی بڑے پیمانے پر شروع ہوگئی۔ان فصلوں میں سویابین کی بوائی زیادہ تعداد میں شروع کی گئی۔ کیونکہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس فصل کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ سندھ زراعت میں خودکفالت کی طرف بڑھ رہی تھی۔اس مختصر زرعی ترقی کا مستقبل نہایت شاندار تھا۔ حکومت نے زراعت کوابھارنے کے لیے 1939ء میں ایک علیحدہ زرعی کھاتا بنایا۔

پیچیدہ اور نہایت ترقی یافتہ کینال سسٹم بننے کے سبب حکومت نے مستعد آبپاشی ادارے کے لیے سوچنا شروع کیا' انگریزوں سے پہلے سندھ میں کینالوں کا صحیح انتظام نہ تھا۔ میر جوحکمران

تھے اور زیادہ تر زمین ان کی ملکیت تھی۔ کینالوں کی جزوی ذمہ داری ان کے سپرد تھی، جو کسی بھی حالت میں اطمینان بخش نہ تھی، پانی کی عدم فراہمی اور کمی ہی اہم مسائل تھے، وہ اس لیے نالوں کی صفائی اور کھدائی کراتے تھے یا تو ان مزدوروں کو سرکاری گوداموں سے روٹی کھلاتے تھے، جب کہ صفائی اس طریقے سے ہوتی تھی لیکن پھر بھی آبادکاروں کو آبیانہ کے کچھ محصول دینے پڑتے تھے، انگریزوں کے آنے کے بعد ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ کوئی ایسا نظام قائم کریں جو کسانوں کے لیے مفید ہو، جیسا کہ کینال انتظامیہ کا دور نیپیر سے شروع ہو گیا تھا۔ حقیقت میں انگریزوں نے پولیٹیکل ایجنٹ (Political Agent) اوپر والی سندھ میں مقرر کر دیئے تھے، جو اس بات کو یقینی بناتے تھے کہ انگریز فوجوں کو افغانستان پر چڑھائی کے لیے آمدورفت میں کوئی دشواری نہ آئے۔ یہ نیپیر ہی تھا جس نے 1844ء میں کوشش کی کہ کینال انتظامیہ کو منظم کیا جائے۔ نیپیر انتظامیہ کا مرکزی عملدار سپریٹنڈنٹ انجینئر انگریز افسر ہوتا تھا۔ جس کے حوالے ایک ضلع ہوتا تھا۔ جس کے ماتحت چھوٹے بڑے 300 کینال یا واٹر کورس ہوتے تھے۔ جن کا سارا انتظام اس کے ذمہ ہوتا تھا۔ انجینئر کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ یہ سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے اور بہتر نتائج بھی پیش کرے جو کہ ایک بہت بھاری چیلنج تھا، جس نے انجینئر کا کام تقریباً ناممکن بنا دیا تھا، نیپیر کے کینال سسٹم کو اس لیے جلد بیراج سسٹم میں تبدیل کیا گیا۔ اپنی مختصر زندگی میں یہ ادارہ صرف کچھ مختصر خدمات ہی عمل میں لا سکا جو اہم ثابت ہوئیں بالخصوص سندھ کی زمین کی جغرافیائی اہمیت کو اجاگر کرنے میں مفید اور کارآمد ہوئیں۔ اس ادارے کو اسی سال میں بند کیا گیا۔ جس سال وہ بنا تھا۔ یعنی 1844ء میں۔ اب کینالوں کا کنٹرول کلیکٹروں کے ہاتھ میں دیا گیا۔ جن کی مدد کے لیے اضافی ڈپٹی کلیکٹر رکھے گئے، جو کلیکٹر کے نیچے ہوتے تھے۔ 1854ء میں ایک نئی اسکیم پیش کی گئی، جس پر عمل درآمد کیا گیا۔ اس اسکیم کے خاص نکات یہ تھے کہ ایک تو وہ کم خرچ والی تھی، اور دوسرا یہ کہ ان کے فنی حصے اور عملدرآمد کے حصے الگ الگ تھے، کینال سسٹم اس ادارے کے انتظام کے نیچے لایا گیا۔ جب تک 1878ء میں ایکٹ کے سیکشن 6 کے مطابق پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ بنایا گیا۔ وہ نئی طرز پر بننے والا ادارہ تھا، جس کی ساری انتظامیہ آج تک پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کے نیچے کام کر رہی ہے۔

❁

الکزنڈر ہملٹن کے مشاہدات سندھ

الکزنڈر ہملٹن/ ڈاکٹر مبارک علی

الکزنڈر ہملٹن 1699ء میں سندھ آیا تھا' اپنے مشاہدات اور تاثرات اس نے اپنی کتاب (A New Account of the East India. Clalan 1930) میں لکھے ہیں یہ مضمون اس کتاب کے گیارہویں باب کا ترجمہ ہے۔

سندھ مغل امپائر کے انتہائی مغرب میں ساحل سمندر پر واقع صوبہ ہے لاہری بندر اس کی بندرگاہ ہے۔ یہ بندرگاہ اس قابل ہے کہ یہاں 200 ٹن تک کے جہاز آسکتے ہیں۔ اس سے ملحق ایک گاؤں ہے کہ جس میں 100 مکانات ہیں' جو کہ گارے مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن یہاں پر ایک پتھروں سے بنا ہوا قلعہ بھی ہے' جس پر چار یا پانچ توپیں ہیں تاکہ اس تجارتی سامان کی بلوچی اور مکرانی ڈاکوؤں سے حفاظت کی جاسکے جو کہ اس کے قریب ہی آباد ہیں۔ سرحدی علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ان کو چوری چکاری کی عادت ہے۔ یہ ہر اس شخص کو لوٹ لیتے ہیں کہ جو ان کے قابو میں آجاتا ہے۔ بلوچی ایران سے بغاوت کر کے یہاں آئے ہیں' جب کہ مکرانی مغلوں کی رعایا ہیں۔ جب فوج ان کی سرکشی کو دبانے کے لیے آتی ہے تو اس وجہ سے بچ جاتے ہیں کہ ان کا علاقہ جہاں یہ رہتے ہیں وہ دلدلی ہے۔ یہ اپنے حکمراں کے احکامات یا قوانین کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا پیشہ ہے کہ یہ ان قافلوں کو لوٹتے ہیں کہ جو ٹھٹھہ اور لاہری بندر کے درمیان آتے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان قافلوں کی حفاظت کے لیے 200 گھڑسواروں کا دستہ ہوتا ہے جو کہ ٹھٹھہ کا نواب یا گورنر ان کے ساتھ بھیجتا ہے۔ لیکن اکثر قافلوں کے یہ حفاظتی دستے ان

لٹیروں کے ہاتھوں قافلوں کو لٹنے دیتے ہیں' وہ یہ بہانہ کرتے ہیں کہ وہ ان کی تعداد کے آگے بے بس ہیں' لیکن بعد میں انہیں لٹیروں سے لوٹ کے مال سے حصہ مل جاتا ہے۔

ٹھٹھہ اس صوبہ کا تجارتی مرکز ہے' اور اس لحاظ سے بڑا دولت مند شہر ہے۔ لمبائی میں یہ تین میل کے اندر پھیلا ہوا ہے۔ چوڑائی اس کی ڈیڑھ میل کی ہوگی۔ لاہری بندر سے یہ 40 میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس کے مغرب میں ایک بڑا قلعہ ہے۔ اس میں 500 آدمیوں اور گھوڑوں کی رہائش کی سہولت ہے۔ یہاں لوگوں کے رہنے کے لیے بیرکس اور گھوڑوں کے اصطبل ہیں۔ نواب کے لیے ایک بڑا محل ہے۔ وہ تمام تجارتی سامان جو ٹھٹھہ سے لاہری بندر آتا جاتا ہے اس کے لیے اونٹوں' بیلوں اور گھوڑوں کی گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ تمام علاقہ میدانی ہے اور جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ یہ جھاڑیاں لٹیروں کو چھپانے کا کام دیتی ہیں کہ جہاں سے نکل کر اچانک وہ قافلے پر حملہ کرتے ہیں۔ اس وقت جب کہ حفاظتی دستہ کسی ایک جگہ لڑائی میں مصروف ہوتا ہے۔ لٹیرے گاڑیوں کو معہ ان کے سامان کے ہنکا کر لے جاتے ہیں۔ 1699ء میں چار یا پانچ ہزار بدمعاشوں کے جھتے نے ایک مال و دولت سے بھرے ہوئے قافلے کو لوٹا تھا۔ اس کا حفاظتی دستہ جو کہ 250 گھڑسواروں پر تھا' وہ تمام کا تمام قتل ہوا۔ 500 تاجر اور سامان اٹھانے والے جو اس قافلہ کے ساتھ تھے' جب وہ لٹے پٹے ٹھٹھہ آئے تو انہوں نے لوگوں کو بے انتہا خوف زدہ کر دیا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس واقعہ کے چار مہینہ بعد لاہری بندر آیا میں جس کارگو کے ساتھ آیا اس کی مالیت 11000 تھی۔ مجھے یہاں ٹھٹھہ کا کوئی ایسا تاجر نہیں ملا کہ جو میرے سامان کی ٹھٹھہ پہنچانے سے پہلے قیمت لگاتا۔ لیکن وہ اس لیے تیار ہو گئے کہ میرے پاس جو مصالحہ جات ہیں۔ ان کی بولی لگا دیں۔ لہٰذا میرے لیے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری صورت نہیں تھی کہ میں خشکی کے راستے ٹھٹھہ کے لیے ایک قافلے میں سفر کروں کہ جس میں 1500 مویشی اور جانور تھے اور ان سے بھی زیادہ مرد وعورتیں تھیں۔ حفاظت کے لیے 200 سواروں کا دستہ تھا۔ یہ کوئی جنوری کا نصف تھا کہ ہم سفر پر روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم کوئی 16 میل گئے ہوں گے کہ ہمارے مخبروں نے آ کر خبر دی کہ ایک بڑی تعداد میں بلوچی اور مکرانی لٹیرے ہمارے انتظار میں ہیں۔ میرے پاس تیرہ بندوقچی تھے جو کہ اگلی صف میں میرے مویشیوں کے ساتھ تھے ہم سب چھوٹے گھوڑوں پر سوار تھے۔ یہ خبر سن کر ہم سواری سے اترے اور جانوروں کو اپنے سامنے اور دائیں بائیں رکھا تا کہ

وہ ہمارے لیے حفاظتی دیوار کا کام دیں اور اس طرح ہم لٹیروں کی تلواروں اور نشانوں سے محفوظ رہیں، لیکن ہم نے اتنی کھلی جگہ رکھی کہ جہاں رہتے ہوئے لٹیروں پر فائر کر سکیں۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ لٹیروں نے ایک شخص کو ہماری جانب خبر لینے بھیجا جو کہ گھوڑے پر سوار ننگی تلوار لہراتا ہوا آیا اور قریب آ کر اس نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر ہم نے ہتھیار نہیں ڈالے اور سامان ان کے حوالے نہیں کیا تو ہماری حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں دی جائے گی۔

میرے پاس دو جہاز راں تھے جن کو میں نے جہاز میں ایک پرندے کا ایک ہی شاٹ میں شکار کرتے ہوئے دیکھا تھا جو کہ جہاز کے اوپر اڑ رہا تھا اس سے مجھے اندازہ تھا کہ ان کا نشانہ خطا نہیں ہوتا ہے ان میں سے میں نے ایک سے کہا کہ اس مخبر کو شوٹ کر دے، اس نے اس پر فوراً عمل کیا اور گولی اس کے سر میں سے ہو کر گزر گئی۔ ایک اور جو اس کے پیچھے آ رہا تھا اور دھمکیاں دے رہا تھا اس کو بھی اس قسم کی موت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد آنے والے کے بارے میں میں نے ہدایت دی کہ اس کے گھوڑے کے سر میں گولی ماری جائے تا کہ ہم اس کے سوار کو قابو میں لا سکیں اور اس کے ذریعہ دشمنوں کی قوت کا اندازہ لگا سکیں۔ گھوڑا جیسے ہی سامنے آیا اسے شوٹ کر دیا گیا، اس کے بعد ہمارے کچھ سواروں نے لٹیرے کو میرے پاس لانے کے بجائے گرا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب ہمارا حفاظتی گھڑ سواروں کا دستہ عقب میں تھا، لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ قافلہ کے سامنے والے حصہ میں کیا ہو رہا ہے، تو انہوں نے ہمت کی اور جھاڑیوں میں گھس کر ان لٹیروں کو مار بھگایا جو کہ ہمارے دائیں بائیں حملے کی تیاری میں تھے۔ اس پورے آپریشن سے یہ لٹیرے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے، ہمارے گھڑ سواروں نے ان بھاگتے ہوئے لٹیروں میں سے کچھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب حفاظتی دستہ تعاقب کے بعد واپس آیا تو ہم نے اپنے سفر کا دوبارہ سے آغاز کیا۔ تقریباً 4 میل سفر کرنے کے بعد ہم ایک کچے قلعے پہنچے یہ لاہری بندر اور ٹھٹھہ کے درمیان واقع ہے، یہاں ان قافلوں کے ٹھہرنے کے انتظامات ہیں کہ جو آگے کی جانب سفر کرنا چاہتے ہیں۔ رہائش کی تنگی کی وجہ سے یہاں انسان اور مویشی ساتھ رہتے ہیں، اس لیے اس کے لیے اصطلاح ''گوبر والا گھر'' بڑی مناسب ہے۔ یہاں پر یہ چھوٹے چھوٹے گھر برابر بنے ہوئے ہیں۔ جہاں مسافروں کو فروخت کے لیے پرندے، بکریاں اور بھیڑیں پالی جاتی ہیں، اس مقصد کے لیے جو مکانات تعمیر کیے گئے ہیں وہ لاہری بندر اور ٹھٹھہ کے درمیان راستے میں دیکھے جا

سکتے ہیں۔

میرے ٹھٹھہ پہنچنے سے اور راستے میں جو لٹیروں سے لڑائی ہوئی اس سے پہلے ہی میری سنگانی بحری قزاقوں پر فتح جو کہ میں نے مالا بار اور لاہری بندر کے درمیان سمندری سفر کے دوران کی تھی' وہاں لوگوں میں مشہور ہو چکی تھی۔ لہٰذا شہر میں میرا بڑا پرتپاک استقبال ہوا۔ شہر کے شرفاء میری ملاقات کے آئے تو اپنے ہمراہ مٹھائی اور پھلوں کے تحفے لائے۔ کیونکہ ہمارا قافلہ راستے کے خطروں سے گزرتا ہوا حفاظت کے ساتھ پہنچ گیا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں قافلے کی شجاعت و بہادری کی بھی تعریف کی۔

یہاں پر ہم پندرہ کمروں پر مشتمل ایک آرام دہ مکان میں رہائش پذیر ہوئے۔ اس میں اشیاء کے رکھنے کے لیے عمدہ گودام بھی تھے۔ دوسرے دن نواب کی جانب سے تحفہ میں ایک بیل' پانچ بھیڑیں' بہت سی بکریاں' بیس پرندے اور پچاس کبوتر آئے۔ اس کے ساتھ بڑی تعداد میں مٹھائی اور پھل تھے۔ اس وقت وہ شہر سے 6 میل کے فاصلہ میں کیمپ میں تھا' جہاں 8 یا 10 ہزار فوجی تھے' اس کا ارادہ تھا کہ ان بلوچیوں اور مکرانیوں کو سزا دے کہ جنہوں نے جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں قافلے کو لوٹا تھا اور اس کے لوگوں کو قتل کیا تھا۔ اس نے ہم سے دریافت کیا کہ ہمارے لیے کونسا وقت سہولت کا ہوگا کہ ہم اس کے ساتھ کافی کا ایک کپ پی سکیں۔ ہمارے لانے کے لیے وہ گھوڑے روانہ کر دے گا۔ میں نے اس کی مہربانی پر شکریہ ادا کیا اور خواہش ظاہر کی کہ دوسرے دن میں اس کی دست بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ اس نے دوسرے دن 20 خوبصورت اور چاق و چوبند اور تمام آلات سے آراستہ ایرانی گھوڑے ہماری سواری کے لیے بھیج دیئے۔ ان میں 10 میں نے اپنے لیے منتخب کر لیے تاکہ میں اور میرا حفاظتی دستہ ان پر سواری کرے۔ دس ان شریف تاجروں کو سواری کے لیے دیئے جو کہ میرے ساتھ بطور دوستی جانا چاہتے تھے۔ جیسے ہی ہم کیمپ کے قریب پہنچے تو بطور احترام کے ہم گھوڑوں سے اتر آئے' لیکن ایک گھڑ سوار عہدیدار جو ہمارے استقبال کو آیا تھا' اس نے ہمیں روکا اور کہا کہ نواب کی یہ خواہش ہے کہ ہم اس کے خیمہ تک سوار ہو کر آئیں۔ چنانچہ وہ راہنمائی کرتا ہوا ہمیں خیمہ کے دروازے تک لایا۔ جیسے ہی ہم گھوڑوں سے اترے' مجھے نواب کے خلوت کدے میں پہنچایا گیا کہ جہاں اس وقت وہ اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ہمراہ جو لوگ آئے تھے انہیں ایک گھنٹہ تک اندر نہیں آنے دیا گیا باہمی ادب آداب اور

حال چال پوچھنے میں کافی وقت لگا۔ چونکہ مجھے ادب آداب اور رسومات کا پتہ تھا اور یہ معلوم تھا کہ کسی اہم عہدیدار یا امیر کے سامنے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے' اس لیے میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس کے قدموں میں ایک معمولی تحفہ رکھ سکوں۔ جس کی اس نے اجازت دے دی' تحفے میں ایک آئینہ تھا جس کی قیمت 5 پونڈ تھی' ایک بندوق اور پستولوں کی ایک جوڑی جس کے دستوں پر سونے کا کام ہوا ہوا تھا' ایک تلوار' مزین دستہ والا خنجر اور اس کے تمبا کو پینے کے لیے شیشہ سے بنا حقہ معہ اسٹینڈ کے۔ اس کے بعد اس نے میرے ساتھیوں کو خیمہ میں بلایا اور ان تحفوں کو دکھایا جو میں نے اس کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ اس نے ہر تحفہ کی مبالغہ آمیز حد تک تعریف کی' ساتھ ہی میں میری بہادری اور فیاضی کو سراہا اور کہا کہ میں ٹھٹھہ کا آزاد شہری ہوں' ساتھ اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میرے سامان تجارت پر کوئی کسٹم ڈیوٹی نہیں لگے' اگر کسی نے سامان کو خریدا اور اس کے عوض رقم ادا نہیں کی' تو میرے لیے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ قاضی کی عدالت میں انصاف کے لیے جاؤں بلکہ یہ اختیار ہوگا کہ قرض یا رقم نہ دینے والوں کو قید کر سکتا ہوں۔ اگر اس سے بھی وہ میری رقم دینے پر تیار نہ ہوں تو میں ایسے لوگوں کی جائیداد بیویوں' بچوں اور ان کے قریبی رشتہ داروں کو فروخت کر سکتا ہوں تا کہ اس ذریعہ سے اپنی رقم وصول کر سکوں اس رعایت کی وجہ سے مجھے ہمیشہ اس وقت سہولت ہوئی کہ جب بھی رقم کی وصولی کے سلسلہ میں شرائط طے کی جاتی تھیں۔ تین گھنٹے کی گفتگو کے بعد ہم رخصت ہوئے۔ رخصت کرتے وقت اس نے کہا کہ جیسے ہی اس کی یہ مہم ختم ہوگی وہ میرے گھر پر آ کر دوبارہ مجھ سے ملاقات کرے گا۔ لیکن ان تین مہینوں میں کہ جب میں ٹھٹھہ میں رہا' وہ شہر واپس نہیں آیا لیکن اس دوران وہ برابر میری صحت اور میرے حالات کے بارے میں پوچھتا رہا۔

اس گوبر والے گھر سے جب ٹھٹھہ کی جانب جایا جائے' تو شہر سے 4 میل کے فاصلے پر ابھرتے ہوئے میدان میں 40 مقبرے ہیں جن کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی چھوٹا شہر ہے۔ یہ سندھ کے ان بادشاہوں کا قبرستان ہے کہ جب سندھ پر ان کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ میں ان میں سے سب سے بڑے مقبرے میں گیا کہ جس کے اوپر گنبد ہے اور درمیان میں قبر یا تعویز ہے جو تین فٹ اونچا اور سات فٹ لمبا ہے۔ یہاں اور قبریں بھی تھیں مگر سائز میں کم تھیں۔ گنبدوں کے رنگ پیلے سرخ' اور سبز ہیں جو کہ دور سے چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان میں استعمال ہونے والے

پتھر چوکور خانوں کی شکل میں ترتیب سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی رنگ برنگی شکل دیکھ کر آنکھیں حیران رہ جاتی ہیں۔ اور انہیں خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مقبرے تقریباً 10 گز اونچے اور 7 گز اطراف میں ہوں گے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ اس ملک کے آخری بادشاہ کا مقبرہ ہے کہ جس کے ملک پر جہاں گیر نے جو کہ مشہور بادشاہ اورنگ زیب کا دادا تھا اس نے قبضہ کیا تھا۔ یہ سترہویں صدی کا ابتدائی زمانہ ہے کہ جب اس نے سندھ کے بادشاہ کو شکست دے کر قیدی بنایا اور اس سے پوچھا کہ وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے کیا چاہتا ہے' وہ جو مانگے گا اسے پورا کیا جائے گا۔ اس نے شریفانہ انداز میں جواب دیا کہ وہ چاہتا ہے وہ اس کی ملکہ اور اس کی اولاد اس مقبرے میں دفن ہوں جو اس نے اپنے عہد کی خوش حالی میں تعمیر کرایا تھا' اس پر اس کے اس وقت دو لاکھ روپیہ خرچ ہوئے تھے۔ یہ وہ درخواست تھی کہ جو اس کا فاتح رد نہیں کر سکا۔

ٹھٹھہ کا شہر دریائے سندھ سے دو میل کے فاصلہ پر ایک کھلے میدان میں واقع ہے۔ دریا سے نہر کو کاٹ کر یہاں لایا گیا ہے تاکہ شہر کو پانی کی سپلائی ہو سکے' اور اس سے شہر کے باغوں کو سرسبز رکھا جا سکے۔ 1699ء تک شہر میں بادشاہ کے باغات بڑی اچھی حالت میں تھے کہ جن میں پھلوں اور میوں کے بے شمار درخت تھے خاص طور سے انار بے انتہا لذیذ ہوتے ہیں۔ میں نے زندگی میں اس جیسا لذیذ انار پھر کبھی نہیں کھایا۔

میرے آنے سے تین سال پہلے بارش نہ ہونے کی وجہ سے شہر اور اس سے ملا ہوا علاقہ ویران ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہر میں تقریباً 8 ہزار یا اس سے زیادہ لوگ مر گئے تھے' یہ وہ شہر تھا کہ جہاں سلک اور روئی سے کپڑے تیار ہوتے تھے' یہ کاروبار بھی ختم ہو گیا تھا۔ آدھا شہر تباہ ہو گیا تھا اور آبادی سے خالی تھا۔ یہ وجہ تھی کہ نواب شہر سے باہر کیمپ لگائے ہوئے تھا کہ جہاں میں اس سے ملنے گیا تھا۔ کیمپ کو چوکور انداز میں لگایا تھا' اس کے اردگرد ایک خندق کھدی ہوئی تھی جو کہ تین گز چوڑائی میں تھی اور گز گہری تھی۔ خندق کے بعد جو کھلا میدان تھا وہاں 4 فٹ اونچی فصل بنا دی گئی تھی۔ اس کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے سے سیدھی سڑک اس کے بالمقابل دروازے تک جاتی تھی' جس کی وجہ سے صلیب کی شکل بن جاتی تھی۔ نواب کا محل اس صلیب کے بیچ میں واقع تھا۔ خندق کو دریائے سندھ کے پانی سے بھر دیا جاتا تھا اور جب ضرورت ہوتی تھی' اسے خشک بھی کر دیا جاتا تھا' اس پانی کو کیمپ سے دو میل کے فاصلہ پر ایک دلدلی علاقہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔

دریائے سندھ کشمیر تک جہاز رانی کے قابل ہے' اس کی ایک شاخ کابل تک جاتی ہے' جب کہ دوسری شاخیں پنجاب' لاہور' ملتان اور بکھر کو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ تمام شہر جو اس کے ساتھ ساتھ واقع ہیں وہ اس اندرون ملک کی جہاز رانی سے مستفید ہوتے ہیں ان کے جہاز کفتیز (Kifties) کہلاتے ہیں اور ہر سائز کے ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا 200 ٹن وزن اٹھا سکتا ہے۔ ان کی زیر سطح ہموار ہوتی ہے' اس کی دونوں جانب اگلے حصہ سے آخر تک کیبن بنے ہوتے ہیں۔ ہر کیبن میں ایک باورچی خانہ ہوتا ہے اور ٹائلٹ کی جگہ جہاں سے کہ گندگی سیدھی پانی میں جا گرتی ہے۔ یہ کیبنز مسافروں کو کرایہ پر دی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ اپنے سامان ضروریات کے تحت علیحدہ رہ سکیں۔ ہر مسافر اپنی کیبن کو بغرض حفاظت تالہ بند رکھ سکتا ہے۔ اس طرح اس کا سامان تجارت ہر اس جگہ فروخت کے لیے تیار رہتا ہے جہاں کہ منڈی میں مانگ ہوتی ہے۔ میں نے اب تک اپنی زندگی میں سفر کی اس سے زیادہ دریا یا سمندر میں سہولتیں اور کہیں نہیں دیکھیں۔ کشتیوں اور جہازوں پر بڑے سائز کا مستول ہوتا ہے' اس کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے کہ جب سخت ہوائیں چلتی ہیں' لیکن جب ہوا بند ہو تو ان کو کھولا نہیں جاتا ہے۔ ان کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جہاز میں کافی تعداد میں لوگ ہوں تاکہ اس وقت جب کہ ہوا مخالف ہو تو وہ لہروں کے خلاف چل سکیں۔ لہٰذا ٹھٹھہ سے لاہور کا سفر 6 سے 7 ہفتوں میں طے ہوتا ہے' لیکن لاہور سے واپسی میں کوئی 18 دن لگتے ہیں' اور کبھی کبھی یہ سفر بارہ دن میں بھی ہو جاتا ہے۔

ٹھٹھہ کے قریب دریا کی چوڑائی تقریباً ایک میل ہو گی۔ جب میں نے سیسہ کو رسی کے ذریعہ پانی میں ڈال کر اس گہرائی کو جانچا تو یہ چھ فیتھم (Fatham) گہرائی تھی (ایک فیتھم میں چھ فٹ ہوتے تھے) لہریں کوئی زیادہ تیز نہیں تھیں۔ اس لیے اس کی رفتار ایک گھنٹہ میں دو یا ڈھائی میل کی تھی۔ دریا میں مچھلیوں کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں۔ ان میں سے مچھلی کی ایک قسم تھی کہ جو اس قدر لذیذ تھی کہ ایسی مچھلی میں نے اب تک نہیں کھائی تھی (شاید یہ پلا مچھلی ہو) ان میں سے کچھ مچھلیوں کا وزن 20 پاؤنڈ سے زیادہ تھا۔ ہم ان میں سے کچھ کو زندہ ٹھٹھہ کی مارکیٹ کے لیے لے کر آئے۔ ان کے ہاں کالے رنگ کے مویشی بہت ہیں۔ بہت صحت مند بکریاں اور بھیڑیں جن سے کہ 80 سے 100 پونڈ تک گوشت مل جاتا ہے۔ ان کے گھوڑے چھوٹے ہوتے ہیں' مگر محنتی اور سخت جان اور تیز رفتار۔

ہرن' خرگوش اور لومڑیاں جنگل میں شکار کے لیے بہتات سے ہیں۔ ان کا شکار وہ کتوں' چیتوں اور ایک خطرناک قسم کی مخلوق سے کرتے ہیں۔ یہ سائز میں لومڑی کے برابر ہوتی ہے۔ اور اس کے کان لمبے خرگوش کی طرح ہوتے ہیں' منہ اس کا بلی کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ اور اطراف کالے جب کہ اس کا پیٹ اور سینہ سفید ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ یہ کوئی بہت ہی نایاب قسم کا جانور ہے کیونکہ میں نے اسے تعداد میں ایک سے زیادہ نہیں دیکھا۔ جب انہیں شکار کے لیے لیجایا جاتا ہے تو گھڑسوار اسے پیچھے بٹھالیتا ہے' اس کی آنکھوں پر پٹی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ہرن انسانوں سے بہت انسیت رکھتے ہیں' اس لیے وہ اس وقت تک نہیں بھاگتے جب تک کہ گھوڑے بالکل قریب نہیں آجائیں۔ وہ سوار کہ جو اس شکاری جانور (Shogoose) کو لیے ہوئے ہوتا ہے وہ اس کی آنکھوں سے پٹی اتارتا ہے اور شکار کو دکھاتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی وہ گھوڑے سے چھلانگ لگا کر تیزی سے بھاگتے ہوئے ہرن کی پیٹھ پر حملہ کرتا ہے اور اپنے شکار کی آنکھیں کھرچ کر باہر نکال دیتا ہے تاکہ شکاری اسے آسانی سے شکار کر سکے۔ چیتے اپنے شکار کو بھگا بھگا کر تھکا دیتا ہے' یہی کام کتے بھی کرتے ہیں' مزید یہ کہ اگر شکار پانی میں گر جاتا ہے تو وہ تیرتا ہوا جاتا ہے اور وہاں سے اسے اٹھالاتا ہے۔ ان کے پاس بڑی تعداد میں مور' کبوتر' فاختائیں بطخیں ان کی مختلف اقسام جیسے (Teal) جنگلی بطخ (widgeon) جنگلی ہنس' ایک قسم کی لمبی چونچ والی مرغابی (Curlew) تیتر اور پلوور (Plovers) ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ جس قدر چاہے ان کا شکار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے باغوں اور کھیتوں میں ایک خاص قسم کا پھل بوتے ہیں جو سلاب (Salab) کہلاتا ہے' یہ سائز میں شفتالو کے برابر ہوتا ہے' لیکن اس میں کوئی بیج نہیں ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے پہلے وہ اسے خشک کر لیتے ہیں اور اسے پوڈر کر کے اسے چائے یا کافی کی طرح شکر کے ساتھ پیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے ذہنی تناؤ کم ہو جاتا ہے اور انسان چاق و چوبند رہتا ہے۔

اس ملک میں اناج' چاول' دالوں اور گھوڑوں و مویشیوں کے چارے کی بہتات ہے۔ انہیں قحط کی تکالیف و اذیت کا احساس نہیں ہے۔ اپریل' مئی اور جون کے مہینوں میں دریائے سندھ کا پانی نشیبی علاقوں میں آجاتا ہے' جب یہ سیلاب ختم ہوتا ہے تو اپنے پیچھے زمین پر مٹی کی تہہ چھوڑ جاتا ہے' یہ اس کے خشک ہونے سے پہلے اس میں بیج ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہر فصل خوب عمدہ ہوتی ہے۔

اس ملک کی دوسری پیداوار میں شورہ' بوریکس (Boret) نیلا رنگ کی معدنی شئے

'(Lapis Lasuli) قابل ذکر ہیں خام سلک اچھی کوالٹی کی نہیں ہوتی ہے جو سلک یہاں بنائی جاتی ہے اسے یہ ''جامہ وار'' کہتے ہیں۔ جو کپڑا سلک اور روئی کے ملانے سے بنتا ہے وہ کوٹے نی (Cuttenees) کہلاتا ہے' سلک اوران کی ملاوٹ والا کلبلے (Culbulays) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ جو کپڑا بناتے ہیں اسے جوڑی (jurries) کہتے ہیں۔ یہ بہت نفیس اور ملائم ہوتا ہے' ساتھ ہی قیمتاً سستا بھی۔ بستر کی چادریں بھی دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ یہ خوبصورت فرنیچر بناتے ہیں کہ جس پر ہاتھی دانت سے مرصع کاری کی جاتی ہے۔ دنیا کے بہترین تیر کمان بھینسیں کے سینگوں سے ملتان میں تیار ہوتے ہیں۔ اگر وہ میزوں اور دوسرے فرنیچر میں خوبصورتی کے لیے بھراؤ کرتے ہیں مگر اس میں چین ان سے آگے ہے۔ یہ مکھن سے بنے گھی کو کپیوں میں بند کر کے بڑی تعداد میں باہر کی منڈیوں میں بھیجتے ہیں۔ جب اس گھی میں نمک ملا دیا جاتا ہے تو یہ پورے سال تازہ رہتا ہے' لیکن جب یہ پرانا ہو جاتا ہے تو خراب ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک خاص قسم کی لکڑی ہوتی ہے' بلکہ اسے لکڑی سے زیادہ جڑ کہا جائے تو بہتر ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اب کہیں نہیں پڑھا' لیکن یہ خوشبو کا ایک اہم عنصر ہے۔ یہاں پر یہ بڑی تعداد میں پیدا ہوتی ہے اور اسے سورت میں برآمد کیا جاتا ہے' یہاں سے یہ چین کو بھیجی جاتی ہے کہ جہاں یہ مہنگے داموں فروخت ہوتی ہے۔ اسے کوٹ کر اس کا پاؤڈر بنا لیا جاتا ہے اور تمام بت پرست انگیٹھیوں میں رکھ کر بتوں کے سامنے اس کی خوشبو کو پھیلاتے اور عبادت کرتے ہیں۔

یہاں کا قانونی مذہب اسلام ہے' لیکن ایک مسلمان کے مقابلہ میں 10 غیر مسلم ہیں لیکن ٹھٹھہ کا شہر مسلم ادب کی تعلیم میں مشہور ہے یہاں الہیات' فلسفہ اور سیاست کے علوم پڑھائے جاتے ہیں' اس مقصد کے لیے تقریباً چار سو سے زیادہ تعلیمی ادارے ہیں کہ جہاں نوجوان طالب علم فیض یاب ہوتے ہیں۔ میری الہیات کے ایک پروفیسر سے دوستی ہو گئی یہ خود کو اچھا مورخ بھی سمجھتا ہے۔ ایک دن اس نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا میں اپنے ملک کے سکندر اعظم کو جانتا ہوں۔ میں نے کہا یقیناً اور پھر اسے اس جنگ کے بارے میں بتایا کہ جو پورس سے ہوئی تھی' اور جس میں وہ فتح یاب ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ ان کی تاریخ کی کتابوں میں سکندر اور پورس کا واقعہ درج ہے۔ مگر مختلف انداز میں ہے اور دونوں بادشاہوں کے ناموں میں بھی فرق ہے' اور اس میں بھی کہ سکندر نے دریائے سندھ کیسے پار کیا۔ اس نے کہا کہ ان کی کتابوں میں الکزنڈر کے بجائے سکندر ہے اور

یہ سکندر ایک بڑا جادوگر تھا' اس نے ہزاروں جنگلی ہنسوں کو بلایا کہ جنھوں نے اس کی فوج کو دریا پار کرایا۔ پورس کے ہاتھیوں نے جادو کی وجہ سے اس کی فوج کی طرف رخ نہیں کیا۔

یہاں پر سابق میں پرتگیزیوں نے ایک چرچ تعمیر کیا تھا جو کہ شہر کے مشرقی حصہ میں تھا۔ یہ مکان ابھی تک باقی ہے اس میں عیسائی اولیا کی تصاویر اور قربان گاہ کی چادر بھی ہے جو یہ مجھے فروخت کرنا چاہتے تھے' مگر میں ان چیزوں کا تاجر نہیں ہوں۔

غیر مسلم اپنے مذہبی عقائد میں بالکل آزاد ہیں۔ یہ اپنے روزے اور تہوار اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ پرانے وقتوں میں ان کا دستور تھا جب کہ ان کے اپنے بادشاہوں کی حکومت تھی۔ یہ اپنے مردے جلاتے ہیں' لیکن عورتوں کو اپنے شوہروں کے ساتھ جلنے سے روکا جاتا ہے۔ یہاں ہاتھی دانت کی بڑی مانگ ہے' کیونکہ اس کی بنی چوڑیاں عورتیں پورے بازوں پر پہنتی ہیں' یعنی کہنی سے لے کر پہنچے تک۔ ان کے مرنے پر یہ تمام چوڑیاں ان کے ساتھ جلا دی جاتی ہیں۔

جس زمانہ میں میں وہاں تھا' میں نے ان کے کئی تہوار دیکھے' ان میں سے ایک فروری میں چاند نکلنے پر ہوتا ہے' اسے یہ ہولی کا تہوار کہتے ہیں اور اس موقع پر یہ مسخرانہ حرکات کرتے ہیں۔ تمام عورتیں اور مرد گلیوں میں نکل آتے ہیں۔ اور ڈھول تاشے بجاتے ہیں۔ عورتیں مٹھائی کی ٹوکریاں سر پر رکھے ہر شخص کو مٹھائی کھلاتی ہیں۔ مرد ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہیں اور ایک دوسرے پر احتیاط سے تیل ملتے ہیں۔ جب وہ کسی کے گھر میں جاتے ہیں تو وہاں بھی تیل چھڑکتے ہیں کہ جس کی بو اچھی نہیں ہوتی ہے لیکن وہ گھروں سے باہر لوگوں پر عرق گلاب چھڑکتے ہیں اور چاندی کے سکے خیرات کرتے ہیں۔

دریائے سندھ کو یہاں سے دیکھنا مشکل ہوتا ہے' مگر ایک ولی اللہ کے لیے جو مقبرہ بنایا گیا اس میں ایک مینار تعمیر کر دیا ہے جو ''سندھی مینار'' کہلاتا ہے۔ اس پر سفید قلعی ہے تا کہ یہ ہمیشہ دور سے نظر آتا رہے' یہاں سے ایک نہر جو دریا تک جاتی ہے وہ بہت تنگ ہے اور ڈھائی فیتھم سے اونچی نہیں ہے' لیکن دریائے سندھ کی یہ چھوٹی شاخ ہے جس سے شہر کو پانی ملتا ہے اسے ''دیولی'' یا ''سات مہنبہ'' والی کہا جاتا ہے یہ دوسری نہروں کی طرح سمندر میں جا کر گر جاتی ہے۔

❁

سندھ دربار

ٹی۔ پوسٹن/سعودالحسن خان

(یہ باب ٹی۔ پوسٹن کی کتاب Personal Observations of Sind سے لیا گیا ہے)

سابقہ باب کی نسبت اس باب میں تالپور سرداروں یعنی امیران سندھ کا زیادہ بہتر طریقے سے تعارف کرانے کے لیے مناسب یہ ہے کہ ان کے درباروں کے بارے میں بتایا جائے جو اس ملک کے حصوں میں ہیں۔ ابتداء ہم جنوبی سندھ میں حیدرآباد کے شہر سے کریں گے۔ یہ شہر جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے' پورے صوبے کا دارالحکومت شمار ہوتا ہے۔ اسے غلام شاہ کلہوڑہ نے آباد کیا تھا۔ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر شمال میں جو خدا آباد نامی شہر ہے اسے تالپوروں بالخصوص فتح علی اور اس کے بھائی غلام علی نے اپنی زیر سرپرستی آباد کیا تھا اور وہیں پر رہائش اختیار کی تھی۔ وہیں پر ان کے مقبرے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی قبریں بھی اسی ترتیب سے ہیں کہ جو ترتیب حیثیت میں ان سب بھائیوں کی آپس میں تھی۔ تاہم ان کے بعد حیدرآباد نوابان کی پسندیدہ جگہ بن گیا کیونکہ یہاں پر قلعہ اور پناہ گاہ یا فصیل (جو شہر کے بالکل برابر ہے) بھی تھے۔ یہاں پر صرف امیران' ان کے خاندان' ذاتی محافظ یا ملازمین رہتے ہیں۔ اس مضبوط مرکز پر جہاں پر سندھ کے سردار رہتے ہیں' ایک نظر ڈالنے سے ہی ان کی قبائلیت اور سادگی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ قلعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے وسط میں ایک بہت بڑی اور مضبوط فصیل بھی ہے جو دیکھنے میں بہت خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس کے اردگرد درختوں کے گھنے جھنڈ ہیں اور دریا کی ایک شاخ جو قلعہ کی دیواروں کے ساتھ سے گزرتی ہے وہ منظر کو اور حسین کر دیتی ہے۔

حیدر آباد کو امیروں نے جو رہائش گاہ بنایا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ عین وسط میں واقع ہے اور دریا کے حوالے سے ان کو سیر وشکار کی بھی سہولت رہتی ہے۔ اس کی آب وہوا کے بارے میں بھی خوش کن بیانات سامنے آتے ہیں گو کہ سال کہ بعض موسموں میں یہ حد درجہ (Sultry) ہو جاتی ہے۔ یہاں کا موسم ڈیلٹا کی نسبت کافی خشک ہے۔ مگر پڑوسی علاقوں کی نسبت کافی بہتر ہے۔ جنوبی سندھ سمیت یہاں پر بھی مون سون کی ہوائیں خوب آتی ہیں اور سہون سے آگے ایک خاص قلیل مدت کے لیے شدید ترین گرمی بھی پڑتی ہے۔ یہ شہر ملک کا دارالحکومت بننے کے لیے کافی ہے۔ اس کی جگہ بھی ٹھیک ہے مگر تجارت یہاں پر کم ہوتی ہے اور وہ بھی صرف شہر کی ضروریات پوری کرنے کی حد تک شہر میں سرداروں کی موجودگی کی وجہ سے بازاروں میں اشیائے صرف کی موجودگی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ کلہوڑہ اور تالپور سرداروں' غلام شاہ اور کرم علی کی قبروں پر بڑے عمدہ مقبرے تعمیر کیے گئے ہیں جو شہر کی مخالف سمت میں پہاڑ پر ہیں۔ کرم علی کے مقبرے کی مرمت موجودہ حکمران خاندان کی جانب سے کی جارہی ہے مگر غلام شاہ کے مقبرے پر کوئی توجہ نہیں دی جارہی اگر چہ وہی سب سے زیادہ شاندار مقبرہ ہے۔

کسی بھی ملنے والے کی آمد پر امیر اس سے کچھ فاصلے پر قلعہ میں ہی ملاقات کیا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ چالیس یا پچاس گھوڑوں اور پیادوں پر مشتمل ایک دستہ بھی ہوتا ہے جو پیش خدمت کہلاتا تھا اور پوری طرح سے مسلح ہوتا ہے۔ اس دستے کے سرکردہ افراد امیر کے ذاتی دوست یا مختلف امیروں کے ملازم ہوا کرتے ہیں جو اپنے مالک کا نام لے کر آنے والے کو خوش آمدید کہا کرتے ہیں۔ کس مرتبہ کے شخص کو استقبال کے لیے مقرر کرنا ہے' یہ تو آنے والے شخص یا ملاقات کے مرتبے پر منحصر ہے۔ اگر کوئی شخص اچانک سے چلا آتا ہے تو گویا کوئی ہنگامہ کھڑا ہوا جاتا ہے۔ اور سندھی لوگ اس کی جانب لپک پڑتے ہیں۔ ان کے بڑے عہدیدار اس ملاقاتی کے گرد چکر لگاتے اور اس کے ہاتھ اٹھوا لیا کرتے ہیں۔ اس کے گھوڑے کی زین (Saddle) کی تلاشی ہوتی تھی گویا اسے برہنہ کر دیا جاتا ہے۔ اس دوران البتہ اس کی صحت کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے۔ ملاقاتی کے اعزاز میں سلامی بھی پیش کی جاتی ہے جو دراصل ابتدائی تقریب ہوتی تھی اور اس میں کافی وقت ضائع ہوتا تھا۔ یہ چیز سندھ میں آسانی سے ختم نہیں ہوئی ہے۔ ان مواقع پر تقریباً نصف درجن دفعہ یہی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو بڑا امیر بات کیا کرتا ہے۔ تمام سامعین اور اس کا دیوان

بھی خاموش رہتے ہیں۔

ہر امیر کا اپنا دیوان ہوا کرتا ہے اور سب کے الگ الگ ملازم ہوتے ہیں۔ ماسوائے سینارٹی (Seniority) کا لحاظ قائم رکھنے کے تقریباً تمام امیروں کے ہاں تقاریب ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ جب کوئی ایسا مسئلہ ہوتا کہ جس کا تعلق پوری قوم سے ہوتا تو تمام امیر دربار میں ملاقات کر کے اس پر غور کیا کرتے ہیں۔ اس وقت ہر کوئی اپنے زیر قبضہ علاقے کی نمائندگی کیا کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر ہر ملاقاتی کو تھالوں میں مٹھائی رکھ کر دی جاتی ہے جو اس کے لیے اور اس کے ملازمین کے لیے ہوتی ہے۔

ان مواقع پر محبت سے بھرا استقبال اور سخت مہمان داری سندھی ثقافت کی خصوصیات ہیں' اس دربار میں ہم نے کوئی ایسی عمدگی نہ دیکھی تو مشرق میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ جنگلی بلوچیوں اور فوجی افسران کے گروہ جو ہر جانب نظر آتے ہیں وہ اتنے اجنبی طریقے سے کھڑے رہا کرتے ہیں کہ گویا آنے والا قدیم ترین اطوار کے حامل لوگوں کے درمیان ہے اور یہ سردار کسی فوجی جاگیردارانہ ریاست کا حکمران ہے۔ بلوچیوں کی بدتمیزیاں یا بے ضابطگیاں بعض اوقات ان کے امیر کی موجودگی میں بھی ظاہر ہو جایا کرتی ہیں۔ گو کہ یہ لوگ اپنے سرداروں کے ساتھ وفادار ہیں مگر ان میں ان کا صحیح طریقے سے احترام کرنے کا مادہ نہیں ہے' دربار حیدرآباد اس وقت تو اور بھی بدمزگی کا مظاہرہ کیا کرتا ہے کہ جب کوئی رقاصہ دربار میں ناچتی ہے اور یہ جنگلی لوگ بے قابو ہو جایا کرتے ہیں اور ڈھول و تاپ پر مچلنے لگتے ہیں۔ یہ رقاصائیں حبشی عورتیں ہوا کرتی ہیں۔

جو سردار حیدرآباد میں رہتے ہیں ان میں سب سے بڑا سردار نصیر خان تھا (جو مراد علی کا آخری زندہ بیٹا ہے) وہ بہت خوش اطوار اور خوبصورت ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ وہ بڑی مشکل سے چل پھر سکتا ہے۔ اس کی عمر تقریباً 45 سال ہے۔ اس شہزادے کے کردار کی ناکامی کا سب سے بڑا اسبب کوتاہ نظری پر منحصر اس کی حکمت عملی اور حد سے زیادہ لالچ ہے۔ ان چیزوں نے اس کی جائیداد کو ہی نقصان نہ پہنچایا بلکہ ذرائع آمدنی میں اس کا حصہ بھی کم کر دیا۔ اسی وقت سے خاندانی تنازعے بھی شروع ہو گئے۔ البتہ نیم بربریت اور محدود تعلیم کی وجہ سے اس میں جو برائیاں

مرحوم نصیر خان ہمیشہ ان گروہوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا رہا کہ جنہوں نے خاندان میں جھگڑے کھڑے کیے رکھے۔اس کا ایک بیٹا تھا۔ جب اس تحریر کے مصنف نے آخری بار اس ملاقات کی تو وہ اس نوجوان کو انگریزی پڑھا رہا تھا۔اس نوجوان کے باپ نے وضاحت بھی کی کہ یہ اس لیے ہے تا کہ آئندہ وہ مترجمین اور منشیوں کا محتاج نہ بنے بلکہ اپنے معاملات خود طے کرے۔نصیر خان اپنے بڑے بھائی نور محمد کی وفات پر تالپور گھرانے کا سربراہ بن گیا مگر اس کے دونوں بھتیجوں نے جب جائیداد اور مقبوضات میں اپنے باپ کا ترکہ حاصل کیا تو انہوں نے دربار میں بھی حیثیت حاصل کر لی اور اس کے برابر کرسیوں پر براجمان ہونے لگے حالانکہ انہیں اصولاً ایک سیڑھی نیچے بیٹھنا چاہیے تھا۔اس کی وجہ سے بڑے امیر کا اثر ورسوخ بہت کم ہو گیا۔مزید اس وجہ سے بھی کہ ان نوجوانوں کو اپنے معاملات میں برطانوی حکومت کے پاس براہ راست اپیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ان میں سے چھوٹے بھتیجے نے اپنے چچا کے خیالات کو اپنے مفاد کے خلاف خطرہ سمجھ کر اسکے خلاف بڑا مضبوط گروہ تیار کر لیا ہے۔البتہ نصیر خان نے اپنے مرحوم بھائی کی طرح سے اپنے ذاتی وقار کو برقرار رکھنے کی غرض سے گروہی عصبیت کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔

میر محمد ولد غلام علی تالپور جو نصیر خان کا چچیرا بھائی ہے وہ صفدر ولد فتح علی بانی حکومت تالپور کے ساتھ مساوی درجہ پر تھا۔ میر محمد بوڑھا آدمی تھا اور اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔البتہ وہ با مقصد تھا لیکن اس کی ذہانت بہت کمزور تھی اور وہ اپنے چچازاد بھائی نصیر کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا جس نے اس کی موت پر اس کی پوری جائیداد پر قبضہ کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔صفدر کلیتاً غیر جارح شخصیت کا حامل تھا۔ 1839ء میں کابل کے خلاف دیگر امیروں کی جانب سے افواج بھیجنے کی عمومی مخالفت کے باوجود وہ ان سے کافی اختلاف رکھتا تھا اور اس نے دیگر تین امیروں پر عائد خراج میں حصہ ڈالنے کی پیشکش کی تھی۔اسنے ہمیشہ ایسے کسی فعل سے بچنے کی کوشش کی کہ جس کی وجہ سے کسی بھی مشکل میں الجھنا پڑے۔اور یوں برطانوی ارباب حل وعقد کی نیک نیتی کو تسلیم کر لیا۔اس کو خراج سے مستثنیٰ کیے جانے کی وجہ سے خاندان کے دیگر اراکین اس سے حسد کرنے لگے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ ان میں پسند نہ کیا جاتا تھا۔اس کے دو لڑکے تھے۔

مرحوم نور محمد کے بیٹے یعنی شہزادے شہداد خان عمر 29 سال اور حسین علی خان عمر 20 سال وہ اپنے چچا کے نظریات کے تابع رہتے ہوئے اور اس کی قانونی نگہداشت کی وجہ سے بھی بہت کشیدہ

خاطر ہو گئے تھے۔شہداد خان کردار میں اپنے باپ سے بہت متاثر ہے (یعنی عظیم صلاحیت' نیکی اور دورخی حکمت عملی) وہ اپنے اطوار کے حوالے سے بھی پسند کیا جاتا ہے۔ البتہ وہ اپنے وطن کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔

حسین علی کو چھوٹا ہونے کی وجہ سے اپنے ہوا خواہوں کی ہدایات ماننی پڑتیں ہیں۔ البتہ وہ اپنے ولی کی قابل قدر معاونت کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا کرتا ہے۔ احمد خان سردار قبیلہ لغاری جو میر محمد کی وفات کے وقت اس کا وزیر اعظم تھا' وہ بہت اچھا شخص اور اپنی خاصیتوں کی وجہ سے ہندوستان کے سب سے زیادہ شان وشوکت والے دربار کا ہیرا کہلاتا تھا: بعدازاں تالپور مجالس میں اس سردار اور اس کے پاس ولی محمد مرحوم کا اثر ورسوخ آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا اور اس نے دربار میں آنا ہی چھوڑ دیا پھر وہ زیادہ تر اپنی جاگیروں تک ہی محدود ہو گیا۔ یہ جاگیریں بہت بڑی ہیں اور لاڑکانہ میں ہیں۔ جب تالپوروں کے نصیب ٹمٹمار ہے تھے تب بھی اس کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ اس نے اس موقع پر بھی اپنی قربانی کو استعمال نہ کیا جب اس کے خاندان کے افراد نے اپنے دفاع کے لیے ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ شہزادہ حسین علی' احمد خان کی جانب بہت جارحانہ رویہ رکھتا تھا ا، راس بات کا ذرا بھی احساس نہ کرتا تھا کہ یہ عمر رسیدہ شخص اس کے مرحوم باپ کا دوست ہے۔ اس کے باپ ولی محمد کی سندھ میں بڑی شہرت تھی اور سارے ہی طبقات اسے اتنے اچھے الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے کہ سندھ کے اس خاندان کے ڈرامائی عروج وزوال میں آنے والے امیروں میں سے کسی کو بھی یاد نہ کیا گیا ہوگا۔ احمد خان کا ذاتی دوست ہونے کی حیثیت سے یہ مصنف ان شاندار لمحات کو یاد کرتا ہے جو اس نے حیدرآباد کے اپنے آخری دورے کے وقت اس کے ساتھ گزارے تھے۔ اور اس کی مہربانی ومہمانداری کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ اس کی عوامی خصوصیات اتنی زیادہ مشہور ہیں کہ اسے سندھی حکومت کے تمام سرکردہ حضرات میں سب سے اونچا مقام دیا جاتا ہے۔

حیدرآباد کا درباران سرکردہ اشخاص پر مشتمل ہے۔ ہر سردار اپنے کوٹے میں پرکارداروں' منشیوں اور دیگر عہدیداران سرکار کا تقرر کرتا ہے۔ یہ لوگ ہندوستان اور ایران وغیرہ کے تمام کونوں سے مقدس اساتذہ اور خاص پسندیدہ افراد میں سے لیے جاتے ہیں۔ عام مشرقی درباروں کی طرح سے بعض لوگ تو انتہائی پست درجے سے اٹھا کر اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ دربار حیدرآباد میں موجود سندھی شہزادے بہت ناتجربے کار اور کمزور ہیں۔

مجموعی طور پر یہ دربار حسد کا منظر پیش کرتا ہے کیونکہ ہر امیر اس اجنبی طرز حکومت کی وجہ ایک دوسرے کی جانب حسد اور شک وشبہ کا شکار رہتا ہے۔ اور ہر کوئی اس فکر میں رہتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی سردار کو کس طرح سے اس کی مقبوضات سے محروم کردے یا انہیں نیچا دکھاوے۔ اور یہ بات تو اس حد تک آگے چلی گئی ہے کہ ہر کوئی اپنے اپنے ذاتی تحفظ کی فکر میں رہتا ہے۔ ہر شہزادے کی فوج کی بڑی تعداد ہر وقت مستعد رہتی ہے۔ اور جب امیر دارالحکومت سے شکار وسیر کی خاطر باہر نکلتے ہیں تو ہر ایک کے پاس بڑی تعداد میں فوج ہوتی ہے جو کسی بھی عجیب کیفیت سے نبٹنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ مگر پھر بھی دشمنی اور بداعتمادی کی اس کیفیت کے باوجود اندرونی طور پر سارے سندھی سردار ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں۔ اور جب تحفظ وعزت کا مسئلہ ہوتا ہے' خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی' تو وہ سب کا مجموعہ مفاد بن جاتا ہے سب اس بات کے تحفظ کی خاطر متحد ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ غیر معمولی معاہدہ کب تک چلے گا اس کے بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس بات کی جڑیں بہت مضبوط ہیں ہم چند لفظوں میں اس بات کی وضاحت یوں کر سکتے ہیں کہ ایسا سچ مچ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ ان سب کے درمیان طاقت کا توازن مساوی ہے اور مخفی طور پر یہی چیز اس اتحاد کی بنیاد ہے۔ ایک ایسے جاگیردارانہ طرز حکومت میں جیسا کہ سندھ میں ہے' کوئی بھی امیر دیگر جاگیرداروں کی ایک بڑی اور معقول تعداد کے تعاون کے بغیر دوسرے امیر کے حقوق کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ ہر امیر کی اچانک تلاشی ہو سکتی ہے یا اس کے اسلحے کا معائنہ کیا جا سکتا ہے جو اگر غیر معمولی حالت میں لے لیا جائے تو پھر تالپور اسے کبھی واپس نہیں کرتے خواہ اس کی کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔ اس طرح سے ایک امیر کا مفاد سب امیروں کا مفاد بن جاتا ہے اور مشکوک باتیں کسی بھی امیر کو ناانصافی کرنے پر ابھارتی ہیں تو اکثریت اس کے خلاف ہو جاتی ہے کیونکہ وہ سب انفرادی طور پر یا پھر اجتماعی طور پر یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے خاندان کے کسی بھی ایک فرد کو اس کی حدود سے تجاوز کرنے دیا یا اس کی مقبوضات پر کسی اور کا قبضہ ہونے دیا تو ناگزیر طور پر سب کی قسمتیں ہی بند ہو جائیں گی۔ یوں اس وقت کسی بھی جانب سے شدید ردعمل بھی ہو سکتا ہے۔ یوں وہ خاندان کے کسی سینئر رکن کے ذریعے اپنے خاندانی نظام میں پیدا ہونے والے تنازعات کو حل کرواتے ہیں اس طرح سے اس سینئر رکن کی عزت تو بڑھ جاتی ہے مگر اس کے

اختیارات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اکثر قابل ذکر خاندانی تنازعات کہ جو گذشتہ چند برسوں میں حیدرآباد میں دیکھنے میں آئے ہیں وہ سربراہ خاندان نور محمد کی وفات کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس سردار کی اہلیت اور اثر ورسوخ کو ہر سطح پر سب لوگ تسلیم کرتے تھے۔ اوراس کی ذات میں خاندان کے بنیادی پتھر کی جھلک دکھائی پڑتی تھی۔ اور وہ پرانا نظام کہ جس پر یہ خاندان قائم تھا اس کی زندگی تک محفوظ رہا تھا۔ اس نے اپنی حیثیت کے حامل کسی بھی شخص کو اپنا جانشین نہیں چھوڑا (یعنی اس کی کوئی اولاد نہ تھی) یوں اس کے بھائی نصیر خان نے اس کی جگہ لینے کی کوشش کی۔

اس خاندان کے ایک اور رکن شیر محمد تالپور نے میرپور کے قلعے پر قبضہ کر رکھا ہے جو حیدرآباد کے مشرق میں ہے جن جماعتوں کا اس سے تعلق رہا ہے وہ اس کی تعریف نہیں کرتے۔ چونکہ ہمارا اس سے تعلق بہت کم رہا ہے اس لیے اس کے بارے میں معلومات بہت کم ہی رہی ہیں۔

اس خاندان کی خیرپور شاخ کا اسی نام کے شہر پر قبضہ ہے جو بالائی سندھ میں موجود ہے جہاں پر بھی اسی کیفیت و حالت کے حامل شہزادے رہائش پذیر ہیں۔ گو کہ کشیدگی حیدرآباد کی نسبت یہاں پر ذرا کم ہے۔

خیرپور کا سردار میر رستم ہمیشہ دربار کی سربراہی کرتا ہے اور اس کے سامعین میں نصف تو شہزادے ہی ہوتے ہیں جو زیادہ تر اس کے اپنے یا اس کے بھائی کے خاندان کے ہیں۔ اس کا وزیر اور اس کے کئی لڑکے حکومت کی گاڑی کو دھکا دے کر چلا رہے ہیں۔ دربار میں بلوچی بہت ہیں یہی وجہ ہے کہ وہاں پر کردار اور رسوم کے حوالے سے قومیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ غربت کی وجہ سے ریاست خیرپور کی مالی حیثیت بہت غیر اطمینان بخش ہے۔ ملک اور حکومت کی تقسیم جاگیردارانہ نوعیت کی ہے اور کئی سرداروں کو اراضیاں دی گئی ہیں۔ امیر کی بس اتنی ہی آمدنی ہے کہ وہ بڑی آسانی سے اپنے اور اپنے خاندان کے اخراجات برداشت کر سکے۔ بلکہ اکثر و بیشتر اسے اپنے اخراجات کے لیے معقول رقم کی وصولی کے لیے کافی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے دربار خیرپور اپنے عوام کے ساتھ بالخصوص شمالی سندھ کے ہندوؤں کے ساتھ ناروا سلوک اختیار کرتا ہے۔

خیر پور زرخیز میدان کے وسط میں واقع ہے۔ اور جب روہڑی سے دریا کے کنارے کنارے یہاں آیا جائے تو راستے میں بہت سے باغات پڑتے ہیں۔ جہاں پر سندھ کی تھکا دینے والی دھوپ سے بچنے کے لیے سایہ مل جاتا ہے۔ خیر پور میں کوئی ایسی بات نہیں کہ اسے دارالحکومت کہا جائے ماسوائے تقسیم ملک کے۔ بلکہ جب سے سندھ کے امیروں نے یہاں رہائش اختیار کی ہے تب سے تو اس پر اور بھی کم توجہ دی جاتی ہے۔ ان کی رہائش گاہ شہر کے وسط میں چھوٹا سا مٹی کا بنا ہوا قلعہ ہے۔ اس کی حدود بھی بہت مختصر سی ہے اور اتنی بھی نہیں ہے کہ کافی تعداد میں (یعنی 17) سردار یہاں پر رہ سکیں۔ بلوچی تو ویسے بھی اس حوالے سے کوئی خاص رکھ رکھاؤ نہیں رکھتے۔ خاندان تالپور کی اس شاخ نے اپنے اجداد کے بہت سے قدیم اطوار اور رسوم و رواج کو دربار کے علاوہ گھریلو امور میں بھی آج تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ یہ ان کی عظمت کی علامت خیال کیے جاتے ہیں۔ مگر ان کا خزانہ مضبوط ہونے کے باوجود بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ ان کی بہت سی روایات کو پورا کر سکے۔

خیر پور کے تالپوروں کا سربراہ میر رستم ولد میر سہراب ہے (جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے اور جسے شمالی سندھ کا یہ علاقہ فتح علی نے جاگیر میں دیا تھا) وہ نرم مزاج بوڑھا شخص ہے۔ اور بہت اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔ وہ اتنا آزاد خیال ہے کہ ریاستی معاملات خود طے کیا کرتا ہے۔ حالانکہ اصل میں وہ سب ہی دوسروں کے ذمے ہوتے تھے مگر صرف ایک ہوشیار اور چالاک شخص کے۔ یہ شخص اس کا وزیر فتح محمد غوری ہے۔ میر رستم کا بہت بڑا خاندان ہے اور اس کے بیٹوں کی تعداد ہی آٹھ سے کم نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی دربار میں سازشوں کا شکار ہوتا رہتا ہے اور اپنے آخری ایام میں اپنے بچوں کے درمیان نااتفاقی کے بیج بو کر تباہی کی راہیں تیار کر رہا ہے۔ پورے سندھ میں اس امیر جیسا با مقصد اور غیر جارح کردار کا حامل شخص ملنا مشکل ہے۔ وہ صرف اپنی عمر کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہے۔ اس کے بال بھورے ہیں اور وہ بہت مہربان معلوم ہوتا ہے۔ سب ملنے والوں سے اچھے طریقے سے ملتا ہے۔ البتہ اس نے حکومتی اور ریاستی امور کی جانب بڑی غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اس نے باگ دوڑ دے رکھی ہے ان لوگوں نے اپنی کوتاہ نظری او رخود غرضی کی وجہ سے اس کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر دی ہیں اور خاندان میں بھی اس کے

لیے بڑے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ باہمی عدم اعتماد' تنازعات' حسد و رقابت اور خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے خیر پور کا حکمران خاندان جنوبی سندھ میں حکمران اپنے بھائیوں کا پوری طرح سے دست نگر ہے۔ بعد کے حالات تو بہت ہی بدتر ہو گئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میر رستم کو اس کے درباری اور اس کے عوام کے تمام طبقات بہت پیار کیا کرتے ہیں اور اس کا بہت احترام کیا کرتے ہیں۔ مگر یہاں پر ایک ایسے حکمران کی ضرورت لازمی امر ہے کہ جو سارے معاملات کو سنبھال سکے۔ کوئی بوڑھا شخص تو اس طرح کا کردار ادا ہی نہیں کر سکتا اور اس کے دربار میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو پورے سندھ کے اندر سب سے زیادہ بے چین ہیں اور رنجشی یا رقابتی کردار کے حامل ہیں۔ اس کا نتیجہ خاندان میں افتراق کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ جب بوڑھا سردار فوت ہو جائے گا' ایسا ہی فطرت کا تقاضا ہے جو جلد ہی وقوع پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔ تو خیال یہ ہے کہ اس کی جانشینی کا مسئلہ برطانوی حکومت کے سابقہ انتظامات کے مطابق حل کرنے کے لیے حیدر آباد کے حکمرانوں کو ہی مداخلت کرنی پڑے گی۔ شاید اس کے چھوٹے بھائی کو آگے لایا جائے گا جو پہلے ہی شیر کی مانند اپنے حصے پر نظریں گاڑھے ہوئے ہے۔ اس کا اگلا بھائی میر مبارک 1839ء میں فوت ہو گیا ہے اور اپنے پیچھے اس نے پانچ بیٹوں پر مشتمل بڑا گھرانہ چھوڑا ہے۔ جن میں سے سب سے بڑے نصیر خان نے اپنے باپ کی جائیداد کے بڑے حصے کو ترکہ میں حاصل کیا ہے اور اپنے بھائیوں کے لیے معقول وظیفے جاری کر دیئے ہیں۔ غلام حیدر ولد میر طرہ بھی اسی خاندان کا رکن تھا۔ لیکن اس کا چھوٹا بھائی میر علی مراد خاندان خیر پوری کا سب سے منفرد کردار ہے۔ لامحدود اولوالعزمی اور بڑے بڑے داؤ پیچوں کے امتزاج نے اس کو قابل ذکر صلاحیت کا حامل بنا دیا ہے۔ اس شہزادے نے ہمیشہ آزادی سے متعلق اپنے مقصد میں ہمیشہ استقلال اور ثابت قدمی دکھائی ہے۔ میر علی مراد خوبصورت ہے۔ اس کا رنگ البتہ ذرا سانولہ ہے اور تقریباً چالیس سال کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ماں بلوچوں کے مری قبیلے سے تھی۔ اسی بناء پر اس کے خدوخال ذرا امتیازی معلوم پڑتے ہیں۔ یہ سردار مہربان' باوقار اور باصلاحیت نظر آتا ہے۔ لیکن یہ جام کا بہت عادی ہے اور ایسے تمام نشے کرتا ہے جو قرآن کی رو سے ممنوع ہیں۔ البتہ اس عادت نے ابھی تک میر کی صحت یا اس کے کردار کو متاثر نہیں کیا ہے۔ اسے اپنی جوانی پر غرور ہے۔ اس کا ذہن بھی صاف ستھرا ہے۔ وہ

تا حال اپنے وقار کو پیش آنے والے مسائل سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ میر علی مراد ہر اس شخص سے حسد کرتا ہے جو اس کے معاملات میں مداخلت کرے۔ وہ اس بلوچی خاندان سے الگ تھلگ ہی دکھائی دیتا ہے جس کی شاخیں حیدر آباد اور خیر پور پر حکمرانی کر رہی ہیں۔ اس کے کارندے' کاردار' ساتھی اور دیگر اہل معاملہ سب غیر ملکی ہیں اور اس کی ساری فوج جو زیادہ تر پیدل پر مشتمل ہے' وہ ہندوستان' کابل' پنجاب اور بہاولپور کے لوگوں سے تیار کی گئی ہے۔ بلوچی جاگیرداریت اس کے نظام کا ثانوی حصہ ہے اسی لیے وہ اپنے ملک کے رواجات پر قائم ہے اور اپنے دیگر بھائیوں کی نسبت ممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اولوالعزمی نے ہی علی مراد کو اس بات پر اکسایا ہے کہ وہ حکومت کے امور اور اجداد کی روایات سے قطعاً مختلف و مخالف حکمت عملی اختیار کرے۔ اور اسی لیے غالباً اسے حیدر آباد یا خیر پور کے درباروں میں ناچاقی کا سامنا کرنا پڑا ہے کیونکہ اس نے فوج میں سارے ہی غیر ملکی بھرتی کیے ہیں۔ اس کے منصوبے مشکل سے ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ البتہ وہ برطانوی حکومت کے بھی قریب آنا شروع ہو گیا ہے۔ یوں اگر اس کے نظریات کی صحیح راہنمائی کی جائے تو یہ نظریات نہ صرف شعوری ہو سکتے ہیں بلکہ ان کا نتیجہ بھی شعوری ہی نکلے گا۔ میر علی مراد کا اہم کام شہر دیجی (Digi) پر قبضہ کر لینا ہے جو قلعوں کا مجموعہ ہے اور اس کی بہت نگرانی کی جاتی ہے۔ سندھ میں ہمارے داخلے کے بعد بہت عرصہ گزرنے کے باوجود میر نے کسی بھی برطانوی افسر کو اپنے قلعوں میں داخل ہونے سے منع کیا ہے۔ یہاں تک کہ خیر پور کی شہزادی کے ساتھ اپنی شادی کے موقع پر بھی امیر نے جب دیجی کی سیر کرائی تو ہر قلعہ سے ہمارے نمائندے اور اس کی جماعت کے لیے سلامی کی توپیں داغی گئیں مگر تب بھی اس نے اپنی طاقت پر شبہ نہ ہونے دیا۔ اس وقت اس نے اپنے رہائشی گاؤں کے نزدیک اپنے مہمانوں کی بڑی تواضع کی مگر افواج اور خزانے سے بھرے ہوئے اپنے اس مرکز پر کسی اجنبی نظر کو کسی بھی قسم کی جاسوسی کا موقع نہ دیا۔ میر علی مراد کا یہ نظام کہ جس نے برطانویوں کو بھی متاثر کیا ہے نہ تو ہماری حمایت میں ہے نہ ہی ہمارے خلاف ہے البتہ ہماری جانب اس کا ایسا منفی کردار ہے کہ جس سے وہ اپنی آزادی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ نیز اس نے ان تمام اجنبیوں کو پورے عزت و احترام سے نوازا جنہوں نے اس کے ساتھ ملاقات کی۔

سندھ کے سرداروں کا طرز رہائش اور ان کے گھریلو اخراجات کلیتاً ان کے کردار اور ان کی عادات سے متعلق ہیں۔ان میں اکثر ان کی آبائی باتیں شامل ہیں۔کسی مسلمان شہزادے کے گھریلو امور اخفائے راز میں ہی رہتے ہیں اور ان کے بارے میں صرف قیاس ہی لگایا جا سکتا ہے۔البتہ بعض اوقات کسی فعل کی زیادتی اس کا انکشاف کر دیتی ہے۔اس طرح کی کوئی ایک مثال تالپوروں کی ابتدائی تاریخ میں بھی بیان ہوئی ہے لیکن اس چیز کا براہ راست مشاہدہ کبھی نہ کیا گیا ہے۔سندھ کے امیروں کے خاندانوں کے وہ حصے جہاں پر ان کی بیویاں اور دیگر عورتیں ہوتی ہیں وہاں جانا ممنوع ہے۔گو کہ وہاں کوئی زیادہ پہرہ نہیں لگایا جاتا ہے لیکن اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ازدواج کی قانونی تعداد (یعنی چار بیویاں فی کس) سے ہٹ کر کنیز عورتوں کی معقول تعداد زنان خانے میں ہوتی ہے۔مگر ان سے پیدا ہونے والے بچوں کو مار ہی دیا جاتا ہے۔ تا کہ اعلیٰ نسبی میں رکاوٹ نہ آئے اور ناجائز اولاد کی تعداد کم سے کم رہے۔امیروں کی اپنی شادیاں ہم پلہ بلوچی خاندان میں ہوتی ہیں اسی طرح وہ اپنی لڑکیوں کی بھی شادی کرتے ہیں۔ہم پلہ بلوچی خاندانوں میں مری قبیلہ اور دیگر قبیلے شامل ہیں ان قبیلوں کو دیگر قبائل کے درمیان منفرد مقام حاصل ہے۔لڑکوں کو حرم میں تربیت دی جاتی ہے اور حرم سے وہ لڑکے تب ہی قطع تعلق کرتے ہیں کہ جب ایک خاص عمر تک پہنچ جائیں یا دربار میں آنا جانا شروع کر دیں۔تعلیم میں قرآن کی تعلیم اور محدود طور پر دربار میں بولنے لائق فارسی کی تعلیم کے علاوہ چند عام نظموں کا یاد کرنا پڑھنا شامل ہے مثلاً حافظ یا سعدی کے دیوان۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھی سردار بالکل ان پڑھ ہیں او راپنے ملک کی معلومات بھی نہ ہو سکنے کی وجہ سے جاہل ہیں،اس ضمن میں تالپور خاندان کی اگلی نسلیں بھی اپنے اجداد سے بالکل مختلف نہ تھیں اور نہ انہوں نے کسی اصلاح کی کوشش کی۔خاص طور پر حیدرآباد میں ان لوگوں کا سخت رویہ ان کو اپنے آباء سے وراثت میں ملا ہے۔ان کے ذوق میں تبدیلی لانے کے لیے کئی کوششیں کی گئیں جن میں یورپ کی آسائشی اشیاء اور گھریلو فرنیچر میں زیبائش کا استعمال وغیرہ شامل ہے۔مگر سب ناکام رہیں۔ہماری مصنوعات جو مختلف اوقات میں ان کو تحفے میں دی گئیں تھیں۔وہ تعداد میں کبھی ایک سے زیادہ منگوائی ہی نہ گئیں اور نہ ہی کبھی کاٹھ کباڑ کے طور پر رکھنے کی اجازت دی گئی۔انہوں نے ہتھیاروں اور گھوڑوں کے لیے کسی قدر چستی

دکھائی مگر اس معاملے میں بھی فارس' ترکی اور دیگر ممالک سے تلواریں اور بارود خریدنے پر اکتفا کیا۔ ان چیزوں کا ان کے پاس بہت بڑا خزانہ ہے۔ گوکہ اس ملک کا کوئی بھی فرد واحد اپنے قبضے میں تلوار یا توڑے دار بندوق نہیں رکھ سکتا لیکن وہ یہ چیزیں امیروں کو فروخت کر سکتا ہے۔ خراسان اور قلات سے بہترین گھوڑے یہاں آتے ہیں۔ اور اچھی نسل کے جانوروں کی اچھی قیمت ادا کی جاتی ہے۔ مکران کے سواری والے اونٹ یا پھر مارواڑ کے اونٹ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

سندھ کے امیروں کا لباس بلوچی ہونے کی وجہ سے کافی امتیازی معلوم پڑتا ہے جبکہ ان کے عوام یہ چیزیں مہنگی ہونے کی وجہ سے خرید ہی نہیں سکتے۔ سندھی امیروں کے لباس جن چیزوں پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ حیثیت والی چیزیں مہنگی لنگی' کشمیری چادر اور وہ پٹکا ہے جو کمر پر باندھا جاتا ہے۔ دوسرے نمبر پر ان کے سامان میں ٹوپی کو بڑا مقام حاصل ہے جس کو امیر سونے اور چاندی کے اجزاء سے سجا کر اوڑھتا ہے۔ تیسرے نمبر پر تلوار اور نیام ہیں۔ یہ سونے سے پر ہوتی ہیں اور ان کی بڑی اہمیت ہے۔ ڈھالیں بھی اسی دھات کی بنی ہوتی ہیں۔ امیر انگوٹھی کے علاوہ اور کوئی زیور استعمال نہیں کرتے۔ مسلمان عام طور پر ان چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔ فوجی لوگوں کے لیے ہتھیار ہی اس کا ذاتی زیور خیال کیا جاتا ہے۔ سردی کے موسم میں اس لباس میں ذرا موٹے سے بڑے کوٹ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ کوٹ ہمیشہ زرق برق نوعیت کا ہوتا ہے یا پھر چوڑے کپڑے کا جیکٹ بنایا جاتا ہے۔ جنگل میں کھیل کے لیے جاتے وقت گہرے ہرے رنگ کی ٹوپیاں اوڑھی جاتی ہیں تاکہ جنگل کے رنگ سے مشابہت رہے۔ سفر کے دوران چمڑے کے بڑے بڑے جوتے پہنے جاتے ہیں۔ ایسا ایرانی زیبائش میں شامل ہے۔

سندھی امیروں کے نزدیک معیشت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ طلوع آفتاب سے (یعنی مشرق میں یہ رواج ہے کہ دن میں تمام دنیاوی امور سرانجام دے دیئے جائیں) چاشت کے وقت تک جو ہمارے ناشتے کا وقت ہے۔ ریاست کے مختلف امور سرانجام دیئے جاتے ہیں مثلاً خفیہ امور طے کرنا' درخواستوں کو وصول کرنا اور ان کے جوابات تیار کرنا' مالیات کی رپورٹیں تیار کرنا اور خط و کتابت کرنا۔ دن کا گرم حصہ گھر کے اندرونی حصے میں بسر کیا جاتا ہے اور کم از کم تین یا چار گھنٹے سونے میں لگائے جاتے ہیں۔ غروب آفتاب کے وقت نماز کے بعد ہر امیر کھلا دربار منعقد کرتا

ہے۔اس کو مجلس یا تقریب خیال کرتے ہوئے ریاست کے تمام افسران، تمام سردار اور ان کے ساتھی وغیرہ دربار میں آتے ہیں یہ امیر کی کھلے بندوں تعظیم کرنے کا اچھا موقع ہوتا ہے۔اس دوران اس سے درخواستیں کی جاتی ہیں اور کسی بھی عوامی یا ذاتی مسئلے کی زبانی اطلاع دی جاتی ہے۔ تقریباً سات یا آٹھ بجے دربار ختم ہو جاتا ہے اور اس وقت امیر پھر سے اندر چلا جاتا ہے۔یا پھر بعض موقعوں پر قصہ گویوں یا شاعروں سے ان کی باتیں سنتا ہے یا پھر عورتوں کا ناچ دیکھتا ہے۔ جسمانی ورزش کو کبھی صحت کے لیے ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔نیز ماسوائے شکار کے یا پھر بزرگوں کے مزارات پر جانے یا اپنے اجداد کی قبروں پر جانے کے علاوہ سندھ کے امیر اپنے قلعے سے کبھی نہیں نکلتے۔ ہمہ وقت ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔شکایات پر تحقیق کرا کر فوراً اس پر کاروائی کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ حکمران کے فرض کے لازمی جزو سے الگ رہتے ہیں۔یعنی ذاتی طور پر کبھی تفتیش نہیں کرتے اور نہ کبھی ملک کا دورہ کرتے ہیں یوں وہ اپنے عوام کی حوصلہ افزائی نہیں کر پاتے۔

اگرچہ سندھی امیر اپنے مذہبی معاملات میں بہت سخت دکھائی دیتے ہیں مگر چونکہ وہ شیعہ مذہب کے پیروکار ہیں لہٰذا وہ اس عقیدے کے حوالے سے بالکل لاعلم ہیں کہ جس کی اتباع کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اور نبی کریمؐ کے ارشادات کے بارے میں ان کی معلومات محض مشہور چند آیات کو یاد کرتے تک محدود ہے۔تمام مذہبی امور کی انجام دہی مریدوں کے سپرد ہے۔ان کا حیدرآباد میں سربراہ فدا محی الدین ہے جو کابل سے آیا ہے۔اور اس کی زرعی جاگیر و دولت ان بلوچی سرداروں کے مساوی ہے۔اس کے ساتھ پانچ ہزار مرید بھی ہیں جو اس کا ہر حکم ماننے کو تیار ہیں۔ ہر امیر کے پاس اس طرح کا ایک رازدار ضرور ہوتا ہے جس کے فرائض بہت ہلکے ہوتے ہیں مگر اس کا اثر و رسوخ اور شہرت بہت ہوتی ہے۔ یہ لوگ بہت تشدد پسند اور عدم رواداری ہیں جس کی وجہ سے اس ملک سے ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد ہجرت کر کے چلی گئی۔مگر ابتدائی تالپور سرداروں کی عدم رواداری اب بہت ہی کم رہ گئی ہے۔ البتہ بعض لوگ لاعلمی میں یہ خیال کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے جو مذہب تبدیل کر لیا ہے تو وہ دوسرے مذہب والوں نے اسے قبول کر لیا ہے خواہ وہ جبراً مذہب تبدیلی ہو اور محض ظاہری یا پھر نیک نیتی سے کی گئی ہو۔اسی طرح سے اگر کوئی ساہوکار

امیروں کی ناراضگی کا شکار ہو جائے اور دربار میں پیش ہونے کے لیے کہا جائے تو وہ اس کے لیے امیروں کی عدم رواداری کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے تشدد سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہوتا ہے تا کہ بڑی رقم کی ادائیگی سے بھی بچ جائے۔

اس حکمران خاندان کے بانی نے ایک شاعر بھی ملازم رکھا ہوا تھا جو لافانی اشعار کی شکل میں ان کی تعظیم و شان و شوکت بیان کیا کرتا تھا جیسا کہ بڑے بڑے فارسی شاعری کے دیوان ظاہر کرتے ہیں جیسے ''شاہ نامہ'' یا ''تاریخ بادشاہان'' جو فردوسی نے نظم کیا تھا۔ البتہ سندھ میں اسے ''فتح نامہ'' یا ''فتوحات کا بیان'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ ابتدائی تالپور سرداروں کی اس میں بہت تعریفیں کی گئی ہیں جبکہ کلہوڑوں کی اچھی طرح سے مذمت کی گئی ہے۔ بعدازاں یہ کمزوری کافی حد تک اہمیت کی حامل ہو گئی اور جس کسی کو بھی دربار میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہوتا یا کوئی بھی دوسرا عہدہ حاصل کرنا ہوتا تو وہ اسے بغیر زبردست خوشامد کے حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ امرائے سندھ نے خود مختار حکمرانوں کی حیثیت سے جو اعزازت حاصل کیے ہیں اور جو دفتری خط و کتابت اور سرکاری دستاویزات میں ظاہر ہوتے ہیں وہ سب وہی ہیں جو ہندوستان میں سب سے اعلیٰ اعزاز کے حامل ہیں۔ البتہ سندھی زبان میں تعظیم کی سب سے اہم اصطلاح ''سائیں'' ہے جس سے ہندوستان میں ''صاحب'' یا ''شریف'' آدمی مراد ہوتی ہے اور ملک کے تمام طبقات میں یہی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

''سندھی امراء'' میں درجہ بندی کے حوالے سے سندھ کے امیر اس ترتیب سے ہیں: نصیر خان (اس کے دو لڑکے ہیں) اس کے بھتیجے شہزاد خان اور حسین علی خان' اس کے رشتے دار میر محمد خان اور میر صفدر (دو بیٹے آگے) خیر پور میں میر رستم خان (8 بیٹے اور 8 پوتے اس کے آگے) اس کا بھتیجا نصیر خان (اور اس کے چار بھائی جو میر مبارک کے لڑکے ہیں) علی مراد خان اور چاکر خان' میر پور میں شیر محمد خان یہ سب ہی بلوچیوں میں تالپور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان سرداروں کی عمومی خصوصیات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ نیم وحشی پن کے حامل اور جاہل ہیں اور جہالت کی وجہ سے وہ ان غلطیوں کے بھی سزاوار ہیں کہ جن کا ان پر الزام عائد کیا جاتا ہے بلکہ یہ چیزیں تو ہر معاشرے کے اس دور میں اور اس سطح پر ہر جگہ نظر آتی ہے۔ پس اتنے

زرخیز اور عمدہ ملک کہ جس کی خصوصیات مزید مہذب اور اچھے حکمرانوں کے حامل ہونے سے اور بھی زیادہ بڑھ سکتی ہیں وہ ان حکمرانوں کی خودغرض اور رشوت خوری کی وجہ سے قربان کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔ صنعت وحرفت پر بے جا ٹیکس عائد کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے ذرائع آمدنی اس خراب حکومت کی جیتی جاگتی غلطیوں کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتنا کوتاہ اور غلام نظام چلا رہے ہیں کسی مفتوحہ ملک کے جاگیردارانہ سرداروں کی حیثیت سے یہ لوگ اپنی جہالت اور وحشی بربریت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان کو کسی طرح کی حکومت سازی کا علم نہیں ہے اور ان کے اپنے حقوق واستحقاقات واختیارات کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ سندھی امیروں کی واحد منزل یہ ہے کہ خزانے بھرو اور اپنی زندگی سے لطف اندوز ہو اور جتنی بھی اصلاحات اور ترقی کی باتیں ہیں ان سب کو اپنے معاملات میں مداخلت سمجھتے ہوئے سب سے زیادہ وحشیت کے حامل فیصلے صادر کرو۔ اگرچہ وہ لوگ کسی طرح سے بھی ظالم نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ حکمرانان مطلق کے محض اسی ایک عام سی پر مذمت ظلم سے بری الذمہ ہیں۔ مگر وہ ضرورت کے پیش نظر اپنے عوام پر استبدادی اور یکطرفہ فیصلے ضرور عائد کرتے ہیں اور عوام کی حالت تو موجودہ حکومت کی مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور بھی دگرگوں ہوتی جا رہی ہے۔ غیر مشتبہ فتوحات اور غیر ملکی اتحاد' ان سب چیزوں سے تو یوں لگتا ہے کہ اب ان کی خودمختاری کا دور گزر رہا ہی چلا ہے کیونکہ دوسری سلطنتیں اب ان کی پرواہ نہیں کرتیں اور انہیں سے بھی بعض اب قصہ پارینہ ہو گئی ہیں ان سرداروں کی اغلاط سے قطع نظر ان کی ذاتی خصوصیات ان کی اندرونی خوبیوں سے مزین ہیں جو ہمیشہ سے مشرق میں پائی جاتی ہیں مثلاً مہمان نوازی' شہرت' احترام وعزت' سرکاری امور اور ذاتی دوستی کے سلسلے میں ہمارے چند ایک جو برطانوی افسران ان کے قریب تر جانے کا موقع حاصل کر چکے ہیں وہ ان سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور بڑے اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے دربار میں ہماری ابتدائی ملاقاتوں کے وقت کی صاف گوئی اور دیگر اشیاء کی چاہت کے بچپنے کے پیش نظر ہمارے دل میں ان کی جانب جو توہین آمیز احساسات پیدا ہو گئے تھے وہ بعد کے برسوں میں بہتر احساسات سے بدل گئے جو ہمارے آزاد خیال نقطہ نظر کا نتیجہ تھے۔ سندھ کے امیروں کے بارے میں اگر ہم کوئی فیصلہ دیں' خواہ وہ ان کے بطور حکمران ہونے کے بارے میں

دیا جائے یا پھران کی ذاتی شخصیت کے حوالے سے تو ہمیں ایک بہت ہی اعلیٰ اور تہذیب یافتہ قوم کے ارکان ہونے کی حیثیت سے نہیں سوچنا چاہیے بلکہ اس بربراور غیر تہذیب شدہ معاشرتی کیفیت کے بارے میں آزادخیالی کے ساتھ سوچنا چاہیے۔

تالپوروں نے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد اپنے پیش رووں کی بہت ساری دولت حاصل کی (کلہوڑوں کو ہمیشہ امیر خیال کیا جاتا رہا ہے کیونکہ وہ بہت محاصل وصول کیا کرتے تھے) اور یوں کثیر خزانے کے مالک بن بیٹھے خاص طور پر حیدرآباد کے حکمران۔ البتہ خیر پور کے حکمران اسے شان وشوکت سے ذرا دور ہی ہیں۔ حیدرآباد کے شاہی برجوں کے بارے میں خیال ہے کہ یہاں پر امیروں کی دولت محفوظ ہے اسی طرح سے عمرکوٹ کا قلعہ بھی کہ جو کلہوڑوں نے اسی مقصد کے لیے بنایا تھا۔

❁

سندھی ومہاجر شناخت۔ تضادات واشتراک

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ میں قومیں آپس میں برسرپیکار رہی ہیں۔ ان میں سیاسی تصادم کے ساتھ ساتھ' معاشی وسماجی طور پر بھی کشمکش رہی ہے۔ جب قومیں آپس میں متصادم ہوئی ہیں تو اس کی دو شکلیں رہی ہیں۔ ایک تو قوم فاتح کی شکل میں آتی ہے جب وہ فوجی طاقت وقوت سے دوسری قوم کو شکست دے کر اپنا مفتوح بنالیتی ہے۔ اس صورت میں اکثر اس کے تاریخی ورثہ کو ختم کر کے' اپنی بالادستی قائم کرتی ہے اور اپنا کلچر اور زبان کو اس پر مسلط کرتی ہے۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنی سیاسی بالادستی کے باوجود وہ مفتوح کلچر سے سیکھتی بھی ہے اور اس کے کچھ اثرات کو قبول بھی کرتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک بڑی تعداد ترک وطن کر کے دوسرے علاقے میں جاتی ہے۔ اس صورت میں بھی نئے آنے والوں اور قدیم باشندوں میں تصادم ہوتا ہے۔ لیکن وقت کی ضرورت اور تقاضوں کے تحت ان میں اشتراک کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے ملاپ سے ایک مشترکہ کلچر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ہم دو صورتوں کو دیکھتے ہیں۔ اگر مقامی آبادی کلچر کے لحاظ سے کمزور ہوتی ہے تو اس صورت میں اسے ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے کلچر کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں تو اس صورت میں اسے مساوی یا غیر مساوی طور پر شریک کر لیا جاتا ہے۔

تاریخ میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں آریاؤں کی آمد۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آریہ ہندوستان پر حملہ آور نہیں ہوئے تھے بلکہ مختلف وقتوں میں گروہوں اور جماعتوں کی صورت میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ لہٰذا ان آنے والوں اور یہاں کے مقامی باشندوں یعنی دراوڑوں میں جنگیں بھی ہوئیں' سماجی ومعاشی طور پر تصادم بھی ہوا' مگر اس کے ساتھ

ہی آہستہ روی کے ساتھ ان دونوں میں ثقافتی اشتراک بھی ہوا' جس کے نتیجہ میں دراوڑی روایات اس تہذیب کا حصہ بن گئی کہ جو اب ویدوں کی تہذیب کہلاتی ہے۔ اب تک تصور یہی تھا کہ آریاؤں نے دراوڑوں کو جنوب میں دھکیل دیا اور خود مکمل طور پر ہندوستان پر قابض ہو گئے' مگر اب تحقیق کے ذریعہ ان دراوڑی عناصر کی نشاندہی کی جا رہی ہے جنہوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں حصہ لیا۔

دوسری مثال ہمارے سامنے یورپی اقوام کی ہے کہ جنہوں نے امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پر قبضے کیے اور وہاں کی مقامی آبادی کو ان کی زمینوں سے محروم کر کے انہیں ''محفوظ علاقوں'' میں منتقل کر دیا۔ یہ عمل بھی پرامن طریقہ سے نہیں ہوا بلکہ اس میں تشدد مزاحمت اور قتل و غارت گری جاری رہی یہاں تک کہ مقامی آبادی گھٹ گئی اور ان کی مزاحمت کی قوت ختم ہو گئی۔ ان ملکوں میں یورپی تہذیب نے بالادستی حاصل کر کے مقامی تہذیب اور کلچر کو تقریباً ختم کر دیا اور شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ مقامی لوگوں کو یورپی تہذیب میں ضم کر دیا جائے۔

اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہندوستانی تاریخ میں مسلمان حملہ آوروں کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سندھ اور شمالی ہندوستان میں جو مسلمان فاتحین آئے' انہوں نے اپنے کلچر کی بالادستی تو قائم رکھی' مگر مقامی کلچر کو ختم نہیں کر سکے کیونکہ اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ جنوبی ہندوستان کے جہاں وہ بطور تاجر کے آئے وہاں انہوں نے مقامی کلچر کو اختیار کر کے خود کو اس میں ضم کر لیا۔ اس لیے فاتحین' تاجر یا سیاسی و معاشی اور ثقافتی مہاجروں کی ذہنیت میں فرق ہوتا ہے۔ فاتحین اپنی قوت و طاقت کی وجہ سے خود کو بالاتر سمجھتا ہے' جبکہ رضا کارانہ یا دباؤ کے تحت آنے والے' ذہنی طور پر مقامی کلچر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اب ہم تقسیم کے بعد اس تاریخی عمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے کہ جو ہندوستان سے مہاجرین کی آمد کی شکل میں سندھ میں ہوا۔ اگرچہ یہ آنے والے فاتحین نہیں تھے بلکہ ان میں سے اکثر سیاسی فسادات کے نتیجہ میں یا ملازمت کی غرض سے آئے تھے۔ مگر ان میں وہ راہنما بھی شامل تھے کہ جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کا وجود ان کی تحریکوں اور کوششوں کی وجہ سے عمل میں آیا ہے۔ اس لیے اس ملک پر ان کا حق ہے۔ یہ ایک فاتحانہ ذہنیت تھی کہ جس کا اظہار بیوروکریسی' فوج اور انتظامیہ کے عہدیداران کی جانب سے ہوا۔

چونکہ نئے آنے والے اپنے ساتھ روایات واقدار اور ساتھ ہی میں اپنے وطن کی یادیں بھی

لائے' اس لیے ان میں ثقافتی برتری کا احساس بھی تھا۔ کیونکہ سندھ کے شہروں سے ہندو تعلیم یافتہ طبقہ آہستہ آہستہ جا چکا تھا اور ان کے مقابلے میں سندھ کا دیہاتی کلچر تھا کہ جس پر وڈیروں کا تسلط تھا۔ لہٰذا شہروں کی آبادی میں نئے آنے والوں کی اکثریت ہوگئی۔ انہوں نے جلد ہی شہر کی شکل و صورت بدل ڈالی۔ محلوں' شاہراہوں اور عمارتوں کے نام وہ رکھے گئے کہ جن کا سندھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سندھ کے شہر' سندھ کے لوگوں کے لیے اجنبی ہو گئے۔

اس نئی صورت حال نے سندھ کے مقامی باشندوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا۔ ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا منطقی تھا کہ کیا انہیں ''ریڈ انڈینز'' بنا کر محفوظ علاقوں میں تو نہیں دھکیل دیا جائے گا۔ اس ردعمل کے نتیجہ میں سندھ میں نیشنل ازم ابھرا جس کی بنیاد کلچر پر تھی' اور جس کا اہم عنصر سندھی زبان تھی۔ اس نیشنل ازم کا ایک پہلو جارحانہ بھی تھا۔ یہ کسی بھی قسم کے اشتراک پر تیار نہیں تھا اور خود کو سب سے علیحدہ رکھنے پر مصر تھا۔ یہ اپنی سندھی شناخت کو دوسری اتھنک شناختوں پر ترجیح دیتا تھا۔ یہ اس پر تیار نہیں تھا کہ نئے آنے والوں کو اپنے میں شامل کرے۔ وہ نیشنل ازم کہ جس کی بنیاد کلچر بھی ہوتی ہے' وہ دوسری کلچرل عناصر کو اس لیے شامل نہیں کرتے ہیں کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں کلچر کی خالصیت ملاوٹ سے کمزور نہ ہو جائے۔

سندھی اور مہاجر تضاد نے سندھ کے معاشرے کی ساخت کو بدل کر رکھ دیا۔ اس تبدیلی کا اظہار شہر اور دیہات کے درمیان فرق کی صورت میں ابھرا۔ شہر کے رہنے والے اگر ترقی کی علامت تھے تو دیہات والے پس ماندگی کی۔ (آگے چل کر کوٹہ سسٹم اور دیہات کے لوگوں کی مخصوص مراعات نے اس فرق کو اور زیادہ واضح کر دیا) لیکن آج ہم جسے مہاجر کمیونٹی کہتے ہیں ابتدائی دور میں یہ ان بکھرے ہوئے لوگوں کا نام تھا کہ جو یوپی' بہار' راجستھان اور حیدر آباد دکن سے آئے تھے۔ ثقافتی طور پر بھی یہ ایک دوسرے سے جدا تھے۔ ان کی زبان کا لہجہ بھی مختلف تھا۔ ان میں علاقائی طور پر ایک دوسرے کے خلاف تعصبات بھی تھے۔ پاکستان آنے والوں نے اپنی شناخت مہاجر نہیں بلکہ پاکستانی قرار دی تھی۔ کیونکہ وہ نئے ملک میں اس شناخت کو حاصل کرنے اور اسے پختہ کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ اس شناخت کی اہمیت یہ تھی کہ اس کے ساتھ وہ پاکستان کے کسی بھی صوبہ میں آباد ہو سکتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تمام صوبوں کے لوگ صوبائی شناخت ختم کر کے اس قومی شناخت کو تسلیم کر لیں تا کہ ان میں اور مقامی لوگوں میں کوئی فرق نہ رہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس ابتدائی دور میں صوبائی شناخت کو صوبائی تعصب کہہ کر اس کی نفی کی

گئی۔

اس کے ساتھ ہی جب ہم سندھی معاشرے کا تجزیہ کرتے ہیں۔تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے وہ بھی کوئی متحدہ معاشرہ نہیں تھا۔اس میں بھی سندھی اور بلوچوں میں اتھنک فرق موجود تھا۔سندھ پر حکومت کرنے کی وجہ سے بلوچوں نے سندھ میں اہم مقام حاصل کرلیا تھا' قبائلی معاشرہ کی وجہ سے ان میں قبائلی اختلافات اور تضادات بھی تھے۔

1950ء کی دہائی سے سندھی اور مہاجر کمیونٹیز میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ون یونٹ (1955) کے بعد سے سندھ میں نیشنل ازم کی تحریک ابھری جس نے سندھ کے بکھرے گروپوں اور جماعتوں کوایک وحدت میں تبدیل کرنا شروع کیا۔نیشنل ازم کی بنیاد کلچر پر تھی' لہٰذا اس عمل میں سندھی اور بلوچ ایک ہو گئے۔اس تحریک کوسب سے زیادہ تقویت ادیبوں نے دی۔ لہٰذا قوم کی تشکیل کے جو مرحلے ہیں' ان میں سب سے پہلے پڑھے لکھے لوگ آتے ہیں' اس کے بعد یہ جذبہ عام لوگوں میں پھیلتا ہے۔سندھی زبان نے ان تمام مختلف الخیال لوگوں کوآپس میں ملا دیا۔

سندھ میں آنے والے مہاجرین بھی اس عمل سے گزرے۔انہوں نے بھی اپنی شناخت کی بنیاد زبان پر رکھی' لہٰذا ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے اس زبان کی بنیاد پر ایک وحدت بن گئے۔یہاں تک کہ گجراتی بولنے والے جواب تک سیاست سے دور تھے' وہ بھی مہاجر کمیونٹی کا ایک حصہ بن گئے۔

سندھی اور مہاجر کمیونٹیز کی اس تشکیل میں دوعناصر نے اہم کردار ادا کیا۔ایک عدم تحفظ کا جو دونوں کمیونٹیز میں شدت کے ساتھ ابھرا۔سندھیوں میں یہ احساس مہاجرین کی موجودگی سے ہوا' تو مہاجرین میں اس وجہ سے کہ وہ صوبائی شناخت کے بعد ''غیر ملکی اور بغیر کسی وطن'' کے ہو گئے۔اگر انہیں قبول نہیں کیا گیا تو وہ کہاں جائیں گے۔دوسرے 1980ء کی دہائی سے ہونے والے فسادات تھے کہ تشدد' دہشت گردی اور خوف وڈر نے دونوں کمیونٹیز میں طبقاتی اختلافات کو ختم کر کے انہیں ایک دوسرے کے خلاف متحد کر دیا۔

اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جانب سے پاکستانی شناخت کمزور ہوگئی۔اس کی جگہ سندھی اور مہاجر شناخت نے لی۔ان شناختوں کو پختہ کرنے کے لیے دونوں جانب سے تاریخ کا سہارا لیا گیا اور ایک ایسے ماضی کی تشکیل کی گئی کہ جوان کی شناختوں کو ابھارے اور انہیں تاریخی جواز فراہم

کرے۔ سندھی شناخت نے اپنی جڑیں وادی سندھ کی تہذیب سے شروع کیں۔ تاریخ کی اس تشکیل میں ان کے ہاں ہیروز بھی ہیں تو غدار بھی۔ ہیرو غدار کا یہ ذکر اس لیے اہم ہوتا ہے کہ ہر سیاسی تحریک اس کے ذریعہ سے یہ پیغام دیتی ہے کہ جو اس کے ساتھ رہے اور قربانی دی انہیں تاریخ یاد کرے گی، مگر جو اس سے غداری کریں گے انہیں تاریخ معاف نہیں کرے گی۔ تاریخ کی یہ تشکیل کارکنوں کو حوصلہ دیتی ہے کہ وہ تحریک کو کامیاب بنائیں، اور ان کو وارننگ دیتی ہے کہ جو اس سے علیحدہ ہیں یا اس کے مفاد سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ تاریخ کی اس تشکیل میں کلچر کو اہمیت رہی۔ ادب، موسیقی، تعمیرات، لباس اور زبان اس کے عناصر رہے۔ مثلاً لباس کے سلسلہ میں اجرک اور سندھ ٹوپی (جو کہ بلوچی ہے) اہم علامتیں بن کر ابھریں۔

اس کے مقابلہ میں مہاجر شناخت تقسیم ہند کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ ان کا ماضی قدیم تاریخ سے تشکیل نہیں دیا گیا۔ بلکہ اس کی ابتداء تحریک پاکستان سے ہوتی، جو فسادات کے نتیجہ میں پختگی کو پہنچی۔ اردو زبان و ادب کا سرمایہ ان کا ثقافتی ورثہ ہے۔ لہٰذا ان کی شناخت کی بنیاد بیرونی عناصر پر ہے۔ اگرچہ انہوں نے ''مہاجر'' ہونے کو بطور مذہبی علامت اختیار کرنے کی کوشش کی، اور اسلامی تاریخ سے مہاجرین مکہ کی مثال کو پیش کیا۔ اس میں ایک اشتراک کا پہلو بھی تھا کہ جب وہ اہل سندھ کو ''انصار'' سے تشبیہ دے کر ان کی مدد کا اعتراف کرتے تھے۔ دونوں کمیونٹیز کی جانب سے جس ماضی کی تشکیل ہوئی۔ اس میں تاریخ بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کا تاریخی ورثہ انہیں علیحدہ علیحدہ راستوں پر لے جاتا ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ان دو تاریخی ورثوں کو آپس میں جوڑ دیا جائے تاکہ یہ ان دونوں کے تضادات کو دور کر سکیں؟

مہاجر کمیونٹی میں تبدیلی آئی ہے۔ ان کی نئی نسلیں نہ تو اب اپنے آباؤ اجداد کے علاقوں سے واقف ہیں اور نہ ہی ان میں ناسٹلجیا ہے۔ انہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے وہ سندھ کا ہے، لہٰذا ان کی خواہش ہے کہ ان شناخت کو سندھی تسلیم کر لیا جائے۔

ان دو شناختوں کے ملاپ میں ادب اور تاریخ اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اردو ادب میں سندھ شناسی کے سلسلہ میں جو تراجم سندھی سے اردو میں ہوئے ہیں انہوں نے سندھ کے بارے میں آگہی کو پیدا کیا ہے۔ اس عمل میں اردو زبان بھی متاثر ہوئی ہے کہ جس میں کئی سندھی الفاظ مستعمل ہونے لگے ہیں۔ جو کہ کلچرل اشتراک کی طرف ایک قدم ہے۔

دوسرا اہم ذریعہ تاریخ ہے۔ اردو داں طبقے میں سندھ کی تاریخ سے دلچسپی تقسیم سے پہلے بھی

موجود تھے۔ عبدالحلیم شرر اور ابوظفر ندوی نے سندھی تاریخیں لکھ کر اردو داں طبقے کو سندھ سے روشناس کرایا تھا۔ تقسیم کے بعد بھی سندھ کی تاریخ اور کلچر پر اردو میں کام ہوا ہے۔ یہ تحریریں روایتی ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سندھ کی ایک ایسی تاریخ مرتب کی جائے کہ جو دونوں کمیونٹیز کے رشتہ کو آپس میں جوڑ سکے۔

اس سلسلہ میں ایک بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دانشور اپنی تحریروں کے ذریعہ آگہی و شعور تو پیدا کر سکتے ہیں مگر اس کے لیے لازمی ہوتا ہے کہ سیاسی و معاشی قوتیں بھی اس کا ساتھ دیں۔ اس وقت شہری اور دیہاتی کلچر نے تضاد کو برقرار رکھا ہے۔ سندھی اور مہاجر شناخت نے طبقاتی فرق کو کمزور کر دیا ہے۔ اس لیے جب تک شہری و دیہاتی کلچر کا فرق دور نہ ہوگا اور طبقاتی شعور نہیں بڑھے گا' اس وقت تک تضادات باقی رہیں گے اور سندھی و مہاجر شناخت کے نام پر بااثر اور طبقہ اعلیٰ کے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

❁

تحقیق کے نئے زاویے

وادی سندھ کی تہذیب

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ کی طرح علم آثار قدیمہ کو بھی حکمراں طبقے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اوراس کے ذریعہ اپنے عزائم اور منصوبوں کے لیے اخلاقی جواز تلاش کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ علم آثارقدیمہ کونظریہ کے فریم ورک میں ڈھال کراس کی اصلی شکل وصورت کومسخ کردیتے ہیں۔ بی۔ جی ٹریگرز (B.G.Triggers) جو کہ ایک مشہور ماہرآثارقدیمہ ہے اس نے اپنے ایک مضمون جس کا عنوان ''رومانویت' قوم پرستی اور علم آثارقدیمہ'' ہے' اس میں اس نے لکھا ہے کہ ''علم آثارقدیمہ کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب بھی اس کا سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا' تو اس نے تعصب' تنگ نظری' تشدد اور تباہی کو پیدا کیا'' اس کے علاوہ دوسرے اسکالرز نے بھی اس مسئلہ کا تجزیہ کرتے ہوئے علم آثارقدیمہ کے سیاسی استعمال پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ جب دوسرے علوم کا اس نقطہ نظر سے احتساب کیا جاتا ہے کہ ان کے معاشرے پر کیا اثرات ہوئے تو علم آثارقدیمہ کو بھی اس زمرے میں شامل کرنا چاہیے۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جب 1920ء کی دہائی میں وادی سندھ کی تہذیب کے آثار دریافت ہوئے تو ہندوستانی قوم پرستوں نے اس کو اپنی سیاسی جدوجہد کے لیے استعمال کیا اور اہل برطانیہ کی اس دلیل کو رد کیا کہ جس کے تحت وہ یہ کہا کرتے تھے کہ چونکہ ہندوستانیوں کو حکومت کرنے یا چلانے کا تجربہ نہیں ہے اس لیے ان کو اس وقت آزادی نہیں دینی چاہیے جب تک کہ ان کو یہ تجربہ نہ ہو جائے۔ لیکن ہڑپے اور موہنجوداڑو کی دریافت نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانیوں نے آج سے ہزاروں سال قبل ایک ایسی اعلیٰ اور برتر تہذیب کو پیدا کیا تھا کہ جو میسوپوٹامیہ اور مصر کی ہم عصر تھی' لہٰذا ان پر یہ الزام لگانا کہ وہ حکومت کے لیے نااہل سراسر مذاق ہے۔ اس طرح وادی سندھ کی تہذیب نے ہندوستان کی قومی آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان کی آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد وادی سندھ کی تہذیب اس وقت ایک متازعہ

شکل میں سامنے آئی جب کہ ہندوستان میں ''ہندتوا'' تحریک مقبول ہوئی اور انہوں نے کوشش کی کہ وادی سندھ کی تہذیب کس طرح سے اپنے نظریہ کی روشنی میں بیان کیا جائے۔ چونکہ اس تہذیب کے اہم مراکز پاکستان میں ہیں' اس لیے اسے ہڑپہ' موہنجودڑو' یا وادی سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے۔ اب ہندتوا کے ماننے والے پاکستان کو اس سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اسے وادی سندھ یا ہڑپہ تہذیب کے بجائے اس کا نام سرسوتی تہذیب رکھنا چاہتے ہیں' ان کی دلیل ہے کہ دراصل یہ سرسوتی دریا تھا کہ جس کا ذکر رگ وید میں بھی آیا ہے اور اس کے کنارے اس تہذیب نے فروغ پایا تھا۔ مزید براں ان کی یہ بھی دلیل ہے کہ وادی سندھ یا سرسوتی کی تہذیب آریاؤں کی ہے دراوڑوں کی نہیں ہے۔

شیریں رتناگر جو کہ ماہر علم آثار قدیمہ اور جواہر لال یونیورسٹی کی پروفیسر ہیں انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ہڑپہ کو سمجھنا : عظیم وادی سندھ کی تہذیب''
(Understanding Harappa: Civilization in the greater Indus valley)
انہوں نے وادی سندھ کی تہذیب کا تجزیہ کرتے ہوئے' پہلے سے قائم شدہ بہت سے نظریات و خیالات کو رد کیا ہے۔ انہوں نے گورڈن چائلڈ کے اس نظریہ کے چیلنج کیا ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ وادی سندھ کے لوگوں کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھے' انہوں نے آثار قدیمہ کی کھدائی سے برآمد ہونے والے نیزے کے سرے' تیروں کے سرے' کلہاڑیاں' مٹی میں پکے ہوئے ہاتھ سے پھینکنے والے ہتھیار (Missiles) کانسی کی بنی تلواریں اور خنجروں کی نشاندہی کی ہے' جو کہ اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں کہ وادی سندھ کے لوگ پرامن تھے اور ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہتھیار صرف جنگ کے لیے ہی نہیں ہوتے ہیں بلکہ انہیں شکار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ایک خاص وقت میں طاقت وقوت اور اعلیٰ سماجی مرتبہ کی علامت بھی بن جاتے ہیں۔ شیریں رتناگر کا کہنا ہے کہ یہ درست ہے کہ یہ ہتھیار اس قدر عمدہ اور بہترین نہیں تھے جس قدر کہ میسوپوٹامیہ اور مصر کے تھے۔ لیکن ان کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ لوگ ہتھیاروں کے بغیر نہیں تھے' بلکہ ان ہتھیاروں کی مدد سے وہ خود کا دفاع بھی کرتے تھے اور جنگ وجدل میں بھی مصروف ہوتے تھے۔ انہوں نے ہندتوا کے اس نظریہ کو بھی رد کیا ہے کہ ہندو مذہب ہڑپہ تہذیب کے زمانہ سے ابھرا اس لیے اس تہذیب پر اس کا حق ہے۔

وادی سندھ کی تہذیب کانسی کے عہد کی پیداوار ہے (گورڈن چائلڈ نے اسے یہ نام دیا ہے) اس عہد کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں دھاتوں کو صاف کرنے کا فن ترقی پذیر ہوا اس کی وجہ

سے ہلوں میں کانسی کے پھلوں کا استعمال ہوا' جس نے زرعی پیداوار میں اضافہ کیا۔ زراعتی ترقی کے نتیجہ میں اور اس کی آمدنی کی وجہ سے شہری کلچر کی نشوونما ہوئی اور ترقی یافتہ شہروں کی بنیاد پڑی' اس دور کے تاجروں نے سمندر پار تجارت میں حصہ لینا شروع کیا اور شہری انتظام و تجارت و کاروبار کی وجہ سے رسم الخط اور تحریر کا رواج ہوا۔ اس پس منظر کو بتانے کے بعد شیریں رتنا گر کا کہنا ہے کہ وادی سندھ کے شہروں نے اعلیٰ اور نفیس کلچر کو پیدا کیا کہ جس میں پکی اینٹوں سے عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ناپ تول کے لیے اوزان مقرر ہوئے' پانی کے ذخیرے کے لیے تالاب اور جھیلیں بنائی گئیں۔ کپڑوں کی بنائی کے طریقے دریافت کیے۔ طبقہ اعلیٰ کے لوگوں کے لیے خوبصورت زیورات تیار ہونے لگے۔ لیکن میسوپوٹامیہ' مصر اور چین کی طرح یہاں سے کوئی خزانہ' اہرام اور مندر نہیں ملے ہیں۔

شیریں کا خیال ہے کہ یہاں کے لوگوں کا مذہب ''شامان ازم'' (Shamanism) تھا یہ مذہب کی وہ شکل تھی کہ جو ماقبل تاریخی عہد اور غیر خواندہ معاشروں میں رائج تھی۔ یہ وہ مذہب تھا کہ جس میں نہ تو کوئی مقدس کتاب تھی اور نہ ہی مذہبی طبقہ۔

وادی سندھ کی تہذیب کا سب سے اہم پہلو اس کے ہمسایہ ملکوں سے تجارتی روابط تھے۔ ان تجارتی روابط کی وجہ سے ان ملکوں سے ثقافتی تعلقات بھی ہوئے جس کے نتیجہ میں تاجروں کی آبادیاں ان ملکوں میں قائم ہوئیں' ہجرت کے عمل اور آپس کی جنگوں نے بھی ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ مزید ان روابط نے ایک دوسرے کے قصے' کہانیاں اور زبانوں کے الفاظ کو ایک دوسرے سے روشناس کرایا۔

ایک سوال ہمیشہ پوچھا جاتا ہے کہ وادی سندھ کا رسم الخط کیوں نہیں پڑھا جا سکا؟ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ ان مہروں پہ کہ جن پر یہ رسم الخط ہے' ان میں عبارت بہت مختصر ہے ان پر مکمل عبارت نہیں ہے' جس کی وجہ سے تمام حروف کو دریافت نہیں کیا جا سکا۔ اس کے علاوہ ایسی کوئی دستاویز یا کتبہ نہیں ملا کہ جس پر دو زبانوں میں لکھا ہوا ہو۔ اس قسم کے کتبہ کی وجہ سے اسکالرز اس قابل ہوئے تھے کہ انہوں نے مصر کے قدیم رسم الخط کو پڑھ لیا تھا۔

شیریں نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ موہنجو دڑو کی دریافت کے بعد ''رقاصہ'' اور ''پروہت بادشاہ'' کے ناموں نے لوگوں کو بہت زیادہ کنفیوز کیا ہے۔ شیریں کا خیال ہے کہ جب برطانوی ماہر آثار قدیمہ نے ایک برہنہ خاتون کا مجسمہ دیکھا' تو انہوں نے اسے ہندوستانی تعلق سے ''رقاصہ عورت'' سے منسوب کر دیا۔ اس طرح انہوں نے ''پروہت بادشاہ'' کے تصویر کو بھی غلط

سمجھا' کیونکہ اہل یورپ کے لیے ایشیا مذاہب کی سرزمین ہے' لہٰذا پروہت بادشاہ کا القاب اس مجسمہ کے لیے سب سے زیادہ مناسب تھا۔ لیکن شیریں کے نظریہ کے مطابق اس خاتون کے انداز کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ حالت رقص میں ہے۔ اور یہ بھی غلط خیال ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب میں حکمراں پروہت ہوا کرتا تھا' اس لحاظ سے وادی سندھ کی تہذیب دوسری کانسی کے عہد کی تہذیبوں سے مختلف ہے کہ جہاں بادشاہ کے فرائض میں مذہبی رسومات ادا کرنا اہم تھا۔

وادی سندھ کی تہذیب کے زوال اور خاتمہ کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ سیلاب اور زلزلے نے اس تہذیب کو تباہ کیا۔ کچھ کا خیال ہے کہ معاشرے کی اندرونی خرابیوں اور تضادات نے اس تہذیب کو زوال پذیر کیا' کچھ یہ کہتے ہیں کہ فطری تباہیوں اور ماحولیات کی خرابی نے اسے اس مرحلہ تک پہنچایا۔ کچھ کا نظریہ ہے کہ تجارت کے خاتمہ اور سیاسی اختلافات نے لوگوں کو مجبور کیا کہ شہر کو چھوڑ کر حفاظت اور روزگار کے لیے گاوؤں میں چلے جائیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ جب دریا نے اپنا راستہ بدلا تو شہر کے مواصلات کے تمام ذرائع منقطع ہو گئے اور اس کا زوال ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن موہنجودڑو کا شہر تو تباہ ہوا اور وادی سندھ کے دوسرے شہر بھی متاثر ہوئے' مگر تہذیب اچانک ختم نہیں ہوئی' بلکہ یہ اس سے ملحق علاقوں میں باقی رہی اور آنے والی نسلوں نے اس کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اسے برابر منتقل بھی کرتے رہے۔

شیریں کا کہنا ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب جنوب ایشیا کی وسیع الذہن اور ترقی یافتہ تہذیب ہے۔ یہ غیر ملکی تجارت کے لیے کھلے دل سے تیار رہتی تھی' غیر ملکی اثرات کو قبول کرتی تھی اور آنے والے مہاجروں کو خوش آمدید کہتی تھی۔ اس کو ذہن میں رکھ کر کیا جا سکتا ہے کہ ثقافت کی زندگی اور نشوونما اس میں ہے کہ اس کا ذہن کھلا ہو' ایک دوسرے سے تعلقات و روابط رکھے' آپس میں شادی بیاہ کی ہمت افزائی کرے اور ایک سے زیادہ زبانوں کو سیکھے۔ کوئی کلچر بند اور گھٹے ماحول یا نسلی خالصیت کے فریم ورک میں ترقی نہیں کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم تاریخ سے کچھ سیکھنے پر تیار ہیں؟ یا ہم اپنی غلطیوں کو بار بار دہراتے رہیں گے۔

❁

نقطہ نظر

جلال الدین خوارزم شاہ: ہیرو یا لٹیرا

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر این۔اے۔بلوچ سندھ کی تاریخ پر اتھارٹی مانے جاتے ہیں۔انہوں نے ڈان اخبار میں جلال الدین خوارزم شاہ پر ایک آرٹیکل لکھتے ہوئے اس کے بارے میں کہا کہ وہ ایک بہادر' جری اور نڈر جنرل تھا کہ جس نے ایک اہم مقصد کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ان کا یہ آرٹیکل اگر جلال الدین خوارزم شاہ اور چنگیز خاں کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان تک محدود ہوتا تو ان کے یہ ریمارکس ایک حد تک صحیح ہو سکتے تھے۔مگر انہوں نے اپنے اس مضمون میں جلال الدین کے ہندوستان میں آنے اور خاص طور سے سندھ میں اس کے قیام سے متعلق تفصیلات دی ہیں اور اس کے مذہبی لگاؤ کا اظہار اس کی سندھ میں ایک تعمیر شدہ مسجد سے کیا ہے۔

جلال الدین خوارزم شاہ کی زندگی اور اس مہمات کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ جب اس نے وسط ایشیا میں منگولوں کا مقابلہ کیا اور بہادری سے لڑا۔ بالآخر اسے شکست ہوئی اور وہ فرار ہو کر ہندوستان میں آیا۔اول تو اس نے اس وقت کے سلطان التمش سے مدد کی درخواست کی۔سلطان کو اس بات کا پورا پورا اندازہ تھا کہ اس کی سیاسی اور فوجی قوت اس قابل نہیں ہے کہ وہ منگولوں کی طاقت کا مقابلہ کر سکے' اس لیے اس نے اس جنگ میں کہ جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا' الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور جلال الدین کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ ''اس ملک کی آب و ہوا' جناب کے لیے مناسب نہیں ہے۔'' جب سلطان کی طرف سے اسے کوئی مدد نہیں ملی تو اس نے اپنی فوج کے ساتھ ملتان اور اچ پر حملہ کر دیا کہ جہاں اس وقت ناصر الدین قباچہ (1228-1206) کی حکومت تھی' جو بحیثیت حکمراں کے اپنی رعایا کے لیے مہربان اور ہمدرد تھا۔جلال الدین نے مقامی قبائل سے

معاہدہ کر کے قباچہ کے خلاف جنگ لڑی اور اسے شکست دے کر اس سے خطیر رقم بطور تاوان کے وصول کی۔ اس نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اچ شہر کو آگ لگا دی اور اپنی فوج اور علیفوں کے ساتھ سہون کی طرف روانہ ہوا۔ سہون کے گورنر نے جب یہ دیکھا کہ اس میں مقابلہ کی سکست نہیں ہے تو اس نے شہر کو جلال الدین کے حوالے کر دیا' ایک مہینہ قیام کے بعد اس نے وہاں سے ٹھٹھہ کی جانب پیش قدمی کی۔ راستے میں ہر قسم کے مظالم کو روا رکھا' لوگوں کا قتل عام کیا' گاؤں اور شہروں کو لوٹا اور جلایا اور تباہی و بربادی کے نشانات چھوڑتا ہوا 1223ء میں ٹھٹھہ پہنچا۔ شہر کے گردونواح میں لوٹ مار کرنے کے بعد اس نے دیبل شہر کو تباہ و برباد کیا۔

یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ ایک وہ شخص کہ جس نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ جس نے اپنے ملک کو تباہ و برباد ہوتے دیکھا' شہروں کو لٹتے اور جلتے دیکھا' لوگوں کے قتل عام کا مشاہدہ کیا۔ جب اسے ایک دوسرے ملک میں آنے کا موقع ملا تو بجائے اس کے کہ وہ پرامن شہری کی طرح رہتا' ان لوگوں کا شکر گزار ہوتا کہ جنہوں نے اسے پناہ دی تھی' اس کے بجائے اس نے بھی وہی راستہ اختیار کیا کہ جو منگولوں نے کیا تھا۔ کردار اور عمل کے اعتبار سے اس میں اور منگولوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ وہ سندھ کے لوگوں کے لیے ایک عذاب بن کر آیا اور اس تھوڑے عرصہ میں کہ جو وہ یہاں رہ (1223-1221) اس نے سندھ کی تباہ و برباد کر دیا۔ جب وہ اس ملک سے گیا ہے تو اپنی یاد میں جلے ہوئے قصبے و گاؤں اور ویران شہروں کو بطور یادگار چھوڑا۔

اس کے اس قیام کے اثرات نہ صرف لوگوں پر ہوئے' بلکہ اس نے ہندوستان کی اندرونی سیاست میں تبدیلیاں کیں۔ ناصر الدین قباچہ جس کے مرکزی شہر ملتان اور اچ تھے جس نے اپنی اصلاحات کے ذریعہ اپنے علاقوں میں امن و خوشحالی قائم کر دی تھی اور جس کے دربار میں وسط ایشیا کے مہاجرین پناہ گزین تھے' جن میں علماء ادباء اور شعراء کی بڑی تعداد شامل تھی' جلال الدین کے حملوں کی وجہ سے اس کی فوجی طاقت بے انتہا کمزور ہو گئی۔ گاؤں اور کھیتوں کی تباہی نے اس کے ذرائع آمدن گھٹا دیئے اس لیے جب التمش نے اس پر حملہ کیا تو وہ یہ نہ سہار سکا اور شکست کھا گیا۔

جلال الدین کی آمد کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے منگولوں کو ہندوستان کا راستہ دکھا دیا' ابتداء میں تو وہ اس کی تلاش میں آئے اور جب وہ نہ ملا تو لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے بعد واپس چلے گئے' مگر اس کے بعد سے ان کے حملے ہندوستان پر جاری رہے اور ہندوستان کے استحکام کے لیے

خطرہ رہے' یہاں تک کہ علاؤالدین نے سخت فوجی اقدامات کے ذریعہ ان کا خاتمہ کیا۔

جلال الدین ہندوستان سے ایسے ہی رخصت ہوا جیسے کہ وہ آیا تھا' یعنی ایسا مہمان کہ جسے کوئی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس نے نہ تو منگولوں کے خلاف جنگ کر کے کچھ حاصل کیا اور نہ ہندوستان رہ کر کوئی کارنامہ سرانجام دیا اس وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ وہ محض ایک حملہ آور اور لٹیرا تھا جو کہ اہل سندھ کے لیے عذاب بن کر آیا اور ان کی مصیبتوں میں اضافہ کیا۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہمارے مورخ کیوں تاریخ کو وسیع تناظر میں نہیں دیکھتے ہیں اور آخر کیوں حکمرانوں' فوجی جنرلوں اور شخصیتوں کی تعریف و توصیف کر کے ان کی بداعمالیوں کو کارناموں کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ مورخ شاید اب تک تاریخ کے اس فلسفہ سے متاثر ہیں کہ جس میں ''عظیم شخصیتوں'' کو تاریخ ساز بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ خاص طور سے پاکستان میں یہ نظریہ تاریخ بڑا مقبول ہے۔ مثلاً اسلام آباد میں قائم ٹیکسلا انسٹی ٹیوٹ نے ایسے سیمناروں کا انعقاد کیا کہ جن میں فاتحین کی شخصیتوں کو اجاگر کیا گیا۔ ایک سیمنار لاہور میں غزنوی سلاطین اور ان کے دور حکومت پر ہوا' تو دوسرا سیمنار شہاب الدین غوری پر اسلام آباد میں ہوا' ان دونوں سیمناروں میں ان دو فاتحین کو عظیم ہیروز کے طور پر پیش کیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر فاتحین اور فوجی جنرلوں پر اس قدر توجہ کیوں ہے؟ شاید اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ میں ان فاتحین اور فوجی جنرلوں کے علاوہ کسی دانشور' فلسفی' ادیب و شاعر' مصور اور انجینئر کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ ان کے تخلیقی کاموں کو سامنے لائیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری اپنی جدید تاریخ میں ہم کئی بار اپنے فاتحین کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں کہ جس کی وجہ سے ہماری عزت و وقار ختم ہو گیا ہے اور ہم ذہنی طور پر اس قدر پسماندہ اور ہارے ہوئے ہیں کہ ہیروز اور عظیم شخصیتوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہمیں سہارا دیں گے اور ہمارے مسائل کا حل کریں گے۔

دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ ہم نے ماضی میں کچھ حاصل نہیں کیا ہے۔ ہماری تاریخ میں سوائے جنگوں اور لوٹ مار اور کچھ نہیں ہے۔ کوئی ایسا کارنامہ نہیں کہ جس پر فخر کر سکیں' لہٰذا پوری تاریخ میں اگر فخر کے قابل کوئی نظر آتا ہے تو یہی فاتحین اور ان کی فتوحات۔ اسی کو ہم قابل فخر سمجھ کر ان کی

پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی فوجی جنرل اور فاتح ہمارے سیاسی نظام کو شکست دے کر برسر اقتدار آتا ہے تو اس میں ہم کبھی محمد بن قاسم کو دیکھتے ہیں تو کبھی محمود غزنوی کو۔ اس طرح بار بار ہم شخصیتوں کے سحر میں گرفتار ہوتے ہیں اور بحیثیت قوم کے اپنی شخصیت کو کھو بیٹھتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب تک تاریخ کو وسیع نقطہ نظر نہیں لکھا جائے گا اور اس میں معاشرے کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کے کردار نہیں لایا جائے گا۔ اس وقت تک تاریخ افراد کے حصار میں قید رہے گی۔ اور یہ تاریخ لوگوں کے ذہن کو تنگنائے میں رکھ کر حکمرانوں کے مفاد کے لیے کام کرے گی۔ تاریخ عظیم افراد کے کارناموں کا نام نہیں ہے، یہ لوگوں کی شمولیت سے بنتی اور آگے بڑھتی ہے۔

خاص طور سے ہمیں حملہ آوروں کے کردار کی وضاحت کرنی ضروری ہے کہ جو ہمیشہ عام لوگوں کے لیے تباہی و بربادی لاتے ہیں۔ حملہ آور حملہ آور ہوتا ہے، چاہے وہ ہمارا ہو یا غیر کا۔ تاریخ کو جذبات سے علیحدہ کر کے معروضی طور پر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

❁

تاریخ کے بنیادی ماٰخذ

لشکرعرب کی تیاری اور حجاج کا خط پہنچنا

پھر جب (محمد بن قاسم) ارمابیل سے آگے روانہ ہوا تو اس نے (محمد بن) مُصعَب بن عبدالرحمٰن کو لشکر کے مقدمہ پر مقرر کیا' جھم بن زحرالجعفی کو ساقہ پر' عطیہ بن سعد العوفی کو میمنہ پر اور موسیٰ بن سنان بن سلمہ الھذ لی کو میسرہ پر نامزد کیا۔ اس کے بعد باقی ہوشیار' تلوار کے دھنی اور خاص آدمی قلب میں اپنے گردو پیش کر کے آگے بڑھا اور آخر جمعہ کے دن سنہ 93 ہجری کے محرم کے مہینے میں (دیبل آ پہنچا) (بحری) بیڑا اور ہتھیار بھی اسی دن خریم بن عمرو اور ابن مغیرہ کی (زیر نگرانی) اسے وصول ہوئے۔ انہوں نے حجاج کا خط اسے دے کر خندق کھودنے کا مشورہ دیا۔ ان خطوط میں تحریر تھا کہ ''تمہاری خدمت میں خاص آدمی مقرر کیے گئے ہیں' ایک عبدالرحمٰن بن سلیم الکلبی جس کی شجاعت کئی بار آزمائی جا چکی ہے اور کوئی بھی دشمن جنگ میں اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا' دوسرا سفیان بن الابرد ہے جو کہ دانائی میں یگانہ اور عقل میں امین اور پاکدامن ہے (تیسرا) قطن بن برک الکلابی ہے جس نے مشکلات میں ہماری مدد کی ہے اور قابل عزت اور راست گو ہے اور جس امر میں اسے مامور کیا جائے گا فرماں برداری کی شرط بجالائے گا۔ ملامت سے پاک ہے اور حجاج کا ہمیشہ مددگار رہا ہے۔ (چوتھا شخص) جراج بن عبداللہ ہے کہ جو تجربہ کار لوگوں میں سے اور جنگ آزمودہ ہے اور اہل فضیلت میں ترجیح رکھتا ہے اور پانچواں مجاشع بن نوبہ ازدی ہے یہ سب میرے معتمد مشیر ہیں اور میں ان سے زیادہ کوئی امین اور پاک دامن نہیں رکھتا۔ مجھے امید ہے کہ وہ تم سے مخالفت اور دشمن سے ساز باز نہ کریں گے۔ اس ساری جماعت میں جن کا تذکرہ خط کے شروع میں ہوا ہے' مجھے کوئی بھی خریم بن عمرو سے زیادہ عزیز نہیں ہے کیونکہ وہ مرد دلیر اور شیر دل ہے' جنگ کے وقت بہادر (رہتا ہے) اور متفکر نہیں ہوتا وہ منتخب آدمیوں میں سے ہے اور قابل احترام ہے' اور اپنے آباؤاجداد سے لے کر مخلص اور صادق ہے اور جب خریم تمہارے ہمراہ

ہے تو پھر مجھے کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی عادتوں اور پسندیدہ اخلاق سے آراستہ ہے اور کسی بھی مخلوق کو تمہارے مخالف نہ ہونے دے گا۔ اسے اپنے سے جدا نہ کرنا اور اس خط کے پڑھنے کے بعد جب تک کہ اس وقت تک کے سارے حالات تفصیل و تشریح کے ساتھ (ہمارے پاس) نہ لکھ دو اس وقت تک کھانا پینا حرام سمجھنا۔''

حجاج، امیر محمد بن قاسم سے بڑی محبت کرتا تھا اور اس کی محبت کے جوش میں وہ (دن میں) کئی مرتبہ صدقات کیا کرتا تھا اور دعائیں مانگا کرتا تھا۔ بکر بن وائل اور عدیل بن فرخ محمد کے دوستوں میں سے تھے انہوں نے اس کے جانے کے بعد سانڈیاں قربان کیں اور ان کی قیمتوں میں اپنی بیویوں اور بیٹیوں کے زیورات دیئے تاکہ کوئی شبہ نہ رہے اور عدیل نے یہ اشعار کہے:

سلبت بناتی حلیهن فلم ادع
سیواراً ولا طوقا و قرطا مذهبا

و ما غرنی الاذان هتی کانما
تعطل بالبیض الارانب آرنبا

من الدر والیاقوت من کل حرة
تری سیمطها فوق الخمار مشقبا

دعون امیر المومنین فلم یجب
دعاء فلم یسمعن اما ولا ابا

میں نے اپنی بیٹیوں کے زیورات چھین لیے یہاں تک کہ ان کے کنگن، کنٹھمالے اور سونے کی بالیاں بھی چھوڑ دیں۔ مجھے کانوں کے (گوشواروں) نے بھی نہ بہکایا جسے گوریوں کو گہنا زیور پہننا منع ہے۔ اور ہر لڑی میں پروئے ہوئے موتی اور یاقوت لے لیے جوان کی لڑیوں میں مڑھے ہوئے سر میں دوپٹے کے نیچے تھے۔ انہوں نے امیر المومنین سے فریاد کی، لیکن جب اس نے نہ سنی تو پھر انہوں نے اپنے ماں باپ سے فغاں کی۔

دور اندیش حکیموں اور خیر اندیش بزرگوں نے ابوالحسن سے روایت کی جس نے کہا کہ میں نے بنی تمیم کے آزاد کردہ غلام ابو محمد سے سنا کہ ''محمد بن قاسم دیبل کے نواح میں آ کر منزل انداز

ہوا اور (لشکر نے) خندقیں کھود کر علم لہرایا اور نقارے بجائے۔ جو جیش جس مقام پر مامور کیا گیا تھا وہ وہیں جما رہا اور منجنیقیں باہر نکال کر سیدھی کی گئیں ایک منجنیق خاص امیر المومنین کی تھی جس کا نام ''عروسک'' تھا (یہ اتنی بڑی تھی کہ) جب پانچ سو آدمی اس کے لنگر کو کھینچتے تھے تب اس میں سے پتھر چھوٹتا تھا۔

دیبل کے وسط میں ایک بلند و بالا بت خانہ تھا۔ اس کے اوپر ایک گنبد تھا جس پر ریشم کا سبز پرچم آویزاں تھا۔ بت خانے کی بلندی چالیس گز تھی اور اس کا گنبد بھی چالیس گز اونچا تھا۔ اس پرچم کی شکل اس طرح تھی کہ اس میں چار بیرقیں تھیں جن کے کھلنے پر ہر بیرق الگ الگ سمت میں پھیل جاتی تھی اور اس کے پھریرے برجوں کے آویزے کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

جب اہل قلعہ نے اسلامی لشکر کو دیکھا تو بت خانہ کا پرچم کھول کر وہ جنگ کے لیے مستعد ہو گئے۔ لیکن ہمیں (جنگ کی) اجازت نہ تھی۔

اس طرح سات دن گزر گئے ہر روز خط آتا تھا اور انتظار کرنے کا حکم ہوتا تھا۔ آخر آٹھویں دن اجازت کا پروانہ آیا۔ محمد بن قاسم نے لشکر درست کر کے حملہ کیا جس کی وجہ سے قلعہ والوں نے قلعہ کے اندر جا کر پناہ لی۔ اچانک ایک برہمن قلعہ کے اندر سے نکل کر آیا اور امان طلب کر کے کہنے لگا کہ ''امیر عادل سلامت رہے! ہمارے نجوم کی کتابوں میں اس طرح حکم ہے کہ ملک سندھ لشکر اسلام کے ہاتھوں فتح ہوگا اور کافر شکست کھائیں گے۔ لیکن اس بت خانے کا پرچم (ایک) طلسم ہے اور جب تک یہ برقرار ہے یہ قلعہ ہاتھ آنا امکان سے باہر ہے۔ اس لیے اس بت خانے کی چوٹی مسمار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اس کا جھنڈا پارہ پارہ ہو جائے اور فتح حاصل ہو۔

جعونہ کا منجنیق سے بت خانہ کے جھنڈے کو گرانا

پھر محمد بن قاسم نے جعونہ السلمی منجنیقی کو بلا کر کہا کہ ''(کیا تو) بت خانے کا یہ پرچم اور بیرقیں منجیق کے پتھر سے گرا سکتا ہے؟ اگر گرائے گا تو تجھے دس ہزار درھم انعام دوں گا۔'' جعونہ نے کہا ''یہ دارالخلافہ کی خاص منجنیق ہے جس ''عروسک'' کہتے ہیں اگر اسے دو گز کاٹ دیا جائے یعنی چھوٹا کیا جائے تو میں تین پتھروں سے جھنڈا اور بیرقیں گرا کر بت خانے کی چوٹی مسمار کر دوں گا۔ محمد بن قاسم نے کہا کہ ''اگر تو پتھر سے بت خانے کی چوٹی اور جھنڈے کو گرا دے گا تو میں تجھے دس ہزار

درہم انعام دوں گا لیکن اگر تو منجنیق بھی برباد کردے اور بت خانے بھی نہ ٹوٹے تو پھر کیا شرط ہے؟
جعونہ نے کہا کہ ''اگر نشانہ خطا کر جائے تو پھر جعونہ کے ہاتھ کاٹ دیجئے۔''

محمد بن قاسم نے ملک الامراء حجاج بن یوسف کے پاس خط لکھا جس میں جعونہ کی شرط درج کی۔ ''نویں دن کرمان سے جواب آیا۔ اور فرمان میں بھی وہی شرط درج کی گئی تھی اور مزید لکھا تھا کہ ''جب جنگ کے لیے آگے بڑھو تو مناسب یہ ہے کہ سورج کی طرف پشت رکھو تاکہ دشمن کو اچھی طرح دیکھ سکو اور جنگ شروع کرنے کے پہلے ہی دن اللہ تعالیٰ سے امداد و اعانت طلب کرنا۔ سندھ کا جو بھی آدمی امان طلب کرے اسے امان دینا مگر دیبل کے کسی آدمی کو کسی صورت سے پناہ نہ دینا۔

پھر قلعہ کے کاہنوں میں سے ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ ''ہم جب بھی اپنی کتابوں سے نتیجہ نکالتے تھے تو ہمیشہ یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ہند کے بادشاہ کے حکمران کی مدت پوری ہو چکی ہے اور مسلمانوں کا دور آنے والا ہے چنانچہ مسلمان قیدیوں کو اسلامی لشکر کے آنے کی تسلی دی جاتی رہی۔ اب اگر امیر میرے اہل وعیال کو پناہ دیں اور ایسا پروانہ لکھ دیں تو میں ابھی واپس جا کر انہیں تسلی دوں۔ محمد بن قاسم نے اسے امان دے کر واپس بھیجا تاکہ وہ اپنے متبعین کو مسلمان قیدیوں کے قرب و جوار میں لاکر اکٹھا کر دے۔ پھر اس برہمن نے قلعہ میں جا کر قیدیوں کو رہائی کا مژدہ سنایا اور بتایا کہ محمد بن قاسم حجاج کا عم زادہ آیا ہے اور اس کے ہاتھوں قلعہ فتح ہو گا اور تمہیں آزادی نصیب ہو گی۔

عمادالدین محمد بن قاسم کا جعونہ منجنیقی کو اپنے پاس بلانا

دوسرے دن، کہ جو دیبل میں قیام کا نواں دن تھا، جوں ہی سورج مشرق سے ابھرا، محمد بن قاسم نے جعونہ کو بلوا بھیجا۔ اور اس نے جہاں سے کہا منجنیق کو وہاں سے کٹوایا۔ پھر فوج کو تیار کر کے قلعہ کے چاروں طرف چکر لگا کر تیر برسائے اور پانچ سو رسہ کھینچنے والے آدمی بھی منجنیق کے پاس لا کھڑے کیے۔ جعونہ نے پہلا پتھر پھینکا اور مسلمانوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ پہلے ہی وار میں بیرق پھٹ گئی اور لکڑی کے سرے سے الگ ہو گئی۔ پھر اس نے دوسرا پتھر سیدھا جما کر دعوے کے ساتھ بت خانے کی چوٹی پر مارا اور چوٹی ٹوٹ گئی۔ جب چوٹی کا گنبد ٹوٹ گیا اور طلسمات منتشر ہو گئے تو اہل دیبل حیران ہو گئے۔ اس طرف خداوند عزوجل کے حکم سے قلعہ بھی فرش پر آ رہا۔

محمد بن قاسم نے فوج کو ہوشیار کیا۔ پہلے تو اس نے جہم بن زحرالجعفی کو مشرق کی جانب مقرر کیا' عطاء بن مالک القیسی کو مغرب کی طرف کھڑا کیا' نباتہ بن حنظلہ کلابی کو شمال کی دیوار کی طرف سے جنگ کرنے کا حکم دیا' عون بن کلیب دمشقی کو جنوبی برج کی طرف کھڑا کیا اور ذکوان بن علوان البکری خریم اور ابن مغیرہ کو قلب میں رکھ کر بصرہ کے ایک ہزار جنگجو مرد اپنے زیر کمان رکھے۔ پھر جنگ کا نقارہ بجایا۔ سب سے پہلے جو شخص قلعہ پر چڑھا وہ کوفہ کا صعدی بن خریمہ تھا اور اس کے بعد دوسرا شخص بصرہ کا عجل بن عبدالملک بن قیس الدسی (العبدی؟) جب لشکر اسلام قلعہ کے اوپر چڑھ گیا تب اہل دیبل نے دروازہ کھول کر امان طلب کی اس پر محمد بن قاسم نے فرمایا کہ ''مجھے امان کا حکم نہیں ہے پھر ہتھیار بندوں کا قتل عام تین دن تک جاری رہا۔

جاہین بن برسایدراوت نے راتوں رات قلعہ کی دیوار پھاندی۔ ادھر داھر بن چچ کے بھیجے ہوئے گھوڑے اور اونٹ موجود تھے۔ باہر آتے ہی وہ سوار ہو کر راہی ہوا۔ حتیٰ کہ دریائے مہران کے اس مقام پر پہنچا کہ جسے ''کارمتی'' کہتے ہیں اور جو مہران کے مشرق میں ہے اور وہاں سے داہر کے پاس اطلاع دینے کے لیے فیل سوار روانہ کیا۔ داہر نے پوچھا کہ ''جاہین بدھ کہاں پہنچا ہے؟'' اس آدمی فیل سوار نے جواب دیا کہ ''کارمتی'' یعنی ''کھاری مٹی'' کے قریب۔ اس پر داہر نے کہا کہ ''میرے سر میں خاک! بادشاہوں کے حضور میں برے نام نہ لینے چاہئیں کیونکہ اس سے بری فال لیتے ہیں یہ کیوں نہیں کہتا کہ ''ندمتی'' یعنی گیل سیمیں (چاندی جیسی مٹی) کے قریب پہنچا ہے۔

اس طرف دیبل میں محمد بن قاسم بت خانے میں آیا۔ کچھ لوگوں نے اس میں آ کر پناہ لی تھی ور دروازے بند کر کے خود کو جلا دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ دروازے پر اسے جو بھی آدمی ملے اس نے نہیں باہر نکال کر قتل کیا اور سات سو خوبصورت کنیزوں (دیوداسیوں) کو جو کہ بت کی خدمت میں رہا کرتی تھیں' جڑاؤ زیوروں اور زرین لباسوں سمیت گرفتار کیا۔ اس کے بعد چار ہزار آدمیوں نے اور کچھ کہتے ہیں کہ چار سو آدمیوں نے اندر آ کر ان کے زیورات اتارے۔

جس برہمن کو محمد بن قاسم نے امان دی تھی اس کا آنا

اس کے بعد محمد بن قاسم نے اس شخص کو حاضر کرنے کا حکم دیا کہ جسے اس نے امان دی تھی۔ جب وہ حاضر ہوا تو اس نشان دہی پر اس نے ان قیدی مسلمان عورتوں اور مردوں کو جو کہ سراندیپ

کی کشتیوں سے گرفتار کیے گئے تھے یا بدیل کے لشکر میں سے قید ہوئے تھے ان سب کو باہر نکال کر آزاد کیا۔ پھر جو لشکر دیبل کے قلعہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے وہیں مامور کر کے وہ جماعت بھی اس کے ساتھ مقرر کر دی تا کہ طویل قید و بند میں رہنے کی وجہ سے انہیں جو تکلیف پہنچی ہے اس کے ازالے میں انہیں کچھ عرصہ آرام ملے اور بے وفا زمانے کے ہاتھوں کچھ عرصہ آسودہ رہیں ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ انہیں چاہیے کہ قلعہ کی حفاظت کرنے میں انتہائی کوشش کرتے رہیں۔

قبلہ نامی جیلر کو حاضر کرنا

داہر کی جانب سے دیبل کے قیدیوں پر ایک شخص قبلہ بن مہترائج نامی مامور تھا۔ وہ بڑا دانا اور قابل تھا۔ سراندیپ کے قیدی اور بدیل کا لشکر اسی کی نگرانی میں تھا۔ محمد بن قاسم ین اسے بلا کر سزا دینے کے لیے حکم دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ ''اے امیر! اسلامی قیدیوں سے دریافت کیجئے کہ میں ان کے آرام اور مصائب کی تخفیف کے لیے کوشاں رہا ہوں۔ جب حضور کے سامنے یہ حقیقت روشن ہو جائے تو پھر مجھے قتل کیے جانے سے معاف فرمائیں۔''

محمد بن قاسم کا ترجمان سے پوچھنا

محمد بن قاسم نے ترجمان سے دریافت کر کے کہا کہ اس سے دریافت کر کہ ''قیدیوں سے تم نے کیا مہربانی کی ہے؟''۔ اس نے کہا کہ ''خود قیدیوں سے پوچھئے تا کہ خود انہیں کی زبانی امیر کو اس حال کی کیفیت اور میری صداقت کا اندازہ ہو۔''

قیدیوں سے حال دریافت کرنا

محمد بن قاسم نے قیدیوں کو بلا کر ان سے دریافت کیا کہ ''یہ قبلہ جیلر تمہارے ساتھ کیا ہمدردی اور رعایت کرتا تھا؟'' سب نے متفقہ طور پر کہا کہ ''ہم اس کے شکر گزار ہیں۔ اس نے ہماری ہمدردی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہ ہمیشہ ہمیں لشکر اسلام کے پہنچنے کی خبر سے قوی دل کرتا تھا اور دیبل کے فتح ہونے کی امید دلاتا تھا۔'' محمد بن قاسم نے اسے اسلام پیش کر کے مشرف بہ اسلام کیا اور اس نے شہادت کا اقرار کیا۔ اور اسے اس نواب کے حوالہ کیا کہ جسے دیبل پر مقرر فرمایا تھا۔ اس لیے کہ ملک کی مصلحتوں اور آمدنی و خرچ کے کتاب کی دیکھ بھال میں اس کی حاضری قابل اعتماد سمجھی

جائے۔ اور حمید بن وداع النجدی کو وہاں کا گورنر مقرر کر کے اس ملک کی امارت کے چھوٹے بڑے حقوق اسے عطا کیے۔ (109)

دیبل کے اموال غنیمت غلاموں اور نقد میں سے پانچواں حصہ وصول کرنا

تاریخ نویسوں نے حکم بن عروہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ اس نے اپنے باپ اور دادا سے روایت کی کہ جس برہمن نے امان طلب کی تھی اور اس کا نام سودیو تھا' میرے دادا نے بیان کیا اور میں نے اس سے سنا کہ جب دیبل فتح ہوا اور مسلمان قیدی آزاد ہوئے اور غلام باہر نکالے گئے تو محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ غنیمت کا پانچواں حصہ خزانے میں داخل کیا جائے' جس کی وجہ سے دیبل کا پورا پانچواں حصہ حجاج کے خزانہ کے حوالے ہوا باقی ارمابیل کی فتح کی غنیمت پوری حقداری کے مدنظر' سوار کو دو حصے اور اونٹ اور پیادہ کو ایک حصہ کے حساب سے تقسیم کی باقی بچی ہوئی نقدی اور غنیمتیں اور غلام جمع رکھے گئے۔ غنیمت میں دیبل کے راجہ کی دو بیٹیاں بھی تھیں جو کہ حجاج کی خدمت میں بھیج دی گئیں۔

دیبل کے لٹنے کی خبر راجہ داہر کو پہنچنا

اس حکایت کے راوی نے حکم سے نقل کیا ہے کہ جب دیبل کے فتح کی خبر راجہ داہر بن چچ کو پہنچی کہ دیبل پر لشکر اسلام کا قبضہ ہو گیا ہے اور دیبل کا حاکم بھاگ کر جیسینہ کے پاس نیرون کوٹ چلا گیا ہے اور پھر جب اس خبر دینے والے نے شامیوں اور عربوں کی بہادری اور دلیری کی خبریں اسے وضاحت کے ساتھ بتائیں تو داہر نے جیسینہ کے پاس نیرون کوٹ لکھا کہ یہ خط پڑھتے ہی وہ دریائے مہران پار کر کے برہمن آباد قدیم میں پہنچے اور نیرون کوٹ میں سمنی کو مقرر کر کے اسے قلعہ کی حفاظت کی سخت تاکید کرے۔

محمد بن قاسم کا ارمابیل میں منزل کرنا

پھر محمد بن قاسم نے دیبل سے چل کر ارمابیل کی جنگ کا قصد کیا' کیونکہ اسے اسی راستہ سے نیرون کوٹ جانا تھا۔ جب وہ منزل پر پہنچا تو اسے راجہ داہر کا خط ملا' اس نے لکھا تھا۔

راجہ داہر کا خط

بسم اللہ العظیم ذی الوحدنیتہ و رب سیلائج وحدت والے عظیم اور سیلائج کے رب کے نام سے شروع یہ خط ہے سندھ کے بادشاہ' ہندوستان کے راجہ بر و بحر کے حاکم داہر بن چچ کی طرف سے مغرور اور فریب زدہ محمد بن قاسم کی طرف کہ جو قتل عام اور جنگ کا اتنا شوقین اور بے رحم ہے کہ خود اپنے لشکر پر بھی رحم نہیں کرتا اور سب کو بربادی کے غار کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اس سے پہلے ایک دوسرے شخص کے سر میں بھی ایسا ہی غرور پیدا ہوا تھا اور سیاست کا تیر لے کر آیا تھا اور الحکم بن ابی العاص بھی اس کی بیعت میں تھا اور دماغ میں یہ سودا تھا کہ میں ہند اور سندھ کو فتح کر کے اپنے قبضہ میں لاؤں۔ ہمارے دو ایک ادنیٰ درجے کے ٹھاکر صرف شکار کرنے کے انداز سے دیبل گئے اور وہاں اسے قتل کر دیا اور اس کا سارا لشکر بھاگ گیا۔ اب بالکل وہی سودا محمد بن قاسم کے سر میں سما گیا ہے اور آخر کار وہ خود کو اور اپنے لشکر کو اسی خود سری کے خیال میں ختم کرے گا۔ اگر اس نے دیبل فتح کیا ہے تو وہ نہ مضبوط قلعہ ہے اور نہ وہاں کسی طاقتور لشکر سے مقابلہ کیا ہے۔ اس نے ایک ایسی جگہ فتح کی ہے کہ جہاں صرف تاجر اور کارخانہ دار رہتے ہیں۔ اگر وہاں کوئی مشہور و معروف آدمی ہوتا تو تمہارا کوئی نشان نہ باقی چھوڑتا۔ اگر میں راجہ جیسینہ بن داہر کو جو کہ روئے زمین کے بادشاہوں پر قہر کرنے والا' جابران زمانہ سے انتقام لینے والا' راہبوں اور کشمیر کے راجہ کا ہمسر و ثانی اور علم نوبت اور تاج کا مالک ہوں اور جس کے آستانہ دولت پر ہندوستان کے راجہ سر رکھے ہوئے ہیں اور تمام ہند و سندھ اس کے حکم کے تابع ہیں توران و مکران کے ممالک کے لیے جس کا فرمان گلوں کا ہار ہے' جو سو مست ہاتھیوں کا مالک اور سفید ہاتھی کا سوار ہے' جس کے مقابلہ میں نہ کوئی گھوڑا آ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کے سامنے ٹھہر سکتا ہے۔ اگر میں اس کو اجازت دے دیتا تو تمہیں ایسا سبق دیتا کہ پھر قیامت تک کسی لشکر کو اس کے حدود کے نزدیک آنے کی مجال نہ ہوتی۔ اس لیے خود کو غرور کے خواب میں مبتلا نہ کر ورنہ تیرا حشر بھی وہی ہو گا کہ جو بدیل کا ہوا۔ تم میں جنگ میں ہمارا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں اور نہ ہماری طاقت سے سلامت واپس جا سکتے ہو۔

پس داہر کا یہ خط جب محمد بن قاسم کے پاس پہنچا اس نے منشی کو اس کا ترجمہ کر کے پڑھ کر سنانے کا حکم دیا اور مضمون سے واقف ہو کر جواب لکھوایا۔

محمد بن قاسم کا خط راجہ داہر کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ محمد بن قاسم ثقفی کی طرف سے کہ جو سرکشوں اور مغروروں سے مسلمانوں کا انتقام لینے والا ہے' کافر' جاہل' منکر اور ضدی داہر بن چچ برہمن غدار کے نام ہے کہ جو بے وفا زمانہ کے ردوبدل اور ظالم وقت کے غرور پر مغرور ہوا ہے۔

اس کے بعد اسے معلوم ہو کہ انتہائی جہالت اور حماقت سے تو نے جو کچھ بھی لکھا اور اپنی رکیک رائے پر جس طرح مغرور اور مفتون ہوا' وہ پہنچا اور تو نے جو بیان کیا ہے اس کے مضمون سے واقفیت حاصل ہوئی اور طاقت' حشمت' ہتھیار' بندوبست' ہاتھی اور سوار اور لشکر کے متعلق تو نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ہر ایک بات معلوم ہوئی اور سمجھی گئی۔ ہماری ساری قوت اور امداد کا مدار خدائے پاک کے کرم اور انتظام اور بندوبست بادشاہ کے فضل پر ہے۔ **ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم. فیکید والک کیدا ثم لاینظرون انی توکلت علی اللہ ربی و ربکم و مکروا و مکراللہ واللہ خیر الماکرین ولا یحیق الکمرا لسیی الا باھلہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین.** (زبردست اور عظیم اللہ کے سوا دوسری کوئی بھی طاقت اور امداد نہیں۔ وہ تیرے لیے منصوبے تیار کر رہے ہیں مگر انہیں مہلت نہ دی جائے گی۔ میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا ہے جو کہ میرا اور تیرا رب ہے۔ انہوں نے منصوبے بنائے اس طرف اللہ پاک نے بھی تجویز طے کی اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر منصوبے بنانے والا ہے۔ بری تجویز بنانے والے ہی کو گھیرتی ہے۔ کتنی ہی قلیل جماعتیں اللہ تعالیٰ کے اذن سے بڑی جماعتوں پر غالب ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اے عاجز! سوار' ہاتھی اور لشکر پر کیا ناز کرتا ہے؟ ہاتھی تو ایک ذلیل' ساری چیزوں سے عاجز ترین اور ساری تجویزوں اور مکاریوں میں کمترین چیز ہے جو کہ مچھر جیسے ایک ضعیف کیڑے کو بھی اپنے جسم سے نہیں بھگا سکتا اور تو جن گھوڑوں اور سواروں کو دیکھ کر ششدر ہو گیا ہے وہ اللہ کے سپاہی ہیں (**قولہ تعالیٰ**) **فان حزب اللہ ھم الغالبون و خیل اللہ و فرسانھا ھم المنصورون** (بے شک اللہ کا لشکر ہی غالب ہونے والا ہے اور اللہ کے گھوڑے اور ان کے سوار بھی فتحیاب ہیں) تیری بدافعالی' بری عادتوں اور تکبر کی وجہ سے ہی ہمیں لشکر کشی کا خیال پیدا ہوا۔ کیونکہ تو نے سراندیپ کی

کشتیاں روک کر مسلمانوں کو قید کیا' حالانکہ دنیا کے سارے ملکوں میں دارالخلافہ کا جہاں کہ نبوت کا نائب ہے' حکم جاری ہے اور سب فرمان بجالاتے ہیں صرف تو ہی سرکشی اور شوخی اختیار کیے ہوئے ہے اور بیت المال کے خزانہ کا وہ مال خراج جو کہ تجھ سے پہلے کے حاکم اور گزرے ہوئے بادشاہ خود پر لازم اور واجب سمجھ کر ادا کرتے رہے ہیں وہ بھی تو نے روک لیا ہے اور جب تو نے اپنے آپ کو ان ناپسندیدہ حرکات سے ملوث کر کے خدمت سے انکار کیا اور ایسی بری باتوں کو جائز سمجھا تب دارالخلافہ کا فرمان کہ جو خدا کرے ہمیشہ جاری رہے' اس جانب پہنچا کہ میں ان کرتوتوں کا بدلہ لینے کے لیے تجھ سے جنگ کے لیے رخ کروں۔ تو جس جگہ بھی میرا مقابلہ کرے گا' وہاں خدائے تعالیٰ کی مدد سے جو ظالموں کو مغلوب کرنے والا ہے' تجھے مغلوب اور ذلیل کروں گا اور تیرا سر عراق بھیجوں گا یا اپنی جان اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کروں گا۔ اور یہ جہاد اللہ تعالیٰ کے حکم جہاد الکفار والمنافقین (کافروں اور منافقوں سے جہاد کر) کے مطابق میں نے خود پر واجب سمجھ کر خدائے پاک کی رضامندی کے لیے قبول کیا ہے اور اس کے احسان عام کا امیدوار ہوں کہ ہمیں فتح اور کامیابی عطا کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ و کتبہ فی ثلث و تسعین (سنہ 93 ہجری میں تحریر کیا گیا)

❁

ارغون خاندان

ارغون، چنگیز خاں کی نسل سے ہیں۔ (ان کا سلسلہ نسب یوں ہے) ارغون خاں بن اباقا خان بن ہلاکو خاں بن تولی خاں بن چنگیز خاں۔ کتاب ''تذکرہ'' کا مصنف لکھتا ہے کہ ارغون خان اپنے باپ اباقا خان کے زمانہ میں خراسان کا بادشاہ تھا۔ باپ کی موت کے بعد اس کا بیٹا غازی (غازان) خان، تخت خانی (سلطانی) پر متمکن ہوا اور خدائے تعالیٰ نے اس کے دل میں اسلام کا نور روشن کیا۔ مصلح الدین ''کتاب الابرار'' میں لکھتا ہے کہ ارغون خان بادشاہ ہونے کے بعد خراسان کو غازان خان کے سپرد کر کے خود حضرت سید الانبیا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لیے مدینہ طیبہ روانہ ہوا اور وہاں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے امیر المومنین حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ سے بغل گیر ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ سادات کے احترام میں مبالغہ سے کام لیتا تھا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ کی جائے شہادت تک اس نے ایک ایسی کشادہ اور عمیق نہر کھدوائی تھی کہ دجلہ وفرات سے کشتیاں کربلا تک آتی جاتی تھیں۔ قاضی غیاث الدین ہروی اپنی تاریخ میں بیان کرتا ہے کہ محمود غازان ابن ارغون خان سنہ 694ھ میں تبریز میں تخت نشین ہوا۔ اسی دن کلمہ طیبہ پڑھ کر اس نے جملہ مغلوں کو مسلمان بنایا اور سکہ پر کلمہ طیبہ اور فرامین پر ''اللہ اعلیٰ'' کے الفاظ تحریر کرائے۔

قصہ کوتاہ، مذکورہ ارغون خاندان کی اولاد میں سے جب شاہ بیگ ابن امیر ذوالنون ابن میر حسن مصری نے ٹھٹھہ پر قبضہ کیا اور وہاں کی لوٹ مار اور قتل وقید سے فارغ ہوا تو جام فیروز، جس کے اہل وعیال اسیر ہو گئے تھے اطاعت اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ دیکھ کر، آ کر خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ بیگ اس سے بڑی نوازشوں کے ساتھ پیش آیا اور اسے اپنا بیٹا بنا کر سیوستان تک کا ملک اسے عنایت کیا اور کوہ لکی کو سرحد قرار دے کر واپس ہوا۔ اس کے بعد میر علیکہ ارغون، سلطان

مقیم بیگلار، کیپک ارغون اور احمد ترخان کو فیروز کے پاس چھوڑ کر سیوستان کے نواح سے دریا خان کے بیٹوں کا صفایا کر کے شال اور سیوی کی طرف چلا گیا۔

سمہ قوم کے لوگ جو اس افراتفری کے دور میں ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے وہ جام صلاح الدین سے مل کر اسے گجرات سے لے آئے۔ کچھ کے والی رائے کھنگار کی مدد سے جو خود بھی سمہ قوم کا فرد تھا، وہ دس ہزار جاڑیجہ اور موڑھا قبائل کے بہادر ساتھ لے کر ٹھٹھے پر حملہ آور ہوا۔ یہ خبر پانے اور جام فیروز کی درخواست پر مرزا شاہ حسن ابن شاہ بیگ اسی سال کی 14 محرم کو شال سے نکلا اور بیس دنوں کے اندر آراستہ فوج کے ساتھ اس کی مدد کے لیے آ پہنچا۔ جب فریقین نے ایک دوسرے کے سامنے صفیں آراستہ کیں۔ صلاح الدین کی جانب سے اس کا بیٹا ہیبت خان جو سلطان مظفر گجراتی کا نواسہ تھا، لشکر کے مقدمہ کا سردار تھا۔ اس طرف سے مرزا عیسیٰ ترخان، میر علیکہ اور سلطان قلی بیگلار نے پیش قدمی کی اور ان پر زبردست یلغار کر کے ہیبت خان کو کثیر آدمیوں سمیت قتل کر ڈالا۔

صلاح الدین، بیٹے کے مارے جانے کی خبر سن کر انتہائی جوش و غضب کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑا۔ اس طرف سے مرزا شاہ حسن نے بھی سخت حملہ کر کے شجاعت کا حق ادا کیا اور آن واحد میں دشمن کا سارا لشکر درہم برہم کر دیا اور اکثر کو قتل اور باقی ماندہ کو بھگا کر سرخرو ہوا۔ رائے کھنگار کا بھائی آمر آمرانی کثیر آدمیوں سمیت میدان جنگ میں کام آیا۔ مرزا شاہ حسن حملہ آوروں کو گجرات کی طرف بھگا کر تین دن کے بعد میدان جنگ سے واپس لوٹ آیا۔ ماہ ربیع الثانی میں شاہ بیگ خود بھی باغان کے نواح میں آ پہنچا اور مرزا شاہ حسن کو وہاں طلب کیا۔ اسی درمیان میں اس نے ماچھیوں کو جو اپنی خود مختاری کا دم بھر رہے تھے ختم کر کے ان کے قلعہ کی بنیادیں بھی اکھاڑ پھینکیں۔ مرزا شاہ حسن نے باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ پھر حکم کے مطابق سیوستان جا کر وہاں قابل اعتماد افراد مامور کیے اور انہیں نئے سرے سے عمارتیں تعمیر کرنے کے لیے زمینیں تقسیم کر کے اور ذخیرے جمع کرنے کے احکامات دے کر باپ کی خدمت میں واپس آ گیا۔ شاہ بیگ نے جام فیروز کو لکھ بھیجا کہ "میرے دل مین گجرات فتح کرنے کا پختہ ارادہ ہے چنانچہ جیسے ہی یہ تمنا پوری ہوئی مملکت سندھ حسب سابق تیرے حوالہ کر دی جائے گی۔" اس کے بعد خود بکھر کر روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے قلعہ کے اندر رہنے والے سادات کو روہڑی

میں رہائش گاہیں عطا کیں اور اروڑ شہر کے کھنڈرات کی اینٹوں سے نیا قلعہ تعمیر کرایا۔ اس موقع پر لوگوں نے کہا کہ مغرب کی سمت والے دو ٹیلے قلعہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوں گے چنانچہ پہلے انہیں ہموار کرنے کا خیال رکھنا ضروری ہے" لیکن اس نے کہا کہ "چونکہ زبردست دریا قلعہ کو چاروں طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے اس لیے ان ٹیلوں کی کیا فکر ہے' کیونکہ جلیل القدر بادشاہ اس چھوٹے قلعہ کی تسخیر کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اور دوسرے چھوٹے موٹے سردار اسے فتح نہ کر سکیں گے۔" بہر حال جب سال بھر میں قلعہ کی عمارت تیار ہوئی تو میر فاضل کوکلتاش' ملک محمد کوکہ' میر محمد ساربان اور سلطان محمد مہردار جیسے بعض امرا وہاں مقرر کیے۔ اس کے بعد بلوچ فسادیوں کی سرزنش کے لیے جنھوں نے اس اطراف میں اودھم مچا رکھا تھا اس نے فوجیں مامور کیں جنھوں نے طے شدہ منصوبہ کے مطابق ہر مقام پر ایک ہی وقت میں اس گروہ کو برباد کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر شاہ بیگ شال اور سیوی کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد سنہ 28(928ھ) میں وہ پھر بکھر واپس آیا اور پایندہ محمد ترخان کو وہاں کی حکومت تفویض کر کے گجرات کے ارادہ سے موضع اگھم کے قریب جا کر جام فیروز کا انتظار کرنے لگا۔ یہاں اتفاقاً 22 ماہ شعبان سنہ 928ھ کو وہ سکرات میں مبتلا ہوا اور پیش امام حافظ شریف کو سورۃ یاسین پڑھنے کا حکم دیا۔ وہ جب تلاوت کرتے کرتے آیت "مـا مـالـی لا آعبدالذی." پر پہنچا تو اس نے کہا کہ "مکرر پڑھ" چنانچہ دوسری مرتبہ جب حافظ' آیت "یـا لیت قومی یعلمون بما غفرلی." پر پہنچا تو اس نے اپنی جان حق تعالیٰ کے حوالہ کر دی۔ "شہر شعبان" اس کی تاریخ وفات ہے۔

میر طاہر نے ایک قول کے مطابق اس کی وفات قندھار میں اور دوسرے قول کے مطابق ملتان میں تحریر کی ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔ کیونکہ جب بابر بادشاہ نے اس سے قندھار چھین لیا تھا تب ہی اس نے سیوی اور شال ہوتے ہوئے سندھ پر قبضہ کیا تھا چنانچہ اس قلیل عرصہ میں اس کا قندھار جانا کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ ملتان تو وہ کبھی نہ گیا تھا' پھر اس کی موت وہاں کیسے ممکن تھی؟ اور جب وہ تسخیر گجرات کے ارادے سے سفر کر رہا تھا تو ملتان اس کی راہ میں کس طرح آیا؟

بہر حال اس کی لاش کو مکہ شریف لے جا کر دفن کیا گیا۔ اپنے عہد شباب میں وہ خواجہ عبداللہ کی خدمت میں حاضر رہ کر اور علمی کمالات حاصل کر کے بلند درجہ پر فائز ہوا تھا۔ جن دنوں وہ باب

کے ساتھ ہرات میں رہا کرتا تھا ان دنوں وہ ہمیشہ علما کی صحبت میں رہا کرتا اور ہفتہ میں دو بار انہیں اپنے مکان میں مدعو کر کے ان کی خدمت کیا کرتا اور ان سے فیض حاصل کیا کرتا تھا۔ اسکی تصنیفات میں "شرح کافیہ" اور بعض رسالوں کے حواشی مشہور ہیں۔

مرزا شاہ حسن

میر معصوم کے قول کے مطابق باپ کے فوت ہونے کے بعد یہ نصر پور میں تخت نشین ہوا اور اس نے شہنشاہ بابر کے نام کا خطبہ پڑھا۔ بعض خیر خواہ اس پر کافی ناراض ہوئے۔ لیکن اس نے کہا کہ "اپنے قدیمی ولی نعمت بادشاہ کے ہوتے ہوئے اس کا مقدس نام خطبہ سے خارج کر دینا ہمارے لیے مناسب نہیں ہے۔" جام فیروز نے شاہ بیگ کی وفات کی خبر سن کر خوشی منائی اور فاتحہ خوانی کو نظر انداز کر کے اطاعت سے منحرف ہو گیا۔ مرزا شاہ حسن نے اس خبر سے باخبر ہو کر اس کی بیخ کنی کا ارادہ کیا۔ جام فیروز یہ سن کر خائف ہو گیا اور اس نے حافظ رشید خوش نویس اور مفتی قاضی قاضن کے ہاتھوں تحائف بھیج کر معذرت چاہی، لیکن ساتھ ہی ساتھ خفیہ طور پر جنگ کی تیاری میں بھی مشغول رہا۔ مرزا کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے ٹھٹھے پر چڑھائی کر دی۔ جام فیروز اپنے میں مقابلہ کی سکت نہ پا کر وزیر مانک اور شیخ ابراہیم داماد کو جنگ پر مامور کیا اور دریا پار کر کے فرار ہو گیا۔ انہوں نے بڑی کوششیں کیں تو پچیوں اور تیر اندازوں سے بھرپور کشتیاں حائل کر کے ان کی راہ روکنی چاہی، لیکن مرزا کا لشکر ان سب کو ہٹاتا ہوا، فتح مندی کے ساتھ ٹھٹھے میں داخل ہو گیا۔ بدنصیب جام فیروز کچھ بھاگ گیا اور جلد ہی وہاں سے ایک لشکر تیار کر کے پچاس ہزار پیادوں اور سواروں کے ساتھ چاچک اور راحمہ کے قریب آ کر جنگ کا طلب گار ہوا۔ مرزا شاہ حسن کچھ آدمی ٹھٹھے کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر اس کے مقابلہ پر آیا۔ جب دونوں فریق ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تو سندھی اور کچھی بہادر سروں سے پگڑیاں اتار کر اور رسم کے مطابق چادروں کے کونے ایک دوسرے سے باندھ کر گھوڑے سے اتر کر پیادہ ہو گئے اور جنگ کرنے کے لیے مستعد ہو گئے۔ سندھ اور ہند کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ مرتے دم تک جنگ کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو اسی طرح لڑائی شروع کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ مرزا شاہ حسن نے یہ حالت دیکھ کر امرا کو مبارکباد دے کر کہا کہ "انہوں نے

خود ہی اپنے آپ کو باندھ کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا'' یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے اترا اور وضو کر کے مناجات کی نیت سے دو رکعت نفل ادا کر کے بارگاہ ایزدی میں کامیابی کے لیے دعا مانگی چنانچہ اس کی دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر جا لگا۔ اس کے حکم کے مطابق لشکر پہلے صرف تیر برسا رہا تھا' جب وہ مناجات سے فارغ ہوا تو گھوڑے پر سوار ہو کر حملہ بول دینے کا اشارہ کیا۔ صبح سے لے کر شام تک جنگ ہوتی رہی جس میں تقریباً بیس ہزار آدمی قتل ہو گئے۔ جام فیروز خوار و خراب ہو کر گجرات بھاگ گیا' اور پھر مرتے دم تک وہیں رہا۔ مرزا تین دن تک اس مقام پر ٹھہر کر غنیمتیں' گھوڑے اور جو دوسرا سامان ہاتھ آیا تھا اسے اپنے آدمیوں میں تقسیم کر کے واپس ہوا اور شہر ٹھٹھہ میں منزل انداز ہوا اور پھر تغلق آباد میں سکونت اختیار کی۔ چھ ماہ بعد وہ ہالا کنڈی کی راہ سے پہلے سیوستان گیا اور وہاں دربیلہ کا پرگنہ میر فرخ کو عطا کر کے شکار کھیلتے ہوئے ''ببرلو'' جا کر' جو بکھر سے تین کوس کے فاصلہ پر ہے اقامت گزیں ہوا۔ راہ میں ہر مقام پر بستیوں اور باشندوں کو مطیع بناتا گیا۔ حدود اباوڑی میں اس کے لشکر نے ڈھیر اور ماچھی قبائل کو شکست دے کر ''اباوڑی'' پر قبضہ کیا۔ بالآخر سنہ 930ھ میں تسخیر ملتان کا ارادہ کر کے پہلے ایک ہفتہ کے لیے وہ سیوی گیا اور وہاں قلعہ کی نئے سرے سے تعمیر کرائی۔ اس کے بعد واپسی میں رند' مگسی اور بلوچ قبائل کو مطیع کرتا ہوا بکھر واپس آیا' اور ظہیر السلطنت شہنشاہ بابر سے بھی اخلاص اور قرابت کا رشتہ استوار کیا۔ اس کے بعد سنہ 931ھ میں وہ ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ''سیورائی'' کے قلعہ پر قبضہ کر کے اسے برباد کر دینے کے بعد اس نے ''قلعہ مئو'' کا رخ کیا لیکن قطب العارفین شیخ روح اللہ قدس سرہ کی سفارش پر اس سے درگزر کیا۔ ملتان کے بہادروں میں سے ''رحمو'' اور ''بندہ ڈھر'' بھی آ کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ لانگاہ شہزادے اور بلوچ جو اس کے مقابلہ کے لیے آئے تھے' انہیں شکست دے کر اور قلعہ اچ فتح کر کے اس نے اسے مسمار کر دیا۔ اس کے بعد ہی سلطان ''محمود لانگاہ'' بلوچ' رند' دودا' کورائی اور چانڈیہ قبائل کے اسی ہزار کے لشکر کے ساتھ اس سے جنگ کرنے کے لیے آیا۔ لیکن آخر کار مرزا نے لانگاہوں سے صلح کی اور گھارو واہ کو سرحد مقرر کر کے معتمد افراد کو اچ میں مامور کیا۔ اس کے بعد اس نے دلاور کے قلعہ پر چڑھائی کی۔ شوریدہ زمین پر واقعہ یہ قلعہ جو مضبوطی کے اعتبار سے دور دراز کے ملکوں تک مشہور تھا کچھ ہی عرصہ میں ' کر لیا۔ کہتے ہیں کہ حکم کے مطابق مرزا کے لشکر نے ایک ماہ کی رسد اپنے ساتھ لے لی تھی اور تیر

دن کے اندر قلعہ کے چاروں طرف انہوں نے تین سو کنویں کھود کر خود کو خشکی کی پریشانی سے بے نیاز کر لیا تھا۔ دوسری طرف غازی خان قلعہ کے اندر پھنس کر رہ گیا اور کافی ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد آخر کار لاچار ہو کر رہ گیا۔ قصہ مختصر اہل قلعہ میں سے اکثر کو قتل و زخمی اور باقی ماندہ کو گرفتار کر کے بے اندازہ غنیمتوں کے ساتھ پندرہ دن کے اندر وہ بکھر واپس آ گیا۔ سنہ 932ھ میں وہ دوبارہ ملتانیوں کی نافرمانی کی وجہ سے ان کی طرف حملہ آور ہوا اور ایک سال کے محاصرہ اور کافی قتل و غارت گری کے بعد بالاخر شہر فتح کر کے سلطان محمود لانگاہ کی بیٹی اور بیٹے کو مسکین تر خان کے حوالہ کیا' جوان دونوں کو اپنا جگر گوشہ اور فرزند تصور کرنے لگا۔ دو ماہ وہاں قیام کرنے کے بعد اور خواجہ شمس الدین کو ملتان پر مامور کر کے ''مرزا شاہ حسن'' خود بکھر واپس آ گیا اور کچھ عرصہ کے بعد نذرانہ کے طور پر ملتان بابر بادشاہ کے حوالہ کر کے خواجہ شمس الدین کو بکھر واپس بلا لیا۔ بابر بادشاہ نے ملتان اپنے فرزند کامران کو عطا کیا۔

اسی عرصہ میں والی کچھ راؤ کھنگار نے جو جام صلاح الدین کی اعانت میں آ کر اور شکست کھا کر فرار ہو گیا تھا' ٹھٹھے کی تسخیر کا ارادہ کر کے اس مضمون کا خط بھیجا کہ ''میرا بھائی آمر آمرانی تمہارے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ چنانچہ اب اس کے اقارب ٹھٹھے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں لیکن تمہاری غیر حاضری میں خالی ملک پر فوج کشی کرنا جائز نہ سمجھتے ہوئے تمہیں اطلاع دی جاتی ہے۔ اگر تم ولایت ٹھٹھہ کا کچھ حصہ مقتول کے ورثا کو دے دو تو بہتر ہے ورنہ ہم آ رہے ہیں۔'' مرزا نے جواب لکھ بھیجا کہ ''آمر کے خون کا جوش ابھی سرد نہ ہوا ہوگا چنانچہ ہم خود تمہاری طرف آ رہے ہیں اس لیے یہاں آنے کی تکلیف نہ اٹھاؤ۔'' بعضوں کا کہنا ہے کہ مرزا نے خود پہل کر کے اس کے پاس خط لکھا تھا کہ ''میں تیرے بھائیوں کا سارا ملک اپنے قبضہ میں کر چکا ہوں لیکن اس پر بھی تعجب ہے کہ تجھ جیسے غفل نے اس قدر قریب ہونے کے باوجود نہ کوئی تحفہ بھیجا ہے نہ ہدیہ' نہ اطاعت اختیار کی اور نہ اتحاد ہی کی ضرورت محسوس کی ہے جس میں حال اور مستقبل کی بہتری ہے۔ بہرحال! اب ہم گجرات فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ اس راہ میں خواہ مخواہ خود کو پامال نہ کر' اطاعت کی طرف باگ پھرا اور کچھی گھوڑے جن کی سواری کے لیے عرصہ سے دل مائل ہے' نذرانہ کے طور پر روانہ کر۔ دوسری صورت میں جنگ کے لیے تیار رہ!'' بہرحال جیسا بھی ہو۔ چونکہ رائے کھنگار کو اپنے لشکر اور بہادروں پر ناز تھا اور وہ تکبر پر بدستور قائم تھا اس لیے مرزا تیزی کے ساتھ

اس کی طرف روانہ ہوا۔ کچھ کے قریب پہنچنے پر لشکر میں رسد کی سخت قلت ہوگئی جس کی وجہ سے سپاہی تنگ دل ہو گئے۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مرزا نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اور حکم دیا کہ ہر حصہ مختلف سمتوں سے کھنگار پر حملہ کرے لیکن ایک دوسرے سے مخالف نہ ہو اور خود کو اس طرح اس کے سامنے ظاہر کرے کہ حریف دوسری فوج کے وجود سے بے خبر ہو کر مقابلہ کو آئے۔ چنانچہ پہلا دستہ ''سلطان محمود خان'' کی معیت میں بڑھا اور دوسرا میر فرخ اور خود مرزا شاہ حسن کی سرکردگی میں۔ تیسرا دستہ شاہ حسن تکدری کی کمان میں روانہ ہوا اور چوتھا دستہ مرزا عیسیٰ اور میر علیکہ کی سرکردگی میں۔ کھنگار کو جب خبر ملی کہ مرزا شاہ حسن ایک مختصر فوج کے ساتھ اس سے جنگ کرنے آ رہا ہے تو وہ جنگ کے لیے مستعد ہو کر دس ہزار سوار اور بے شمار پیادے ساتھ لے کر مقابلہ پر آیا۔ سلطان محمود کے دستے کو کھنگار کے آنے کی خبر ملی تو فی الفور اس کی راہ روک کر اسنے مرزا کو اس کی خبر دی اور ایک تیز رفتار قاصد میر فرخ کی طرف روانہ کیا۔ کھنگار کا لشکر گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہو گیا اور چادریں ایک دوسرے سے باندھ کر اور باہم ڈھالیں ملا کر نیزہ بازی شروع کر دی۔ اس طرف سے مغلوں نے اپنی رسم کے مطابق تیر برسانے شروع کر دیئے۔ دو تین ساعت جنگ ہوئی ہوگی کہ خدائے پاک کی مدد سے غنیم نے صرف سلطان محمود کی فوج سے مکمل شکست کھائی اور فرار ہوتے وقت میر فرخ کی فوج کے ہتھے چڑھ کر خونخوار تلواروں کی خوراک بنا۔ جب مرزا کے لشکر کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگئی تو انہوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے اور صبح کے وقت شہروں اور قریوں کو لوٹنے کے لیے لشکر روانہ کیا جو بے شمار اسباب' گھوڑے' قیدی اور مویشی ساتھ لے کر کامیابی کے ساتھ واپس ہوا۔

جھرک اور چاہ جھرک کی حقیقت

میر طاہر نسیانی لکھتا ہے کہ سفر سے واپس ہوتے ہوئے مرزا شاہ حسن جھرک اور چاہ جھرک کے قریب پہنچا اور ''طولا پرس'' کو جو ایک خدائی کرشمہ تھا اور اس کنویں میں پوشیدہ تھا' اس نے باہر نکالنا چاہا۔ چنانچہ اس کنویں کے قریب ایک دوسرا کنواں کھود کر چرخی کے ذریعہ اس کا سارا پانی نکال کر نئے کنویں میں ڈالا۔ جب وہ کنواں خالی ہوا تو طولا پرس اس میں سے اڑ کر پانی سے بھرے ہوئے برابر والے دوسرے کنویں میں جا پڑا۔ اس طرح کئی بار وہ کنویں خالی کیے گئے لیکن

طولا پرس ایک سے دوسرے کنویں میں بار بار جاتا رہا۔ آخر سننے میں آیا کہ یہ ایک قسم کا طلسم ہے جس سے درگزر کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کنوؤں کو مٹی سے بھروا دیا۔ چونکہ اس کا حال عجائبات الٰہی میں سے ہے اس لیے بیان کیا جاتا ہے۔

طولا پرس کے بننے اور اس کی خاصیت کا ذکر

کہتے ہیں کہ کچھ کے راجہ ''لاکھ بن پھل'' کے زمانہ میں نباتات کے خواص کا ایک ماہر جوگی ایک ایسی جڑی بوٹی کی تلاش میں تھا جسے اگر جڑ سے اکھاڑ کر آگ کے دھکتے ہوئے الاؤ میں کسی آدمی کے ساتھ پھینک دیا جاتا تو وہ آدمی سونے کا ہو جاتا اور اس کا جو عضو بھی کاٹا جاتا وہ عضو خود بخود پھر سے پیدا ہو جاتا۔ اتفاقاً ایک دن اسی تلاش میں وہ ایک گلے کی طرف جا نکلا جس کی ایک بکری کا دھانہ سرخ ہو رہا تھا۔ اسنے اس بکری کے پیچھے پیچھے گھوم کر وہ بوٹی تلاش کر لی اور اسے جڑ سے اکھاڑ کر چرواہے سے کہا کہ ''میں آگ کی پوجا کرنا چاہتا ہوں' تو بھی آ جا تا کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ پوجا کریں۔ بالاخر ادھر ادھر سے گھاس لکڑی اور کانٹوں کا ڈھیر جمع کر کے اور وہ بوٹی بھی اس انبار میں ڈال کر انہوں نے آگ جلائی۔ اس کے بعد جوگی نے چرواہے سے کہا کہ ''تو آگے آگے چل تا کہ ہم آگ کا طواف کریں۔'' خوش قسمت چرواہے کو ڈر لگا' اس نے جوگی کو اپنے آگے کیا۔ لیکن جوگی کی روش سے اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اسے آگ میں پھینک دے گا۔ چرواہے نے پیش دستی کر کے جوگی کو الاؤ میں دھکیل دیا اور خود بھاگ گیا۔ خدا کی قدرت سے آگ میں بھسم ہو کر جوگی سونے کا بن گیا۔ دوسرے دن جب وہ چرواہا نتیجہ دیکھنے کے لیے راکھ کے اس ڈھیر کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ جوگی کا سارا جسم سونے کا ہو گیا ہے چنانچہ واس کا ایک حصہ کاٹ کر اور باقی کو زمین میں دفن کر کے شہر کی طرف چلا گیا۔ دوسرے دن جب وہ اس کے جسم کا دوسرا حصہ کاٹنے کے لیے آیا' تو کاٹا ہوا سابقہ حصہ اس نے بدستور سالم دیکھا۔ اسی طرح کتنے ہی دنوں تک وہ اس کے اعضا کو کاٹتا اور اسے پھر صحیح و سالم دیکھتا رہا۔ آخر کار جب اس کی حرص پوری ہو گئی اور یہ حال ظاہر ہو جانے کا خوف محسوس ہوا تو اس نے جا کر ''لاکھ'' کو اس کی خبر دی جو جا کر اس ''طولا پرس'' کو اپنے ساتھ اٹھا لایا۔ پھر اس کے اعضا کو کاٹ کاٹ کر اس نے اپنے پاس اس قدر دولت جمع کر لی کہ ایک لاکھ پچیس ہزار روپے وہ روزانہ خیرات کیا کرتا تھا حالانکہ وہ دنیا کا کوئی بھی

کاروبار نہ کرتا تھا۔

کہتے ہیں کہ مرتے وقت اس نے خدا سے دعا مانگی تھی کہ یہ دولت کسی دوسرے کونصیب نہ ہو۔ چنانچہ اس دعا کی قبولیت کا اثر دیکھ کر اسے کنویں میں چھپادیا۔ جس کے بعد یہ عجوبہ مخفی رہتا آیا اوراس طلسم کی کنجی بھی کسی دوسرے شخص کے ہاتھ نہ لگی۔

قصہ مختصر' کھنگار پر فتح پا کر مرزا شاہ حسن ٹھٹھہ لوٹ آیا۔

مرزا کا پٹن پر حملہ آور ہونا اور کامیابی کے ساتھ واپس آنا

کچھ سے مظفر و منصور ہو کر نہایت شان وشوکت کے ساتھ واپس آنے کے بعد کتنے ہی عرصہ تک مرزا شاہ حسن سندھ میں آرام و آسائش کے ساتھ وقت گزارتا رہا۔ بالآخر سنہ 942 ھ میں ہمایوں بادشاہ نے دہلی سے آکر چتوڑ پر حملہ کیا۔ اس موقع پر چتوڑ کے بادشاہ کی سفارش میں سلطان محمود بہادر گجراتی نے اسے ایک سخت خط لکھا۔ جو بادشاہ کے دل پر گراں گزرا چنانچہ یلغار کر کے وہ مذکورہ سلطان کے ملک میں جا پہنچا اور اسے شکست دی۔ اسی عرصہ میں اس نے مرزا شاہ حسن کو بھی لکھا کہ ''وفاداری کے طریقہ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خود کو سندھ سے فی الفور پٹن پہنچائے تاکہ ان شکست خوردوں کی راہ فرار مسدود ہو جائے۔ یہ تحریر موصول ہونے پر مرزا شاہ حسن سرعت کے ساتھ لشکر تیار کر کے نصر پور سے رائدن پور رادھن پور کے راستے سے ہوتا ہوا پٹن جا پہنچا۔ پٹن کے حاکم خضر خاں کو محصور کر کے اس نے قرب و جوار میں لوٹ مار شروع کر دی بکھر کا حاکم سلطان محمود خاں ہراول پر تھا۔ اس نے جنید اور ''جونہ دھاریجہ'' کو خضر خاں کے پاس پٹن بھیج کر پیغام کہلایا کہ آکر مرزا کی خدمت میں حاضر ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ''سلطان محمود بہادر کرنال میں صحیح سلامت موجود ہے' میں اس کے حکم کے بغیر قلعہ کس طرح حوالہ کر سکتا ہوں۔'' یہ جواب پا کر قاصد اس کی والدہ کے پاس گئے۔ بالآخر پٹن کے قرب و جوار سے لشکر کی چھاؤنی اٹھا لینے کے لیے ایک لاکھ فیروز شاہی مرزا شاہ حسن کو اور تیس ہزار فیروز شاہی سلطان محمود خاں کو نذرانہ دینے کا فیصلہ ہوا۔ نذرانہ وصول کرنے کے بعد مرزا شاہ حسن نے اپنے آنے کی اطلاع عبدالقدوس کے ہاتھوں بادشاہ کی خدمت میں روانہ کی اور خود پندرہ دن پٹن کے نواح میں مقیم رہا۔ اس عرصہ میں سلطان محمود خاں' محمود آباد تک جا کر لوٹ مار کر کے گجراتیوں کا کثیر مال و متاع لے کر

واپس آ گیا۔ اس موقع پر میر فرخ نے مرزا شاہ حسن سے کہا کہ "اگر مرزا کو بادشاہ اپنی چھاؤنی میں طلب کرے گا تو ضرور جانا پڑے گا۔ وہاں ارغون، ترخان اور سندھی سپاہی سلطانی ساز و سامان اور عطا و بخشش دیکھ کر ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس لیے مشورہ یہ ہے کہ کوئی بہانہ پیش کر کے یہیں سے سندھ واپس لوٹ جائیں۔" اس تجویز سے متفق ہو کر اس نے مرزا قاسم بیگ کے ہاتھوں عریضہ بھیجا کہ "شاہی حکم کی تعمیل میں میں اپنا سارا لشکر لے کر یہاں تک آیا تھا لیکن ابھی ابھی ٹھٹھہ اور بکھر کے امرا کی جانب سے خطوط موصول ہوئے ہیں کہ کلمتی، جتوئی اور دیگر زمینداروں نے سندھ کو خالی دیکھ کر لشکر جمع کیا ہے اور ہر طرف لوٹ مار کر رہے ہیں۔ اس لیے مجبوراً میں ادھر واپس جا رہا ہوں۔" غرضہ سنہ 45ھ (سنہ 945ھ) کی ابتدا میں رادھن پور کی راہ سے وہ ٹھٹھے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اثنائے راہ میں جاڑیجہ اور سوڈھا قبائل کو لوٹتا ہوا ٹھٹھہ آ پہنچا۔ اس کے بعد سنہ 946ھ میں اس نے میر علیکہ ارغون کو گجرات اور بنگالہ کی فتوحات کی مبارکباد دینے کے لیے ہمایوں بادشاہ کے حضور میں اور میر خوش محمد ارغون کو قندھار کی تسخیر کی مبارک باد دینے کے لیے مرزا کامران کی خدمت میں روانہ کیا۔ میر علیکہ نے شاہی چھاؤنی سے بغیر اجازت واپس آ کر مرزا شاہ حسن سے کہا کہ "بادشاہ کی لاپرواہی کی روش سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ عنقریب کوئی غنیم اس پر حملہ آور ہو گا اسی وجہ سے میں فوراً بغیر اجازت حاصل کیے چلا آیا ہوں۔" کچھ ہی دنوں بعد اس پیشین گوئی کے مطابق ہمایوں بادشاہ کے "شیر خاں" (شیر شاہ سوری) سے شکست کھا جانے کی خبر آئی۔ مرزا شاہ حسن نے میر علیکہ کی دور اندیشی پر آفرین کی اور مجلس مشاورت طلب کی۔ بالآخر اس میں اچ سے لے کر بکھر تک دریا کے دونوں کناروں کو ویران اور برباد کر دینے کا فیصلہ ہوا۔

بادشاہ ہمایوں کے سندھ میں آنے کا ذکر

شعبان سنہ 947ھ کے آخر میں شاہی لشکر اچ آ پہنچا۔ وہاں بخشو لانگاہ، خاں جہان کا لقب، علم، نقارہ اور قیمتی خلعت سے سرفراز ہونے کے باوجود بذات خود حاضر نہ ہوا، البتہ لشکر کے خرچ کے لیے غلہ کی کچھ کشتیاں بھیج دیں۔ آخر کار 28 رمضان کو شاہی لشکر گاہ شہر روہڑی میں استادہ ہوئی اور ببرلوکا "چار باغ" جو فرحت و نظارہ کے اعتبار سے اپنا جواب آپ تھا، بادشاہ ہمایوں کی اقامت گاہ بنا۔ سلطان محمود خاں نے قلعہ کو مستحکم کر کے ساری کشتیاں منگوا کر اپنی طرف لنگر کرائیں۔ بادشاہ

نے حاضر ہونے کے لیے جو حکم بھیجا اس کے جواب میں اس نے عرض کیا کہ ''میں میرزا شاہ حسن کا نمک خوار ہوں جب وہ حکم دے گا تبھی قلعہ حوالہ کروں گا۔'' لیکن اس کے باوجود شاہی لشکر گاہ میں غلہ کی قلت کا حال سن کر اس نے تقریباً پانچ سو خرار غلہ بھیج کر حق خدمت ادا کیا۔ یہ خدمت پسند کی گئی۔ بادشاہ نے امیر طاہر صدر اور سمندر بیگ کی معرفت بہتری کے بڑے بڑے وعدوں اور سابقہ حقوق کے اعادوں کے ساتھ مرزا شاہ حسن کو پیغام بھیجا۔ مرزا نے قاصدوں کا شایان شان استقبال کیا اور اس امر کا اقرار کیا کہ حضرت بادشاہ کے تشریف فرما ہونے پر ہالہ کنڈی (ہالا) سے لے کر بھٹورہ تک دریا کے اس پار والے مواضعات حرم سرا کے اخراجات کے لیے حوالہ کرے گا اور عہد و اقرار پختہ کرنے کے بعد حاضری کے شرف سے مشرف ہوگا۔ اور پھر اپنی کل فوج سمیت ہمرکاب رہتے ہوئے گجرات فتح ہونے کے بعد ہی واپس آئے گا۔ اسی اقرار کے مطابق اس نے جناب شیخ میرک پورانی اور میرزا قاسم طغائی کو شایان شان نذرانوں کے ساتھ خدمت میں روانہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ اس مضمون کا ایک عریضہ بھی تحریر کیا کہ: ''بکھر کا علاقہ کم پیداوار کا علاقہ ہے البتہ ''چاچکان'' کی زمین نہایت سرسبز ہے۔ اگر حضور اس طرف تشریف لے جائیں گے تو دل و جان سے خدمت بجالانے کی کوشش کی جائے گی۔'' اس پر بادشاہ سے خیر خواہوں نے عرض کیا کہ ''اگر وہ صدق دل سے خدمت گاری کا ارادہ رکھتا ہے تو اپنے قلعے کیوں نذر نہیں کرتا کہ ہمیں بھی کوئی جائے پناہ حاصل ہو۔ چونکہ شیر خاں لاہور میں ہمارے سروں پر مسلط ہے' اسی وجہ سے ہمیں مرزا کی عرضی میں فریب نظر آتا ہے۔'' یہ سن کر بادشاہ نے بکھر کے محاصرہ کی طرف توجہ کی۔ اس طرف مرزا شاہ حسن کو بھی اس کے آدمیوں نے ان وعدوں سے برگشتہ کر دیا۔

بادشاہ ببرلو کے چار باغ میں مقیم تھا اس کے ساتھ تقریباً دو لاکھ سپاہی تھے جس کی وجہ سے قحط اس حد کو جا پہنچا تھا کہ جان کے عوض بھی روٹی نصیب نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ تنگ آ کر چھ ماہ کے بعد وہ پاٹ میں جا کر منزل انداز ہوا۔ لیکن وہاں بھی لشکر میں تعفن پیدا ہو گیا تھا اس لیے پھر بکھر واپس آ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد یکم جمادی الاول سنہ 948ھ کو بادشاہ نے یادگار میرزا کو بکھر میں چھوڑ کر خود سیوستان پر چڑھائی کی۔ بادشاہ کے وہاں پہنچنے سے پیشتر ہی میر سلطان قلی بیگ' میر شاہ محمود ارغون

میر محمود ساربان' علی محمد کوکلتاش اور میر صفر ارغون نے جا کر قلعہ کے آس پاس کی جملہ عمارتیں اور باغات ویران اور مسمار کر دیئے۔ بادشاہ نے جب وہاں پہنچ کر محاصرہ کو تنگ کیا تو مرزا شاہ حسن نے ٹھٹھے سے نکل کر خندقیں کھدوا دیں اور کشتیاں جمع کر کے مستعد ہو گیا اور میر علیکہ کو سیوستان پر مامور کیا۔ وہ شاہی لشکر گاہ سے گزرتا ہوا بازار والے راستہ سے قلعہ میں جا داخل ہوا۔ شاہی لشکر نے ایک طرف سے نقب لگا کر آگ دی۔ لیکن اس دیوار کے گرنے سے پیشتر ہی اہل قلعہ نے دوسری طرف اس سے زیادہ مضبوط دیوار بنا کر کھڑی کر دی۔ یہ حال دیکھ کر ایک طرف قلعہ کی مضبوطی اور دوسری طرف قلعہ شکن آلات کے فقدان کے پیش نظر سات ماہ کے محاصرے کے بعد جب پانی میں باڑھ آ گئی مرزا شاہ حسن نے رسد کی آمد و رفت کے راستے مسدود کر کے' مرزا یادگار ناصر کو اپنی طرف ملا لیا اور فوج کا ایک حصہ بادشاہ سے الگ ہو کر چلا گیا تو لاچار ہو کر وہ بکھر واپس ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ مرزا یادگار ناصر کو اپنے ساتھ لے کر حجاز چلا جانا چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں جودھپور کے راجہ مالدیو نے بادشاہ سے تشریف لانے کی درخواست کی' جس پر وہ اکیس محرم سنہ 949ھ کو اچ روانہ ہوا۔ اور اسی سال کی 20 ربیع الاول کو' مالدیو' کی طرف روانہ ہو کر 14 ربیع الثانی کو دلاور کے قلعہ میں منزل انداز ہوا۔ پھر اسی ماہ کی 20 تاریخ کو بیکانیر میں چھاؤنی کرنے کے بعد وہاں سے' جودھپور کے قریب تیس کوس کے فاصلہ پر پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ راجہ مالدیو کی اس درخواست میں دغابازی شامل ہے۔ چنانچہ وہاں سے تیزی کے ساتھ جیسلمیر کی طرف پلٹتے ہوئے' یکم جمادی الاول کو جیسلمیر کے قریب جا پہنچا۔ جیسلمیر کے راجہ نے پانی بند کر دیا۔ بالآخر اسی مہینہ کی دسویں تاریخ کو وہ عمر کوٹ آیا۔ عمر کوٹ کے راجہ بیر سال نے اس کا استقبال کیا اور قلعہ کے اندر جگہ دی۔ وہاں اسی سال کی پانچویں رجب اور اتوار کی شب کو جلال الدین ''محمد اکبر'' کی ولادت ہوئی۔ اس عرصہ میں مرزا شاہ حسن نے بکھر اور سیوستان جا کر ان دونوں قلعوں کی مرمت کرا کے انہیں پہلے سے بھی زیادہ مضبوط کیا اور پھر ٹھٹھے واپس آ گیا۔ بادشاہ نے عمر کوٹ کو فوجوں کا بار برداشت کرنے کا متحمل نہ پایا تو پھر سندھ کا ارادہ کر کے کچھ ہی عرصہ میں موضع ''جون'' آ پہنچا۔ چونکہ یہ مقام باغات' نہروں اور پھلوں کی بہتات کی وجہ سے سارے سندھ

میں ممتاز تھا اس لیے عرصہ تک اسی گاؤں کے باغات میں چھاؤنی رہی۔ مرزا شاہ حسن بھی لشکر کے ساتھ سامنے دوسرے کنارے پر آ ڈٹا۔ بادشاہ کو معلوم ہوا کہ سرزمین بھٹورہ کے ایک قلعہ میں غلہ کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اس نے اپنے کچھ معتمدوں کو اس طرف روانہ کیا۔ دوسری طرف سے ان کی مزاحمت کے لیے مرزا شاہ حسن نے مرزا عیسیٰ کو روانہ کیا' لیکن اس سے کچھ نہ ہو سکا اس پر سلطان محمود کو بھیجا گیا۔ جس کے پہنچنے پر وہاں طرفین کے مابین جنگ ہوئی جس میں بادشاہ کے کارآمد آدمی مارے گئے۔ اس کے بعد دونوں لشکروں کے درمیان وقتاً فوقتاً جنگ وفساد کی آگ بھڑکتی رہی۔ شاہی درگاہ کے جو ملازم مختلف مواضعات میں جا کر رہنے لگے تھے انہیں مرزا کے حکم کے مطابق ایک ہی وقت میں قتل کر کے ان کے سر مرزا کے پاس بھیج دیئے گئے۔

کہتے ہیں کہ یہ خبر سن کر ہمایوں بادشاہ نے ارغونوں پر شبخون مارا' جس میں بھی وہ سارے حملہ آور محمد باقی ترخان کے ہاتھوں قتل ہو گئے جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا۔

اب بادشاہ کا دل سندھ کے قیام سے اچٹ گیا۔ اسی اثنا میں بیرم خاں نے بھی گجرات سے آ کر قندھار ہوتے ہوئے عراق چلنے کی تحریک کی اور مرزا شاہ حسن کے ساتھ صلح کی گفت وشنید شروع کر دی۔ مرزا نے بھی یہ موقع غنیمت جان کر ایک لاکھ مثقال نقد اور دوسرا ضروری سامان سفر فراہم کر کے تین سو گھوڑوں اور تین سو اونٹوں سمیت خدمت میں روانہ کیا۔ اس کے علاوہ ''جون'' کے سامنے ایک پل بھی تعمیر کرا دیا۔ پل کی تعمیر اور صلح کی تاریخ ''صراط مستقیم'' سے برآمد ہوئی۔ بادشاہ نے 7 ربیع الآخر سنہ 950ھ کو اس پل کو عبور کیا۔

کہتے ہیں کہ مرزا عیسیٰ ترخان نے خفیہ طور پر اور کھلم کھلا بادشاہ کی بے حد خدمت کی تھی جس کی وجہ سے بادشاہ نے اس کے حق میں بڑی دعائے خیر کی تھی اور اسی دعا کی برکت سے وہ اپنے سے زیادہ بلند مرتبہ امرا کے ہوتے ہوئے بھی ملک کا وارث ہوا۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا۔ دوسری طرف مرزا شاہ حسن کو اپنے ولی نعمت کے ساتھ بے ادبی سے پیش آنے کی پاداش میں اپنے ملازموں کے ہاتھوں ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔

قصہ مختصر۔ بادشاہی لشکر کے اس سہ سالہ قیام کی وجہ سے ملک سندھ میں زبردست قحط پڑ گیا۔

عجیب حکایت

اسی حادثہ میں گرانی کے سبب سے ایک عورت اپنے بیٹوں سمیت کچھ عرصہ تک فاقے کرنے کے بعد جلاوطنی اختیار کر کے جاتے ہوئے ایک جنگل میں بے تاب ہو کر گر پڑی اور بیٹوں کو بھوک سے بے حال دیکھ کر کہنے لگی کہ ''میں تمھیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتی' اس لیے اپنا خون تمھیں معاف کرتی ہوں۔ تم مجھے ذبح کر کے اس وقت اپنا پیٹ بھرو اور میرا باقی ماندہ گوشت زادِ راہ بناؤ۔ ممکن ہے کہ اس طرح تم کسی سلامتی کی جگہ پر جا پہنچو!'' بیٹوں نے اس پر بہتیرا انکار کیا اور زبان پر ''حاشا'' و ''کلا'' کے الفاظ لائے۔ لیکن ماں کے اصرار پر بالآخر انہیں ایسا ہی کرنا پڑا۔ انہوں نے گوشت کا ایک ٹکڑا پکایا ہی تھا کہ اتنے میں کچھ لوگ جن کی گائے چوری ہو گئی تھی ان پر نازل ہو گئے اور گائے ذبح کرنے کے الزام میں انہیں پکڑ لیا۔ ان بے چاروں نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے اپنا سارا حال لفظ بہ لفظ انہیں سنایا اور ماں کی آنتیں اور دوسری نشانیاں انہیں دکھائیں۔ اس پر ان لوگوں نے انہیں اور زیادہ سختی سے باندھ کر کہا کہ ''یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی آدمی اپنی ماں کو ذبح کر کے کھائے۔ تم نے ضرور کسی دوسرے کو ذبح کیا ہے!'' انہوں نے بڑی التجائیں کیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ وہ لوگ اپنے طور پر ان سے سچی بات کا اقرار کرانے کے لیے درخت سے باندھ کر بیتوں سے مارنا چاہتے تھے کہ اسی اثنا میں ان کی ماں کی آنتیں جا کر ان لوگوں کے پیروں سے چمٹ گئیں اور انہیں مارنے سے باز رکھنے کے لیے آگے قدم بڑھانے سے روک دیا۔ ان لوگوں میں ایک پیر مرد بھی شامل تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر اس نے کہا کہ ''بے شک انہوں نے اپنی ماں کو اس کی اجازت سے ذبح کیا ہے۔ جبھی وہ اپنی شفقت مادری کی وجہ سے اپنے بیٹوں کو مارنے سے تمھیں روک رہی ہے۔ بے شک ''اولادنا اکبادنا'' کی مصداق یہاں ظاہر ہوتی ہے۔''

قصہ مختصر' اسی افراتفری کے زمانے میں بخشو لانگاہ نے ملتان کے نواح میں ''جنپور'' کے سامنے قلعہ تعمیر کرا کے ملتانیوں کو لا کر اس قلعہ میں آباد کیا اور عظیم لشکر جمع کر کے بکھر پر حملہ آور ہوا۔ مرزا شاہ حسن نے میر شاہ محمود اور ارغون کو بکھر کی حفاظت کے لیے روانہ کیا۔

سنہ 955ھ میں مرزا کامران ''ہزارہ'' سے سندھ آیا۔ مرزا شاہ حسن نے ''پاٹ'' کو اس کی منزل گاہ مقرر کیا اور اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دی۔ پھر تین ماہ کے بعد ہزار سواروں کی جمعیت اس کے حوالہ کر کے اسے روانہ کیا۔ کامران سنہ 957ھ میں دوبارہ بکھر آیا مگر اس مرتبہ ہمایوں بادشاہ نے اسے اندھا کرا دیا۔

مرزا شاہ حسن نے پہلے اسے شادبیلہ (سادھ بیلہ) کی ٹیکری پر جو بکھر کے مغرب کی طرف دریا کے وسط میں ہے جگہ دی اور اس کے بعد پرگنہ بھوره کو اس کے باورچی خانہ کے اخراجات کے لیے جاگیر قرار دے کر اس کی اقامت کے لیے فتح باغ میں انتظام کیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ حج کے لیے چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ مرزا شاہ حسن نے اپنی بیٹی کو اس سے چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن اس معصومہ نے یہی کہا کہ ''لوگ مجھے طعنہ دیں گے کہ جب تک اس کے آنکھیں تھیں تب تک تو اس کے پاس رہی لیکن نابینا ہونے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔''

اس واقعہ کے بعد سے ہمایوں بادشاہ کی رنجیدگی کی پاداش میں مرزا کی حالت ابتر ہونے لگی۔ عربی گاہی کے بیٹوں جیسے ذلیلوں اور کمینوں کی سرپرستی کرنے پر جو ارغونوں اور ترخانوں پر بے انتہا مظالم اور دست درازی کیا کرتے تھے' ارغون اور ترخان اس سے سخت ناراض ہو گئے۔ ادھر اس پر فالج کا حملہ ہوا جس کا علاج صرف یہ تھا کہ وہ ہمیشہ کشتی میں بیٹھ کر ٹھٹھے سے بکھر اور بکھر سے ٹھٹھہ آتا جاتا رہے۔

سنہ 960ھ میں شہر ٹھٹھے کی اربابی (گورنری) اس نے ''عربی گاہی'' اور ''اسمعیل باٹھاری'' کو عطا کی۔ اسی سال کے آخر میں ٹھٹھے کی نگرانی ''شنبہ'' اور ''رفیق'' کے حوالہ کی جو زر خرید غلامت تھے۔ یہ حال دیکھ کر ارغون امرا نے محرم سنہ 962ھ کی ابتدا میں میرزا عیسیٰ ترخان کی اطاعت اختیار کی جو خدا شناس بادشاہ کی دلی دعاؤں سے سرفراز ہو چکا تھا۔ مرزا شاہ حسن ین یہ خبر سن کر بڑا پیچ و تاب کھایا اور اس کے دفعیہ کے لیے بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن چونکہ بادشاہ کی ناراضگی کا تیر نشانہ پر لگ چکا تھا' اس لیے تدبیر کی ڈھال کام نہ آ سکی۔ آخر کار اس کی زندگی ہی میں سلطان

محمود خان اور میرزا عیسیٰ نے سندھ کو آپس میں آدھا آدھا بانٹ لیا۔لکی پہاڑیوں سے نشیب کا حصہ میرزا عیسیٰ کے حصہ میں آیا اور اس سے اوپر کا علاقہ سلطان محمود خان کے حصہ میں۔اس حد بندی کے بارے میں انہوں نے پختہ عہد نامہ کیا۔اس کے بعد جب تک میرزا شاہ حسن زندہ رہا چونکہ وہ مفلوج اور بیکار ہو چکا تھا اس لیے بہ ظاہر وہ اس کی اطاعت کرتے رہے۔قضائے الٰہی سے اسی سال کی 11 ربیع الاول کو وہ فوت ہو گیا' چنانچہ اس کے پہلے کیے ہوئے عہد نامہ کے مطابق مذکورہ خوانین ٹھٹھہ اور بکھر کے مالک ہوئے۔

مرزا شاہ حسن اپنے وقت کا بے نظیر بہادر تھا۔بچپن سے لے کر بیماری کے زمانہ تک اس نے جتنی بھی لڑائیاں لڑیں ان سب میں فتح یاب رہا۔وہ سنہ 896 ھ میں پیدا ہوا تھا اور اس کی کل عمر 66 سال تھی۔علوم منقولی میں کمال دسترس رکھتا تھا۔کبھی کبھی شعر بھی کہتا تھا۔جن میں ''سپاہی'' تخلص کرتا تھا۔علما' فضلا اور سادات کی بے حد عزت کرتا تھا۔اس نے 34 برس تک حکومت کی۔اس کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔اس کی لاش کو مکہ شریف میں لے جا کر دفن کیا گیا۔اس خاندان یعنی باپ اور بیٹے دونوں کی کل مدت حکومت 36 سال ہے۔

❁

سلطان محمود خان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد ولایت سندھ کے بندگان درگاہ کے زیر تصرف آنے اور بکھر پر مامور ہونے والے حاکموں کے بیان میں

پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ گیسو خاں 12 جمادی الاول سنہ 982 ھ میں بکھر آیا اور فرمان عالیشان جاری ہوا کہ ولایت بکھر کو محبّ علی خان اور مجاہد خان میں نصفا نصف تقسیم کر کے تسخیر ٹھٹھہ کا رخ کیا جائے اور محمد باقی ترخان کو قابو میں لایا جائے۔ ان دنوں مجاہد خان ولایت گنجابہ میں تھا۔ جب اسے بکھر میں گیسو خان کے پہنچ جانے کی خبر ملی تو وہ بسرعت تمام بکھر روانہ ہوا۔ مجاہد خان کے پہنچنے سے پیشتر گیسو خان نے شہر سکھر کو خالی کرا دینے کا ارادہ کیا لیکن مجاہد خان کے آدمیوں نے اس فعل کو مجاہد خان کے آنے تک موقوف رکھنا چاہا۔ یہ بات گیسو خان کو پسند نہ آئی اور اسنے اپنا لشکر سکھر روانہ کر دیا۔ مجاہد خان کے مختار وکیل خان نے اس سے اس دیوار کی آڑ لے کر جنگ کی کہ جو سکھر کے چاروں طرف بنائی گئی تھی۔ اس جنگ میں دونوں جانب کے بہت سے آدمی قتل اور زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کے تین دن بعد مجاہد خان آ کر اپنے آدمی روہڑی لے گیا اور سکھر کی طرف کا سارا علاقہ گیسوں خان کے تصرف میں چھوڑ گیا۔ ہر چند کہ روہڑی کا علاقہ اور بکھر کا پرگنہ محبّ علی خان اور مجاہد خان کے زیر تصرف آ چکا تھا لیکن پھر بھی جو لوگ کہ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے وہ دل شکستہ ہو گئے۔

اسی اثناء میں کچھ ارغون بکھر بھاگ آئے جنہیں گیسو خان نے شاہ بابا ولد جان بابا ترخان کے شہ پر قتل کرا دیا۔ گیسو خان بڑا تند مزاج اور بدخو واقع ہوا تھا۔ ایک دن دربار عام میں اس نے یحییٰ تواجی پر سختیاں کر کے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوا دیں تھیں۔ دو ماہ بعد جب مجاہد خان،

محبّ علی خان کو عیال واطفال کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر تسخیر ٹھٹھہ کے لیے روانہ ہوا اور لشکر فراہم کرنے کی غرض سے چند دنوں رانی پور میں جا کر مقیم ہوا تو اہل بکھر کی ترغیب وتحریص پر گیسو خان نے روہڑی پر حملہ کرنے کی غرض سے 20 رمضان سنہ 982ھ کو جمعہ کے دن اپنا لشکر دو حصوں میں تقسیم کر کے دریا کو عبور کیا۔ اس کے لشکر کا ایک حصہ شہر کے باغ کے سامنے روہڑی کی طرف متوجہ ہوا اور دوسرا حصہ کشتیوں اور غرابوں میں بیٹھ کر جنگ اور آتشبازی کے لیے مستعد ہو کر خواجہ خضر کے آستانہ کے سامنے سے گزرا۔ محبّ علی خان کے سپاہی سوار ہو کر عید گاہ کے سمت گئے ہی تھے کہ اچانک بحری فوج نے غرابوں سے نکل کر مجاہد خان کی کشتیوں میں آگ لگا دی۔ جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو وہ سوار کہ جو باہر نکلے تھے اپنے گھروں کی جانب پلٹے۔ اس اثناء میں گیسو خان کے سواروں نے آگے بڑھ کر شہر میں آتشبازی کی بوچھار کر دی جس کی وجہ سے ہر جگہ آگ بھڑک اٹھی۔ محبّ علی خان سوار ہو کر فرار ہو گیا اور بکھر کے لشکر نے چاروں طرف سے روہڑی میں داخل ہو کر لوٹ مار کی اور تیسرے پہر تک شہر کو برباد کر کے اور محبّ علی خان کا علم اور نقارہ حاصل کر کے قلعہ کو واپس چلے گئے۔ مجاہد خان یہ خبر سن کر یلغار کرتا ہوا روہڑی آیا۔ ہر چند کہ اس واقعہ پر اسے بڑا املال اور افسوس ہوا لیکن شاہی رعایت کی وجہ سے اس نے گیسو خان سے تعرض نہ کیا۔ اس طرف گیسو خان نے قلعہ بکھرے میں بے اعتدالیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ جب عالم پناہ کی بارگاہ میں اس کی شکایات پہنچیں تو اس کی جگہ ملک کی نگرانی نواب ترسون محمد خان کے حوالہ ہوئی۔ محرم سنہ 983ھ کے اوائل میں محمد طاہر خان بن شاہ محمد سیف الملوک، محمد قاسم خان اور مرزا محمد سلطان نے شہر روہڑی میں منزل انداز ہو کر بکھر کی جاگیر کے متعلق فرمان عالیشان کی نقل گیسو خان کے پاس بکھر بھیجی۔ پہلے تو اس نے انکار کیا اور ان لوگوں کو معطل رکھا لیکن جب گفت وشنید شروع ہوئی تو گیسو خان نے سیادت پناہ سید صفائی اور بکھر کے جملہ مخدوموں کو طاہر خان، قاسم خان اور مرزا محمد خان کو نصیحت کرنے کے لیے بھیجا۔ خوانین تو مخدوموں کو خدا سے طلب ہی کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سبھوں کو بٹھا کر کہا کہ جو بھی صورت حال ہے اس کے مطابق وہ ایک یادداشت تحریر کر کے عالم پناہ کی درگاہ کو بھیج دیں۔ مخدوموں نے پہلے تو انکار کیا اور معافی چاہی کہ ہم یادداشت جب لکھیں گے کہ جب دونوں فریق حاضر ہوں لیکن پھر جب خوانین نے فرمایا کہ گیسو خان کے وکلا تو موجود ہیں ان کے سامنے صرف حقیقی واقعات قلمبند کریں اور اس سے زائد ہم آپ لوگوں کو

کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے' تو مجبوراً مخدوموں نے معاملہ شروع کیا۔ گیسو خان نے جب دیکھا کہ کام خراب ہو رہا ہے اور یہ یادداشت بربادی کا باعث بنے گی تو اس نے لاچار ہو کر آدمی بھیجے کہ آپ یادداشت نہ بھیجیں میں قلعہ حوالہ کرتا ہوں۔ خوانین نے کہلا بھیجا کہ ہم یادداشت لکھوا کر رکھے لیتے ہیں۔ اگر تم نے قلعہ حوالہ نہ کیا تو اس کے بعد ہم اس پر مہریں ثبت کرا کے حضور میں بھیج دیں گے۔ بالآخر بے بس ہو کر گیسو خان مذکورہ خوانین کو قلعہ میں لے آیا۔

چونکہ شاہی احکامات تھے کہ گیسو خان' ترسون خان کے بھائیوں اور دیگر سادات اور بزرگوں کے ساتھ سلطان محمود خان کے خزانہ اور کاروبار کی جملہ تفصیلات کی تحقیق کرے اور ان سب لوگوں کی مہروں کے ساتھ کاغذات مکمل کر کے بارگاہ میں روانہ کرے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق خزانہ کی جانچ پڑتال کی گئی۔ سلطان محمود خان کے حرم سرا کے افراد بھی حکم نامہ کے مطابق بارگاہ کی جانب روانہ ہونے کے لیے مستعد ہوئے۔ خان جہان کی ہمشیرہ جو سلطان محمود خان کے حرم میں تھی، حکم کے مطابق لاہور روانہ ہوئی۔ اسی اثناء میں خواجہ ملک خواجہ سرا' رائے سنگ درباری اور منشی بنوالیداس بھی خزانہ کی تحقیق اور سلطان کے حرم کو روانہ کرنے کے لیے آ پہنچے اور روہڑی میں دوبارہ خزانہ کی جانچ پڑتال کر کے یکم رجب کو ناگوری کی راہ سے روانہ ہو گئے۔

ترسون خان کو دربار سے رخصت دیئے جانے کے موقع پر کسی وزیر نے حضور میں عرض کیا کہ سیف الملوک کی اولاد سرحد کے لیے مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ حضور عالی نے بکھر کی بجائے آگرہ کی حکومت ترسون خان کے حوالہ کر کے بنوالیداس کے نام عارضی حکم نامہ جاری کیا کہ وہ حکومت بکھر کا خزانچی رہتے ہوئے مال اور معاملات کا انتظام سنبھالے۔ اس کے بعد اپنے ذاتی اعتماد کے بنا پر حضور نے میر سید محمد مروہوی میر عدل کو ہزاری منصب سے سرفراز کر کے بھکر کی حکومت اس کے سپرد کی۔ وہ چونکہ سید اور عالم تھا اس لیے بکھر کے اماموں کی صدارت کا فرمان بھی اس کے نام جاری ہوا تاکہ وہ ہر ایک کے لیے اس کی لیاقت کے مطابق وجہ معاش مقرر کرے۔ اسی سال 11 رمضان شریف کو وہ بکھر میں وارد ہوا اور مخدوموں اور بزرگوں کے ساتھ نہایت عزت واحترام کے ساتھ پیش آ کر تقریباً پچاس ہزار ایکڑ زمین سادات' علما' مشائخین' سرداروں اور دیگر باشندوں کو ان کے حسب حال عطا کی۔ اس کے عہد حکومت میں مخادیم بڑے فارغ البال رہے۔

اوائل حکومت میں اس نے سیوہن کی طرف لشکر روانہ کیا کیونکہ کاکڑہ پرگنہ کے منگیچ قبائل

کے لوگ میر عدل کے آدمیوں سے بری طرح پیش آئے تھے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ سید محمد میر عدل نے دستور العمل میں رعایا سے سختی اختیار کی تھی اور دانہ بندی کے دستور کے مطابق بغیر کسی امتیاز کے ہر ایک بیگھہ زمین پر پانچ من مالیہ عائد کر کے لوگوں کی فصلوں پر کارندے مقرر کر دیئے تھے جنہوں نے رعایا پر بے حد سختیاں کی تھیں۔ چنانچہ جب میر عدل کے یہ کارندے گنبٹ اور بھچراہ کے درمیان والی گڑھی میں آ کر ٹھہرے تو منگنیچ قبائل نے بغاوت کر کے ان پر تیر برسائے جس کی وجہ سے میر عدل کے بہت سے آدمی قتل ہو گئے اور ان بدبختوں نے جملہ مومنوں اور کافروں کو گڑھی کے اندر کے کنویں میں ڈال کر اسے مٹی سے بھر دیا۔ اس واقعہ سے غضبناک ہو کر میر عدل نے اپنے آدمیوں کو سیوی سے طلب کیا۔ جو کاکڑہ کے لوگوں سے انتقام لینے کیلیے روانہ ہوئے اور تھوڑی ہی توجہ سے منگنیچ جلاوطن ہو کر بھاگ گئے۔ بالاخر کچھ مدت بعد ان کا پیچھا چھوڑ کر میر عدل کا بیٹا سید ابوالفضل جو کہ اس لشکر کا سردار تھا بکھر کے قلعہ میں واپس لوٹ آیا۔ کچھ عرصہ بعد میر عدل نے فصد کھلوائی جس میں زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے سخت ضعیف ہو گیا اور بالآخر سنہ 984ھ کے ماہ شعبان کی آٹھویں تاریخ کو وہ خدائے پاک کے جوار رحمت میں جا کر آرام پذیر ہوا۔ اس کے فوت ہو جانے کے بعد حضرت شہنشاہ ظل الٰہی نے بکھر کی حکومت' وراثت کے دستور کے مطابق' اس کے بیٹے سید ابوالفضل کے حوالہ کی جس نے کاکڑہ کے سربراہوں کو قید کر کے ان کے دو ایک آدمی ہاتھی کے پیروں تلے دبوا کر مروا دیئے۔

مورخہ 2 ذوالقعد سنہ 985ھ کو بارگاہ کا ایک معتمد اعتماد خان خواجہ سرا بکھر کی حکومت پر مامور ہوا۔ چونکہ وہ تند مزاج تھا اس لیے اس نے سپاہیوں' رعایا اور اماموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ بعض مخادیم اس سے ناراض ہو کر عالم پناہ کی بارگاہ کی طرف رجوع ہوئے اس دوران میں ہر چند کہ اس نے آدمی بھیج کر ان سے معافی طلب کی لیکن مخادیم کو اطمینان حاصل نہ ہوا اور انہوں نے سفر کیا مصمم ارادہ کیا۔ پھر جب حضرت ظل الٰہی کی بارگاہ میں پہنچ کر انہوں نے اس بدبخت کی شکایت بیان کی تو حضرت کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ چونکہ اس نے ایسے بزرگوں کو رنج پہنچایا ہے' اس لیے وہ کسی نہ کسی وقت ضرور قتل ہو گا۔ بالآخر جیسا کہ ظل الٰہی کی زبان الہام بیان سے صادر ہوا تھا ویسا ہی ہوا۔ یہ حادثہ اس طرح عمل میں آیا کہ وہ ہمیشہ طنز و تمسخر کا شیوہ اختیار کر کے معزز لوگوں کو بھی نازیبا اور رکیک الفاظ سے مخاطب کیا کرتا تھا۔ چنانچہ سپاہیوں کے ایک گروہ نے متفق

ہوکر 10 ربیع الاول سنہ 986ھ کو دن کے وقت اسے دیوان خانہ میں قتل کر ڈالا۔

اعتماد خان کے بعد حضور عالی نے ولایت بکھر کو مشترکہ طور پر مسند عالی فتح خان مہارت اور راجہ ٹوڈرمل کے عزیز مسند عالی راجہ پرمانند کی جاگیر مقرر فرمایا۔

مذکورہ سال کے ماہ رجب میں یہ دونوں مسند عالی بکھر میں آئے اور اپنے متعلقہ علاقوں پر متصرف ہوئے۔ دو سال بعد پرمانند حسب الحکم دربار کی ملازمت کے لیے عالم پناہ کی بارگاہ کو روانہ ہوگیا اور دھاریجہ قبائل اس کے بھائی مادھو داس کے مخالف ہوکر جاکر آلور کے قلعہ میں محصور ہوگئے۔ دو تین بار جنگ ہوئی جس میں طرفین کے کافی آدمی قتل ہوئے۔ آخر جب اوباشوں نے یورش کردی تو مسند عالی فتح خان نے فسادیوں کو دفع کرنے کے لیے اپنے آدمی روانہ کیے چنانچہ وہ لوگ شکست کھا کر منتشر ہوگئے۔ انہی ایام میں فتح خان بارگاہ کی جانب روانہ ہوا اور جب حضرت کی حاضری سے مشرف ہوا تو اس کا عہدہ بڑھا کر پرمانند کی جاگیر بھی اسے تنخواہ میں عطا ہوئی۔ فتح خان نہایت سادہ لوح اور زردوست شخص تھا۔ وہ ہمیشہ میٹھی زبان استعمال کرتا۔ لوگوں کے ساتھ اس نے اچھا سلوک اور برتاؤ کیا۔ سمانہ کے مضافات کے زمینداروں میں اس کا ایک ناتجربہ کار اور نادان وکیل شہاب خان تھا۔ وہ فرید ڈھر کی ترغیب و تحریص پر خان ناہر کے لوگوں سے مل گیا اور لشکر لے کر کن کوٹ کے قلعہ پر حملہ آور ہوا یہ قلعہ ابراہیم خان ناہر کے قبضہ میں تھا۔ یہاں زبردست جنگ ہوئی جس میں فتح خان کے خاصے آدمی قتل ہوگئے۔ شہاب خان بھی بھائیوں سمیت اس جنگ میں کام آیا۔ یہ خبر جب بارگاہ کے درباریوں کے گوش گزار ہوئی تو انہی ایام میں اس کی جاگیر منتقل ہوکر نواب محمد صادق خان کی تنخواہ میں مقرر ہوئی اور حضور نے بکھر کا ملک نواب محمد صادق خان کو تنخواہ اور جاگیر میں دے کر اسے ٹھٹھہ فتح کرنے کی خدمت کا حکم دیا۔

مذکورہ نواب 12 ربیع الاول سنہ 994ھ کو منگل کے دن بکھر میں وارد ہوا۔ مخدوموں اور بزرگوں نے اس کا استقبال کیا اور وہ بھی سب کی عزت و تعظیم بجالایا۔ کچھ عرصہ بکھر میں قیام کر کے اور وہاں کے معاملات کو درست کر کے اسی سال وہ ماہ ذی الحجہ میں سیوستان روانہ ہوا۔ خان مذکور کے جانے سے پہلے اس کے آدمیوں نے دو ایک بار جاکر مرزا جانی بیگ کے لوگوں سے جنگ کی جس میں مرزا جانی بیگ کے خاص آدمی جیسے کہ سلطان محمود خان برندق، کوچک بن سبحان قلی اور عبداللہ کا نجرجہ وغیرہ ان معرکوں میں مارے گئے، دستم کا باپ رستم گرفتار ہوا اور محمد صداق خان کی فتح

ہوئی۔ جب وہ خود روانہ ہوا تو مرزا کے لشکر کے سردار سبحان قلی ارغون نے دریا کے کنارے قلعہ بنا کر اور اسے اسباب و اسلحہ جات سے آراستہ کر کے کثیر غراب اور کشتیاں قلعہ کے نیچے جمع کر دیں۔ جب محمد صادق خان کا لشکر ان کے قریب پہنچا تو وہ جنگ کے لیے غرابوں سے باہر نکلا لیکن ارغون لشکر نے اس مرتبہ بھی شکست کھائی اور ان کے کثیر افراد قتل اور زخمی ہوئے۔ خود سبحان قلی بھی زندہ گرفتار ہوا اور بارہ غراب بھی ہاتھ آئے۔

ان فتوحات سے خوش ہو کر محمد صادق خان نے سیوستان کا محاصرہ کیا۔ جب محاصرہ نے طول کھینچا تو اس نے ایک بڑی سرنگ لگائی جس کے وجہ سے قلعہ کے سامنے کا دروازہ اور فصیل اڑ گئی۔ محمد صادق خان نے حکم دیا کہ میری اجازت کے بغیر کوئی بھی شخص قلعہ میں اندر نہ جائے۔ چنانچہ دھواں اور ابخرات زائل ہوئے تو اہل قلعہ نے ہاتھوں ہاتھ نئی دیوار کھڑی کر کے توپیں اور گولے سر کرنے شروع کر دیئے۔ جو لوگ کہ قوت بازو سے فصیل اور دروازہ پر جا چڑھے تھے وہ سب زمین پر آ گرے مگر انہیں کوئی گزند نہ پہنچا۔ اسی عرصہ میں مرزا جانی بیگ بھی خشکی کی افواج اور بحری لشکر لے کر مہران کے سامنے اس مقام پر آ گیا کہ جو سیوہن سے 6 کوس کے فاصلہ پر ہے۔ چنانچہ محمد صادق خان نے محاصرہ چھوڑ کر مرزا جانی بیگ کے مقابلہ کی طرف توجہ دی۔ جب وہ لکی کے پہاڑوں کے سامنے پہنچا تو مرزا جانی بیگ نے محمد صادق خان کی چھاؤنی کے سامنے غراب لا کر توپیں اور گولے سر کرنے شروع کر دیئے۔ چند دنوں بعد کہ جب وہ ایک دوسرے کے مد مقابل ہو کر جنگ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے' شاہی فرمان آ پہنچا کہ مرزا جانی بیگ نے شایان شان تحائف بارگاہ میں بھیج کر عجز و انکسار و اخلاص ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ محمد صادق خان بکھر واپس آ گیا اور کچھ عرصہ کے بعد جہاں پناہ کی بارگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے ایک سال بعد جاگیر میں تبدیلی آئی دونوں سالوں کی خریف کی وہ فصلیں کہ جو خان موصوف کی جاگیر سے متعلق تھیں ٹڈی دل کی مصیبت کا شکار ہو گئیں جس کی وجہ سے بکھر میں سخت گرانی اور قحط پھیل گیا۔ بیشتر لوگ ملک چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے اور سمیجہ بلوچ قبائل نے دریا کے دونوں کناروں پر کوئی بھی زراعت باقی نہ چھوڑی۔

ماہ ربیع الثانی سنہ 996ھ میں یہ جاگیر نواب اسماعیل قلی خان کی طرف منتقل ہوئی اور اس کا بیٹا رحمان قلی بیگ بکھر میں آیا۔ وہ چونکہ ایک بلند اقبال امیر زادہ تھا' اس لیے بکھر کے لوگوں سے

نہایت شفقت کے ساتھ پیش آیا اور اہل قلعہ کو سلوک اور معاش سے ممنون کیا۔ بکھر کی ویرانی اس کی کوششوں سے آبادی میں تبدیل ہونے لگی۔ اس کے بعد جب اسماعیل قلی خان ملتان چھوڑ کر درگاہ کو واپس چلا گیا تو پھر جاگیر میں تغیر رونما ہوا اور وہ شیرو یہ سلطان کے حوالہ ہوئی۔

اوائل محرم سنہ 997ھ میں شیرو یہ سلطان بکھر میں وارد ہوا۔ چونکہ وہ شرابی تھا اس لیے سارا کاروبار اپنے زرخرید غلاموں کے سپرد کر کے وہ شب و روز فسق و فجور اور لہو ولعب میں مشغول رہا کرتا۔ دربار میں وہ بہت کم بیٹھا کرتا اور اس میں آنے کی اجازت کسی کو گاہے گاہے ہی ملتی تھی۔ اکثر فقرا کے وظائف معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک بار وہ مال اور معاملات کے انتظام کے لیے باہر نکلا اور کچھ مدت ایک دکان میں قیام کر کے وصولیاں بھی کرتا رہا اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے محمد حسن کو سیوی پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ وہاں افغانیوں نے لشکر جمع کر کے اس سے جنگ کی۔ شیرو یہ کے بیٹے کے مقدمہ میں بڑدی بلوچ تھے جو کہ پہلے ہی حملہ میں کنارہ کر گئے اور غنیم نے بغیر کسی رکاوٹ کے قلب پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں بہتیرے آدمی قتل اور کثیر آدمی گرفتار ہو گئے جس کی وجہ سے وہ شکست کھا کر بالآخر پیچھے پلٹے۔ چونکہ ان دنوں گرم ہواؤں کا موسم تھا چنانچہ کافی آدمی لو اور پیاس کا شکار ہو کر مر گئے اور باقی ماندہ لوگ جو واپس آ سکے وہ بھی کافی عرصہ بعد اپنی اصلی حالت میں آئے۔

جب اس کے مظالم کی زیادتی حد کو پہنچ گئی تو اچانک عالم الغیب کی جانب سے اس کے تبادلہ کی خوشخبری اہل بکھر کو ملی اور لوگ اس شریر سے نجات پا کر امن کی زندگی گزارنے لگے۔ ملک بکھر دوسری مرتبہ نواب محمد صادق کی جاگیر میں منتقل ہوا۔ مورخہ 12 ربیع الاول سنہ 998ھ کو نواب محمد صادق خان کا فرزند مرزا محمد زاہد بکھر میں وارد ہوا اور رائمہ و رعایا کے ساتھ اچھا سلوک کر کے اس نے ظلم کے مارے ہوؤں کے دلوں پر عدل کا مرہم رکھا۔ مرزا زاہد نہایت خوبصورت اور خوش اخلاق تھا۔ علما و فضلا سے اکثر صحبت رکھتا تھا۔ محمد صادق خان کی سند کے مطابق اس نے سبھوں کی تنخواہیں اور وظائف جاری کر کے ظالموں کے دست تعدی کو مظلوموں پر دراز ہونے سے روک دیا۔ محمد صادق خان کا وکیل خواجہ محمد معصوم بھی صفات حمیدہ سے مزین تھا اور ہر چھوٹے بڑے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ چنانچہ بکھر کے لوگ دوبارہ مطمئن ہو کر کاشت و زراعت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسی سال ربیع میں اچانک آفت سماوی نازل ہوئی اور اتنی رعایتوں کے باوجود

رعایا کے لیے تاریک دن آ گئے اور کچھ ہی عرصہ بعد پیداوار کے نایاب ہو جانے کی وجہ سے دوسری بار قحط' گرانی اور تنگی نمودار ہوئی۔

اسی اثناء میں بادشاہ کی رگ حمیت جنبش میں آئی۔ چونکہ جب ہمائے سلطانی نے تختگاہ لاہور پر اپنی منزل کا سایہ کیا تھا تو مرزا شاہ حسن کی طرح مرزا جانی بیگ نے بھی فریضہ اطاعت ادا نہ کیا تھا اور اپنی خود مختاری کا دم بھرنے لگا تھا اس لیے بادشاہ نے نواب خانخانان کو ٹھٹھہ کی تسخیر اور بلوچوں کے استیصال کے لیے مامور کیا جس نے اسی سال 22 شوال کو خریف کے وسط میں بکھر آ کر ضروری امور اور کاروبار پر توجہ دی۔ انہی ایام میں مولف تاریخ نے بھی گجرات سے آ کر بادشاہ کی ملازمت کا شرف حاصل کیا۔ حسن اتفاق سے والدہ نے بھی کچھ تحائف بھیجے تھے چنانچہ انہیں بھی نگاہ انور میں لایا۔ حضرت نے کمال توجہ سے دریافت کیا کہ تمہیں والدہ سے جدا ہوئے کتنے سال گزرے ہیں۔ عرض کیا کہ تقریباً بیس سال ہوئے ہوں گے۔ اس پر عنایت فرما کر حکم دیا کہ میر معصوم والدہ کی خدمت میں جا کر دوبارہ درگاہ کی ملازمت میں واپس آ جائے اور بخشی اس کی جاگیر کسی دوسرے پرگنہ میں منتقل کریں۔ اس موقع پر محمد صادق خان نے دستگیری کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ یہ بکھر جا رہا ہے اس لیے اگر اس کی جاگیریں بھی اس طرف منتقل کر دی جائیں تو بہت بہتر ہوگا۔ حضرت نے فرمایا کہ بکھر تو خانخانان کی جاگیر مقرر ہو چکا ہے۔ نواب خانخانان اس موقع پر حاضر تھا اس نے عرض کیا کہ اگر حضور اسے بکھر کی سرکار سے جاگیر عطا کریں تو خادم کو منظور ہے چنانچہ حضور نے حکم فرمایا کہ اسے بکھر کی سرکار سے جاگیر دی جائے۔ حکم کے مطابق بخشیوں نے دربیلہ کاکڑہ اور چانڈو کی راقم الحروف کے لیے جاگیر متعین کی۔ جاگیر مقرر ہو جانے کے بعد حضرت نہایت بندہ پروری فرماتے ہوئے کشتی میں تشریف لے گئے اور راقم الحروف کو اپنی خاص پوستین سے سرفراز کر کے رخصت عطا فرمائی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی زبان الہام بیان سے یہ بھی فرمایا کہ ''بہ نشین وسفر کن کہ بغایت خوب است'' غرض 14 صفر 999ھ کو راقم الحروف بکھر پہنچا اور نواب خانخانان بھی بکھر میں قیام پذیر ہوا۔ چونکہ ان دنوں گرم ہواؤں اور طغیانی کا موسم تھا اس لیے سبھوں نے کچھ دنوں بکھر میں قیام کیا پھر جب سہیل تارا نمودار ہوا تو مولف کو بہادر خان' ملا محمد اور بعض دیگر افراد کے ساتھ رخصت عنایت ہوئی۔ جب ہم سیوہن پہنچ گئے تو نواب خانخانان بھی بعد میں وہاں ہم سے آ ملے۔ چونکہ اہل سیوہن قلعہ بند ہو گئے تھے اس لیے نواب نے امرا کی

جماعت سے مشورہ کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یعنی پہلے جانی بیگ کی سرکوبی کے لیے ٹھٹھہ جانا چاہیے یا پہلے سیوہن کی مہم سر کرنی چاہیے اور اس کے بعد آگے بڑھنا چاہیے۔ اس پر سب نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ چونکہ سیوہن ہمارے راستہ پر ہے اور ہماری فوجوں اور کشتیوں کا گزر ادھر ہی سے رہے گا اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ پہلے ہم سیوہن فتح کر لیں اور پھر اس کے بعد اطمینان کے ساتھ آگے بڑھیں۔ یہ فیصلہ ہونے پر انہوں نے دریا عبور کیا اور سیوہن کے چاروں طرف مورچے تقسیم کر کے سرنگ لگانے میں مصروف ہو گئے۔ اسی اثناء میں خبر ملی کہ نواب جانی بیگ لشکر عظیم لے کر ٹھٹھہ سے جنگ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی محاصرہ چھوڑ کر وہ جانی بیگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جانی بیگ یہ خبر سن کر نصر پور سے کچھ اوپر دریا کے کنارے موضع بوہری میں قلعہ بنا کر مستحکم ہو گیا۔ پھر جب خانخانان اس قلعہ سے چھ کوس کے فاصلہ پر آ پہنچا تو جانی بیگ نے خسرو خان اور دیگر امرا کی سرکردگی میں سو دو سو جنگی غراب اور دیگر کثیر کشتیاں خانخانان کے لشکر گاہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیں اور دریا کے دونوں کناروں پر فوجیں متعین کر دیں۔ خانخانان نے بھی کچھ لشکر کنارے پر اتار کر لشکر گاہ سے کچھ آگے دریا کنارے پر توپوں کے لیے پانچ چھ جریب زمین پر ریت میں ایک چھوٹا سا قلعہ بنوا کر محمد مقیم بخشی، علی مردان ترمذی اور اس کتاب کے مولف کو بعض دیگر امرا کے ساتھ اس قلعہ پر متعین کیا۔ وہ ایسے مقام پر واقع تھا کہ غرابوں کو وہاں پہنچ کر اس قلعہ کے سامنے سے گزرنا پڑتا کیونکہ سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر ایک بڑا جھنڈ تھا اور انہیں مجبوراً اسی قلعہ کے سامنے سے ہو کر لشکر گاہ تک پہنچنا تھا۔ درحقیقت یہ بہترین تجویز محمد مقیم نے پیش کی تھی کہ توپوں کو آگے بھیج دینے سے یہ فائدہ ہوگا کہ لشکر گاہ کو کوئی گزند نہ پہنچ سکے گا۔

مورخہ......شوال سنہ 999ھ کو سورج غروب ہونے کے بعد غراب اس مقام پر پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف بڑا جھنڈ ہے اور دوسری جانب سامنے قلعہ استادہ ہے چنانچہ لاچار وہیں ٹھہر گئے اور دونوں جانب سے کچھ دیر توپیں سر ہوتی رہیں۔ اس طرف سے خانخانان نے راتوں رات ایک دستہ لشکر گاہ کے سامنے دریا کے دوسرے کنارہ پر پہنچا دیا۔ دوسری طرف سے جانی بیگ کے مامور کردہ لشکر نے رات کو آ کر لشکر گاہ پر حملہ کیا۔ لیکن چونکہ یہاں انتہائی دور اندیشی اور احتیاط برتی گئی تھی اس لیے وہ کچھ نہ کر سکے۔ صبح کے وقت غراب لشکر گاہ کی طرف متوجہ ہوئے

اور اس قلعہ پر کہ جس میں توپیں نصب تھیں توپیں سر کرنی شروع کر دیں۔ قلعہ کی توپوں سے جو گولے نکلتے وہ غرابوں کو لگتے ہوئے جا کر اس فوج پر گرتے کہ جسے خانخانان نے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچایا تھا چنانچہ توپوں کے دہانے کافی نیچے کر دیئے گئے۔ اب گولے غرابوں سے پہلے دریا کے قریبی حصہ پر لگتے اور ایسا دکھائی دیتا کہ پہلے وہ پانی پر لگتے اور پھر ٹپہ کھا کر آٹھ نو کشتیوں کو نقصان پہنچاتے اور کچھ آدمیوں کو بھی ہلاک کرتے۔ چونکہ اس طرف غرابوں میں بھی پورا بندوبست تھا اور ہر غراب میں بڑھئی مقرر تھے اس لیے جوں ہی کسی غراب کو نقصان پہنچتا اسے فوراً ٹھیک کر لیا جاتا۔ غرض اس دن طرفین میں اسی طرح جنگ اور توپ اندازی ہوتی رہی۔ پانی کے ایک طرف خانخانان کا لشکر اور دوسری جانب درختوں کا جھنڈ ہونے کی وجہ سے غرابوں کو مجبوراً دریا کے وسط سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ یہاں پانی کا بہاؤ بھی تیز تھا اس لیے ڈھائی پہروں تک انہیں چپو بھی چلانے پڑے اور جنگ بھی کرنی پڑی پھر توپوں کے حملوں سے بھی ان کے کثیر آدمی مارے گئے۔ چنانچہ انہوں نے بالآخر محسوس کیا کہ وہ اس قلعہ کے سامنے سے نہ گزر سکیں گے اور خواہ مخواہ ان کے بہت سے آدمی تلف ہو رہے ہیں۔ مجبوراً انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔ اب ایک طرف سے خانخانان کے غرابوں نے ان کا تعاقب کیا اور دریا کے دوسرے کنارے سے فوج نے بھی ان پر یورش کر دی۔ اس موقع پر خسرو خان ان کی بڑی کامیاب قیادت کر رہا تھا۔ چنانچہ فرار ہوتے وقت اس نے اپنے غراب کو پیچھے رکھ کر دوسرے جملہ غرابوں کو آگے کر دیا تھا۔ جن کا تعاقب کرتے وقت کچھ غراب کہ جس میں فرنگی اور بعض دوسرے سپاہی سوار تھے۔ شاہی فوج کے ہاتھ آ گئے۔ اسی درمیان میں شاہی غراب خسرو خان کے غراب کے نزدیک جا پہنچے تھے لیکن اچانک شاہی غراب کے بارود خانہ میں آگ لگ گئی جس کی وجہ سے کچھ لشکر اسی عرصہ میں آگ کی نذر ہو گیا۔ چنانچہ خسرو خان کا غراب اور دوسرے جملہ غراب بچ کر نکل گئے۔ اس جنگ میں ان کے بہت سے آدمی مارے گئے اور خانخانان کو فتح عظیم حاصل ہوئی۔

دوسرے دن وہاں سے کوچ کر کے جانی بیگ کے قلعہ کی جانب توجہ کی گئی۔ اس نے بڑا مضبوط قلعہ بنایا تھا اور قلعہ کے اندر درختوں کے گھنے جھنڈوں کا بھی ایک رقبہ تھا۔ جس کے وجہ سے اسے حاصل کرنا بے حد مشکل نظر آتا تھا۔ چنانچہ جب محاصرہ کو کافی دن گزر گئے اور خانخانان اور اس کے امرا نے دیکھا کہ یہاں کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تو ایک رات انہوں نے چاروں طرف سے

قلعہ پر یورش کر دی لیکن چونکہ قلعہ مضبوط تھا اس لیے اس ترکیب سے بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اس کے بعد انہوں نے طے کیا کہ ہمیں ولایت ٹھٹھہ میں پھیل جانا چاہیے' کچھ ٹھٹھہ جائیں اور کچھ سیوہن' کچھ بدین کا رخ کریں کچھ فتح باغ کا اور کچھ لوگ جون کی طرف چلے جائیں۔ شاہ بیگ خان قلعہ شاہ گڑ کی طرف جائے کہ جو شاہ قاسم خان ارغون نے تعمیر کرایا تھا۔ چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق نواب خانخانان ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہوا اور دوسرے امرا فتح باغ' بدین اور جون کی طرف گئے۔ شاہ بیگ خان نے جا کر قلعہ شاہ گڑ کا محاصرہ کیا اور خانخانان کے ملازمین سید بہاؤ الدین' بختیار بیگ' اس کتاب کا مولف' حسن علی عرب' جان بیگ اور آقائے مقصود بیگ نے سیوہن جا کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ جب اہل قلعہ کی حالت تنگ ہوئی تو ان کے خطوط جانی بیگ کے پاس گئے کہ ''اگر آپ ہمارے پاس پہنچ گئے تو بہتر ورنہ اب یہ قلعہ ہاتھوں سے جاتا ہے۔'' جانی بیگ نے جب دیکھا کہ واقعی قلعہ ہاتھوں سے جا رہا ہے تو وہ فی الفور سیوہن کی طرف متوجہ ہوا۔ جب وہ بیس کوس تک آ پہنچا تو ہم نے آپس میں مشورہ کیا اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ سبھوں کی رائے ہوئی کہ جنگ کرنی چاہیے چنانچہ محاصرہ چھوڑ کر ہم جانی بیگ کی طرف روانہ ہوئے۔ خانخانان کو جب جانی بیگ کے ہمارے لشکر کی طرف رجوع ہونے کی خبر ملی تو اس نے اپنے کچھ امرا جیسے کہ محمد خان نیازی' بہادر خان اور اپنے ملازم میاں دولت خان کو امداد کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ ہم ادھر لکی کے قریب پہنچے تھے کہ یہ جماعت بھی ہم سے آ ملی۔ یہ دونوں لشکر مل کر کل ایک ہزار دو سو سوار ہوئے۔ جانی بیگ پہاڑ کی طرف سے دس ہزار سوار اور بہت سے تیر انداز پیادے اور دریا کی طرف سے غراب اور توپ خانہ ساتھ لیے ہوئے آ رہا تھا۔ جب وہ چھ کوس کے فاصلہ تک آ پہنچا تو خانخانان کے امرا نے مشورہ کیا کہ اگر ہم یہاں ٹھہر جائیں گے تو وہ ہم پر چاروں طرف سے حملہ کر دے گا یعنی خود سامنے سے' تیر اندازوں کا لشکر پہاڑ کی طرف سے' غراب دریا کی جانب سے' اور اہل سیوہن پیچھے سے۔ اس لیے جانی بیگ سے آگے جا کر جنگ کرنا ہی مناسب نظر آتا ہے۔ یہ فیصلہ کر کے ...... تاریخ کو فوجیں آراستہ کر کے ہم جانی بیگ کی طرف روانہ ہوئے۔ ادھر جاسوسوں نے جانی بیگ کو خبر دی کہ لشکر آ رہا ہے لیکن جانی بیگ نے تسلیم نہ کیا اور کہنے لگا کہ وہ آدمی ہی کتنے ہیں! ان کی کیا مجال ہے کہ جو وہ ہم پر چڑھائی کر کے آئیں! اچانک اسے ہماری فوج کی گرد نظر آئی تب جا کر اسے ہماری آمد کا یقین ہوا اور وہ اپنا لشکر درست کرنے لگا۔ دو پہر کے وقت دونوں

لشکروں کا تصادم ہوا۔ جب ہمارے مقدمہ سے جنگ ہوئی تو ہمارے کچھ لوگ تاب مقابلہ نہ لا کر فرار ہو گئے اور جانی بیگ کا لشکر تعاقب کرتا ہوا قلب تک آ گیا۔ اب جانی بیگ کی فوج گروہ در گروہ پہنچنے لگی اور جنگ شدت اختیار کر گئی۔ تین چار مرتبہ سخت معرکے ہوئے لیکن بالآخر جانی بیگ کی سپاہ نے شکست کھائی۔ جانی بیگ نے ثابت قدم رہتے ہوئے سخت جنگ کی لیکن جب اس نے اس کا کوئی فائدہ نہ دیکھا تو خود بھی فرار ہو گیا اور اس کے کثیر آدمی قتل اور قید ہو گئے۔

میدان جنگ سے بیس کوس دور موضع انڑ پور میں جا کر جانی بیگ نے پھر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا اور اس میں مستحکم ہو کر بیٹھ رہا۔ شاہی خیر خواہ وہاں بھی جا پہنچے اور محاصرہ کر لیا۔ کچھ دنوں بعد نواب خان خانان نے بھی وہاں پہنچ کر مورچے تیار کرائے۔ پھر روزانہ جنگ ہوتی رہی اور دونوں جانب سے کثیر آدمی قتل ہوتے رہے۔ آخر ہم لوگ مٹی کھود کر اس کے انبار کی اوٹ لیتے ہوئے قلعہ کی جانب بڑھنے لگے اور مٹی کے یہ ڈھیر بالآخر خندقوں تک جا پہنچے۔ اس پر جانی بیگ عاجز آ کر صلح کے لیے آمادہ ہوا۔ اس کے عریضہ کی یہ صورت تھی: میں تیس غراب اور سیوہن کا قلعہ آپ کے حوالہ کرتا ہوں اور پھر ٹھٹھہ پہنچنے کے بعد آ کر آپ سے ملاقات کروں گا۔'' خانخانان نے اپنے امراء سے رائے دریافت کی۔ انہوں نے متفقہ طور پر کہا کہ چونکہ اس کی حالت بے حد نازک ہو چکی ہے اس لیے صلح نہ کرنی چاہیے کیونکہ ہم اپنے کام کو آج یا کل پر پہنچا چکے ہیں اور اسکا بھی امکان ہے کہ ٹھٹھہ پہنچنے پر جانی بیگ کی رائے تبدیل ہو جائے۔ خانخانان نے کہا کہ ''اگر ہم قلعہ سے چمٹے رہیں گے تو اول تو دونوں طرف کے خاصے آدمی قتل ہوتے رہیں گے دوم یہ کہ ان کے اہل وعیال پاجیوں کے ہتھے چڑھیں گے اور ان کی بے عزتی ہوگی اس لیے ہم صلح کرتے ہیں اور اسے اپنا جیسا پنج ہزاری کا منصب بندگان حضرت کی خدمت سے دلوائیں گے۔'' بے شک اس کی رائے درست تھی۔ جانی بیگ کے ایلچیوں نے آ کر عہد و پیمان کیے اور لا کر غراب حوالہ کر دیئے ساتھ ہی ساتھ سیوہن کا قلعہ حوالہ کر دینے کے لیے بھی اپنے آدمی سیوہن روانہ کر کے جانی بیگ ٹھٹھہ روانہ ہو گیا۔

خان خانان طغیانی آب کا موسم ''سن'' میں گزار کر سرما کی ابتدا میں ٹھٹھہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ہم فتح باغ کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ جانی بیگ استقبال کے لیے آیا۔ یہاں اس کے اور خانخانان کے درمیان ملاقات ہوئی اور بڑی پر لطف اور طویل نشست ہوئی۔ اس کے بعد جانی بیگ کو وہاں

چھوڑ کر خانخانان ٹھٹھہ کی سیر کی طرف متوجہ ہوا۔ جب وہ ٹھٹھہ جا پہنچا تو اس کے عقب میں جانی بیگ بھی گیا اور جو کچھ کہ اس کے امکان میں تھا وہ اس نے امرا اور لشکر پر صرف کیا یہاں بڑی پرلطف صحبتیں رہیں۔ پھر وہاں سے سمندر کی سیر کے لیے وہ لاہری بندر گئے۔ اس کے بعد جب جانی بیگ کو ساتھ لے کر درگاہ میں حاضر ہونے کا حکم آیا تو دولت خان اور خواجہ مقیم کو ملک کے انتظام کے لیے اپنا نائب مقرر کر کے خانخانان وہاں سے براہ راست بارگاہ معلیٰ کی طرف روانہ ہوا ور جانی بیگ کو ساتھ لے کر یلغاریں کرتا ہوا مورخہ.....کو پابوسی کے شرف سے مشرف ہوا۔ خانخانان کی سفارش پر حضرت بادشاہ جانی بیگ کے ساتھ بڑے لطف و کرم کے ساتھ پیش آئے ور ولایت ٹھٹھہ کو اس کے اور خانخانان کے سپرد کیا۔ جانی بیگ حضرت کی خدمت میں رعایت اور اعتماد حاصل کر کے پنج ہزاری کے منصب پر سرفراز ہوا۔ حضور کی اس پر بڑی عنایت اور توجہ ہوئی اس عدتک کہ خسرو شاہ کو اس کی دامادی کے لیے نامزد فرمایا۔ پھر جن دنوں کہ حضرت دکن کی طرف متوجہ تھے اور احمد نگر اور قلعہ اسیر گڑھ فتح ہو چکا تھا انہی دنوں جانی بیگ سرسام کے مرض میں مبتلا ہو کر 27 رجب سنہ 1008ھ کو انتقال کر گیا اور نواب علامی کی سفارش پر کہ ''ٹھٹھہ کا ملک میرزا جانی بیگ کے بیٹے مرزا غازی بیگ کے حوالہ کیا جائے۔'' حضرت نے ایسا ہی کیا۔

❁

اشاریہ*

سہ ماہی 'تاریخ'، شمارہ ۱ تا ۱۵

احمد، امتیاز، 'جنوبی ایشیا میں آزادی کے بعد قوم پرستی'، مترجم طارق عزیز سندھو، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۴۲ تا ۵۴

اسکوٹ، جون، 'عورتوں کی تاریخ'، شمارہ نمبر ۲، جولائی، ۱۹۹۹ء، ص ص ۷ تا ۳۲

انصار الدین، ڈاکٹر، 'مغرب میں ادارہ سازی کا عمل: نئی روشن خیالی کے انسانی پہلو'، شمارہ نمبر ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۸۱ تا ۱۹۴

انصار الدین، ڈاکٹر، 'عہد وسطیٰ کا معاشرہ اور ثقافت: سوفٹ ویئر اور ہارڈ ویئر'، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۹۵ تا ۳۰۰

باؤم، ایرک ہوبس، 'ماضی کا شعور'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۵، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ص ۷ تا ۱۹

برک، پیٹر، 'نئی تاریخ: ماضی اور مستقبل'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۷ تا ۳۸

برنال، جے۔ ڈی، 'یورپ میں قرونِ وسطیٰ کی سائنس اور ٹیکنیک: ایک تاریخی جائزہ'، مترجم رشید ملک، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۱۹ تا ۱۶۶

برنی، ضیاء الدین، 'فتاوائے جہانداری'، مترجم سید جمال الدین، شمارہ ۳، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ص ۲۴۳ تا ۲۸۴

برنی، ضیاء الدین، 'فتاوائے جہانداری'، مترجم سید جمال الدین، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۹۳ تا ۲۶۱

برنی، ضیاء الدین، 'فتاوائے جہانداری'، مترجم سید جمال الدین، شمارہ ۵، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۳۳ تا ۳۰۴

برنی، ضیاء الدین، 'فتاوائے جہانداری'، مترجم سید جمال الدین، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۳۳ تا ۲۹۴

بروڈل، فرنانڈ، 'تہذیب کی تاریخ'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۵، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۰ تا ۴۸

بریخت، 'تاریخ کے سوالات'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۱، ص ص ۲۸ تا ۲۹

بلاٹ، جے۔ ایم، 'تاریخ اور یورپی مرکزیت کا نظریہ'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ص ۹ تا ۵۶

* مرتبہ: نوین جی حیدر اور سمیرہ بیگ، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

پانڈے، گیانیندر، ’کیا ایک مسلمان بھی انڈین ہوسکتا ہے؟‘، مترجم امجد محمود چوہدری، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۳۱ تا ۶۵

پرشاد، اوم پرکاش، ’اورنگزیب: ایک نیا زاویہ نظر‘، شمارہ ۵، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ص ۸۶ تا ۱۸۵

پرنس، گین، ’زبانی تاریخ‘، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۳۹ تا ۴۹

تاج الدین، مفتی، ’اقتباس از تاریخ پنجاب‘، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۲۴ تا ۱۳۶

تیمنن، تے پیو، ہندو احیاء پسندی اور ہندو وتوا تحریک‘ مترجم امجد محمود چوہدری، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۶۰ تا ۹۷

ٹیلیکر، ڈاکٹر منیشا/ظفر علی خان، ’ہندوستان میں قوم پرستی کا بدلتا مکالمہ‘، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۶۶ تا ۸۸

جاوید، قاضی، ’پنجاب کی صوفیانہ تاریخ پر ایک نظر‘، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۵۳ تا ۶۸

جاوید، قاضی، ’بابا نانک: شخصیت اور خیالات کا ایک جائزہ‘، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۲ تا ۲۷

چندر، ستیش، ’شمالی ہندوستان میں بھگتی تحریک کے عروج کا تاریخی پس منظر‘، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۳۹ تا ۱۶۳

چندر، ستیش، ’عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ثقافت اور سیاست: ایک توضیحی مضمون‘، مترجم ظہور چوہدری، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۴۱ تا ۱۷۹

حبیب، پروفیسر محمد، ’سلاطینِ دہلی کا سیاسی نظریہ‘، مترجم بیگم افسر عمر خان، شمارہ ۱، ص ص ۲۱۵ تا ۲۸۱

حبیب، پروفیسر محمد، ’سلاطینِ دہلی کا سیاسی نظریہ‘، مترجم بیگم افسر عمر خان، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۲۰۱ تا ۲۶۵

حبیب، عرفان، ’۱۸۵۷ء کی آمد‘، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۰ تا ۳۴

حبیب، عرفان، ’تاریخ ہند اور کسان‘، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۰۸ تا ۱۲۸

خان، عطیہ، ’نوآبادیاتی پنجاب کی قانونی پیچیدگیاں: (۱۹۳۰ء۔۱۸۴۹ء) قانون کی روشنی میں تبدیلی اور تسلسل‘، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۲۳ تا ۵۱

خان، عمر کمال، ’ملتان اور سکھ‘، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۴۶ تا ۱۵۸

رسل، برٹرینڈ، 'تاریخ کے بارے میں'، مترجم قاضی جاوید، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۹ تا ۳۷

سبرامینم، سنجے، 'سنہرے ماضی کا واہمہ'، مترجم طارق عزیز سندھو، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۸۷ تا ۲۹۴

سروانی، عباس خان، 'تاریخ شیر شاہی'، مترجم مظہر علی خان ولا، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۴۵ تا ۲۷۶

سکسینہ، بنارسی پرشاد، 'طبقہ امراء عہدِ سلطانی میں'، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۰۷ تا ۱۴۰

سکسینہ، بنارسی پرشاد، 'ملک عنبر'، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۴۱ تا ۱۵۸

سکند، یوگندر، 'عہدِ حاضر کے بھارت میں آزادی اور مکالمے کا اسلامی پس منظر' 'دلت آواز' کی مسلم تحریروں کا ایک تجزیہ'، مترجم رحمان فیض، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۸۰ تا ۱۱۶

سلطانہ، کشور، 'ہماری زبان اور پدرانہ اقدار'، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۹۴ تا ۲۰۹

سہگل، روبینہ، 'گھر بنانے والی/گھر بگاڑنے والی: مسلمان قومیت میں عورت کی تشکیل'، شمارہ ۱، ص ص ۳۱ تا ۱۷

سہگل، روبینہ، 'اکبر الہٰ آبادی: جدید دور میں مردانگی کا بحران'، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۳۳ تا ۷۰

سہگل، روبینہ، 'تعلیم، ترقی اور بنیاد پرستی'، شمارہ ۳، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ص ۴۸ تا ۱۵۰

سہگل، روبینہ، 'ایٹمی دنیا اور تعلیم'، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۳۲ تا ۱۹۳

سین، امرتا، 'ایک ہزار سال کا تجزیہ'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۱۲۴ تا ۱۴۵

سین، امرتیہ، 'تاریخ اور علمی مہم جوئی'، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۶۹ تا ۲۸۶

شارپ، جم، 'نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۱، ص ص ۷ تا ۲۷

شہزاد، غافر، 'بدلتے معاشرتی تناظر میں گھر کی ہیئت'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۲۰ تا ۱۴۱

شہزاد، غافر، 'لاہور: گھر، گلیاں، دروازے'، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۹۸ تا ۲۴۴

شہزاد، غافر، 'سکھ عہد میں حویلیوں کی تعمیر'، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۳۷ تا ۱۴۵

شہزاد، غافر، 'فوڈ اسٹریٹ سے فوڈ بازار تک'، شمارہ

۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۳۷ تا ۲۴۲

صدیقی، ریاض، 'نوآبادیاتی راج پاٹ کی کہانی جان بمیز کی زبانی'، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۶۷ تا ۱۹۸

طور، سعدیہ، 'حالیہ ورلڈ آرڈر میں این جی اوز کی سیاست'، مترجم ظہور چوہدری، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۹۵ تا ۲۱۰

عالم، ڈاکٹر انیس، 'نوآبادیاتی دور میں اعلیٰ تعلیم: بنگال اور پنجاب کا ردِعمل'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۰۷ تا ۲۱۹

عالم، مظفر، 'تجارت، ریاستی حکمتِ عملی اور علاقائی تبدیلی: مغل ازبک تجارتی تعلقات'، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۵، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ص ۴۹ تا ۸۵

عالم، مظفر، سنجے سبرامینم، 'کسی شناسا خطہ کی دریافت'، مترجم مسعود الحسن، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۳۵ تا ۷۳

عالم، مظفر، 'تصادم اور ہم آہنگی: عہدِ وسطیٰ کے شمالی ہندوستان میں ہندو مسلم تعلقات کا جائزہ'، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۱۷ تا ۱۴۹

عفیف، شمس سراج، 'تاریخ فیروز شاہی (پہلا حصہ)'، مترجم محمد فدا علی طالب، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۳۲ تا ۳۱۸

عفیف، شمس سراج، 'تاریخ فیروز شاہی (دوسرا حصہ)'، مترجم محمد فدا علی طالب، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۷۳ تا ۲۳۴

عفیف، شمس سراج، 'تاریخ فیروز شاہی (تیسرا حصہ)'، مترجم محمد فدا علی طالب، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ص ۲۱۵ تا ۲۷۰

عفیف، شمس سراج، 'تاریخ فیروز شاہی (چوتھا حصہ)'، مترجم محمد فدا علی طالب، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۹۵ تا ۲۷۳

عفیف، شمس سراج، 'تاریخ فیروز شاہی (پانچواں حصہ)'، مترجم محمد فدا علی طالب، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۲۴۱ تا ۲۹۴

عفیف، شمس سراج، 'تاریخ فیروز شاہی (چھٹا حصہ)'، مترجم محمد فدا علی طالب، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۳۷ تا ۲۷۶

علوی، حمزہ، 'ہندوستان فیوڈل ازم سے نوآبادیاتی کیپٹل ازم تک'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۱، ص ص ۹۸ تا ۱۸۱

علوی، حمزہ، 'محکومی کی سیاست کا شکار: مغربی پنجاب کا ایک گاؤں'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۹۴ تا ۱۲۳

علوی، حمزہ، 'پاکستانی قومیت کی علاقائی بنیادیں'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۱۴۶ تا ۱۶۸

علوی، حمزہ، 'کسان اور انقلاب'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۳، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ص ۱۵۱ تا ۲۱۹

علوی، حمزہ، 'پاکستان امریکہ فوجی تعلقات'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۵۰ تا ۹۱

علوی، حمزہ، 'ربا اور سود کی اہمیت'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۵، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۸۶ تا ۲۰۱

علوی، حمزہ، 'پاکستان میں مطلق العنانیت اور ریاستی اقتدار کا جواز'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۳۸ تا ۱۲۸

علوی، حمزہ، 'بعد نوآبادیاتی معاشروں میں ریاستی کنٹرول: پاکستان اور بنگلہ دیش'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۹۹ تا ۱۴۱

علوی، حمزہ، 'پاکستان اور اسلام: نظریہ اور نسل پرستی کا باہمی تضاد'، مترجم طاہر کامران، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ص ۵۷ تا ۱۲۶

علوی، حمزہ، 'ہندوستان اور پاکستان میں اتھنی سٹی کی سیاست'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۷ تا ۴۴

علوی، حمزہ، 'ریاست بحران کی زد میں'، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۷ تا ۸۹

علوی، حمزہ، 'تخلیق پاکستان میں سماجی قوتیں اور نظریہ'، مترجم ظفر علی خان، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۷ تا ۴۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'تعارف'، شمارہ ۱، ص ص ۵ تا ۶

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ہندوستانی قوم پرستی کیا ہے؟'، شمارہ ۱، ص ۱۸۵ تا ۱۹۲

علی، ڈاکٹر مبارک، 'مشرق اور مغرب' شمارہ ۱، ص ص ۱۹۳ تا ۲۰۲

علی، ڈاکٹر مبارک، 'سلک اور مذہب'، شمارہ ۱، ص ص ۲۰۳ تا ۲۱۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ہندوستانی معاشرہ اور نظریات کا تصادم'، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۱۷۱ تا ۱۸۲

علی، ڈاکٹر مبارک، 'اسلام اور بادشاہت'، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۱۸۳ تا ۱۹۰

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ہندو سماج میں عورت'، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۱۹۱ تا ۱۹۷

علی، ڈاکٹر مبارک، 'قدیم مصر کی عورت'، شمارہ ۳،

اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ص ۲۲۳ تا ۲۲۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'پھولوں کا کلچر'، شمارہ ۳، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ص ۲۳۰ تا ۲۳۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'معلومات اور امپائر'، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۶۱ تا ۱۶۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'قدیم یونانی عورت'، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء ص ص ۱۷۰ تا ۱۷۸

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ہندوستان اور روہیلے'، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۷۹ تا ۱۸۵

علی، ڈاکٹر مبارک، 'غصہ اور تاریخ'، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۸۶ تا ۱۹۰

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ابتدائی عیسائیت'، شمارہ ۵، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۰۵ تا ۲۱۶

علی، ڈاکٹر مبارک، 'اقلیتیں اور تعصبات'، شمارہ ۵، اپریل ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۱۷ تا ۲۲۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'کولونیل ازم'، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۱۳ تا ۲۲۲

علی، ڈاکٹر مبارک، 'حب الوطنی'، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۲۳ تا ۲۲۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'کراچی: زندہ شہر کا مرتا ہوا

کلچر'، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۶۴ تا ۱۸۴

علی، ڈاکٹر مبارک، 'مغل ریاست کی تشکیل'، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۸۷ تا ۱۹۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'اکبر اور مغل ریاست'، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۰۰ تا ۲۱۰

علی، ڈاکٹر مبارک، 'مغل زوال'، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۱۱ تا ۲۲۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'یورپی کہانیوں کا ہیرو اور اس کی تشکیل'، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۲۲۲ تا ۲۲۸

علی، ڈاکٹر مبارک، 'تاریخ کانفرنس، افتتاحی کلمات'، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۷ تا ۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'پاکستان کی تاریخ نویسی کے چند اہم مسائل'، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۱ تا ۲۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'سندھ کی تاریخ نویسی'، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۶۹ تا ۸۰

علی، ڈاکٹر مبارک، 'صاحب اور منشی'، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۴۵ تا ۱۴۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ایسٹ انڈیا کمپنی'، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۵۰ تا ۱۵۵

علی، ڈاکٹر مبارک، 'کمپنی اور ہندوستان کی حکومت'، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۵۶ تا ۱۶۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور ماضی کی دریافت'، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۶۲ تا ۱۷۰

علی، ڈاکٹر مبارک، 'پاکستان: شناخت کی تلاش'، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۲۷ تا ۱۵۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'کیتھولک چرچ اور اصلاحِ مذہب'، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۸۵ تا ۱۹۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'شکارپور اور حیدرآباد کے خانہ بدوش تاجر'، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۹۲ تا ۲۰۲

علی، ڈاکٹر مبارک، 'پہلی جنگِ عظیم اور یورپی معاشرہ'، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ص ۲۰۳ تا ۲۱۲

علی، ڈاکٹر مبارک، 'مسخ شدہ تاریخ: ہندوستان اور پاکستان میں تاریخ نویسی'، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۴۵ تا ۷۶

علی، ڈاکٹر مبارک، 'برصغیر میں مسلمانوں کے بدلتے رجحانات'، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۷۷ تا ۸۳

علی، ڈاکٹر مبارک، 'بیجاپور کے صوفی'، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۶۹ تا ۱۷۶

علی، ڈاکٹر مبارک، 'بنگال میں اسلام'، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۷۷ تا ۱۸۴

علی، ڈاکٹر مبارک، 'عباسی خلفاء اور تاریخ کا نیا نقطۂ نظر'، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۸۵ تا ۱۹۲

علی، ڈاکٹر مبارک، 'امریکہ میں نصاب کی کتب'، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۹ تا ۳۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ترکوں کی فتح ہندوستان'، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۲۱۳ تا ۲۱۶

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ہندوستانی تاجر اور یورپی و ایشیائی تجارت'، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۲۱۷ تا ۲۲۳

علی، ڈاکٹر مبارک، 'پنجاب: سکھوں اور انگریزوں کی حکومت'، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۲۲۴ تا ۲۳۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'برطانوی مؤرخ اور سکھ تاریخ نویسی'، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۲۳۲ تا ۲۳۸

علی، ڈاکٹر مبارک، 'شہر: سیاست، ثقافت اور معیشت'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۹ تا ۲۳

علی، ڈاکٹر مبارک، 'بنگالی ریناساں'، شمارہ ۱۲،

جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۸۷ تا ۱۹۵

علی، ڈاکٹر مبارک، 'سماجی مساوات اور درجہ بندی'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۹۶ تا ۲۰۴

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ہندوستان میں تاریخی نصابی کتب کی تحریرنو'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۲۰ تا ۲۲۴

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ہندوستان میں حکومت اور تاریخ کا تصادم'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۲۵ تا ۲۲۸

علی، ڈاکٹر مبارک، 'مذہب اور سیاست: امتزاج، تصادم اور علیحدگی'، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۸۰ تا ۱۹۷

علی، ڈاکٹر مبارک، 'یورپی مرکزیت کا نقطۂ نظر'، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۴۷ تا ۲۵۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'الہند کی تشکیل'، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۵۲ تا ۲۶۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'سلاطینِ دہلی'، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۶۲ تا ۲۶۶

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ابتدائیہ'، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ۵

علی، ڈاکٹر مبارک، 'سکھ مذہب اور تاریخ پر ایک

نظر'، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۷ تا ۱۱

علی، ڈاکٹر مبارک، 'رنجیت سنگھ: کیا وہ ایک روادار حکمراں تھا؟'، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۸ تا ۳۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'تحریکِ خلافت: سیاست کو مذہبی بنانے کا عمل'، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۵۰ تا ۱۶۶

علی، ڈاکٹر مبارک، 'تقسیمِ ہند: مختلف نقطہ ہائے نظر'، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۰۱ تا ۲۰۷

علی، ڈاکٹر مبارک، 'تقسیمِ ہند'، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۰۸ تا ۲۱۳

علی، ڈاکٹر مبارک، 'زبان کا سیاسی استعمال'، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۱۴ تا ۲۱۹

علی، ڈاکٹر مبارک، 'ہندوستان و پاکستان: تاریخ کی نصابی کتب'، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۲۰ تا ۲۲۶

علی، ڈاکٹر مبارک، 'جاپان اور تاریخ کی نصابی کتب'، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۲۹ تا ۲۳۲

عمر، ندیم، 'پنجاب میں بصری فنون کی تعلیم اور میو اسکول آف آرٹس لاہور: ایک تنقیدی جائزہ'، شمارہ ۱۲، جنوی ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۴۲ تا ۱۵۴

سندھو، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۸۳ تا ۹۶

قدیر، محمد اے، 'لاہور: جگہ اور لوگ'، مترجم ظہور چوہدری، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۹۶ تا ۱۱۹

کامران، طاہر، 'جدوجہدِ آزادی میں پنجاب کا حصہ'، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۸۴ تا ۹۸

کامران، طاہر، 'رنجیب سنگھ کے بعد انتشار کا دور (۱۸۳۹ء۔۱۸۴۹ء)'، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۵۹ تا ۱۷۲

کوٹھاری، اجنی، 'اتھنی سٹی: نسلیت'، شمارہ ۱۳، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ص ۹۰ تا ۱۴۰

کوثر، سجاد، 'لاہور میں ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی میں کاشی کاری کا جائزہ'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۳۳ تا ۳۸

گرفن، سرلیپل ہنری، 'رنجیت سنگھ'، مترجم مولوی نظیر حسین فاروقی، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۷۴ تا ۳۱۵

گرے، سی / امجد محمود چودہری، 'ہاولاڈی ایویٹا بائبل'، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۴۷ تا ۸۲

گرے، سی، 'جین بپٹسٹ وینچورا، کاؤنٹ ڈی منڈی'، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۹۷ تا ۱۲۳

گرے، سی، 'جین فرانسوا ایلرڈ'، مترجم طارق عزیز

گلور، ولیم۔ جے، 'لاہور: سنہرے ماضی کا بیان'، مترجم امجد محمود چوہدری، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۳۹ تا ۸۵

گولاٹی، جی۔ ڈی، 'لاہور: تیرہویں اور چودہویں صدی میں'، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۴ تا ۳۲

گویل، ایس۔ آر، 'قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا مستقبل'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء ص ص ۷ تا ۲۸

گیریٹ، ایچ۔ ایل۔ او، 'لائٹنر گورنمنٹ کالج لاہور کا پہلا پرنسپل'، مترجم طارق عزیز، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۱۵۵ تا ۱۸۴

لنگ، ہینک ویس، 'سمندر پار کی تاریخ'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۳، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ص ۷ تا ۴۷

ماڑی والا، سی۔ ایل، 'سندھ میں انگریز فیکٹری'، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۰۱ء، ص ص ۱۶۰ تا ۱۸۲

ماڑی والا، سی۔ ایل، 'ہیٹن، اسمتھ اور سیڈلر کے وفود ہائے سندھ'، مترجم سعود الحسن خان، شمارہ ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء، ص ص ۹۹ تا ۱۱۸

مسرا، ماریہ، 'کیا برطانوی اپنی استعماری سلطنت کی زیادتیوں پر شرمندہ ہیں؟'، مترجم طارق عزیز سندھو، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۳۳ تا ۲۳۶

مغل، محمد اشرف، 'رنجیت سنگھ کی انگریز پالیسی'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۲۲۹ تا ۲۳۴

مکھیا، ہربنس، 'اردو غزل میں اختلاف یا جشنِ ناکامی'، مترجم رشید ملک، شمارہ ۱، ص ص ۲۷ تا ۹۷

مکھیا، ہربنس، 'زمانۂ وسطیٰ کا ہندوستان'، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ص ۷۱ تا ۹۳

مکھیا، ہربنس، 'فرقہ وارانہ تشدد اور تشخص کی تبدیلی'، مترجم رشید ملک، شمارہ ۴، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ص ۹۲ تا ۱۰۶

مکھیا، ہربنس، 'فرقہ واریت اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں تاریخ نویسی: نیا تعین'، مترجم رشید ملک، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۷ تا ۱۹

مکھیا، ہربنس، 'رام جنم بھومی اور بابری مسجد کا تنازعہ عہدِ وسطیٰ کی شہادت'، مترجم رشید ملک، شمارہ ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ص ۱۲۹ تا ۱۳۸

مکھیا، ہربنس، 'بھگتی تحریک کی آئیڈیالوجی: دادو دیال کا معاملہ'، مترجم رشید ملک، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ص ۸۳ تا ۹۸
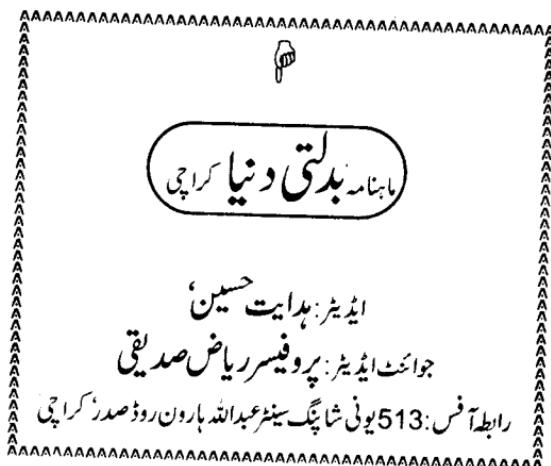
مکھیا، ہربنس، 'قبل از نوآبادیاتی دور کے ہندوستان پر مارکس کے خیالات: ایک جائزہ'، مترجم رشید ملک، شمارہ ۱۱، اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ص ۸۹ تا ۱۰۷

نندی، اشیش، 'قوم، ریاست اور باہمی عداوت'، مترجم طارق عزیز سندھو، شمارہ ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ص ۵۵ تا ۵۹

ونڈل، ڈاکٹر پرویز، 'لاہور چھاؤنی کا قیام اور شہر پر اس کے اثرات'، شمارہ ۱۲، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ص ۸۶ تا ۹۵

ونڈل، ڈاکٹر پرویز، 'رنجیت سنگھ کے دربار میں یورپین اثر و رسوخ'، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ص ۴۰ تا ۴۶

ہال، اسٹوارٹ، 'مغرب اور بقیہ دنیا'، مترجم ڈاکٹر مبارک علی، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۰۰ء، ص ص ۴۷ تا ۱۳۱

کتابی سلسلہ

دنیازاد

مدیر: ڈاکٹر آصف فرخی

115/B بلاک نمبر 5 گلشن اقبال، کراچی

ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی

ایڈیٹر: ہدایت حسین

جوائنٹ ایڈیٹر: پروفیسر ریاض صدیقی

رابطہ آفس: 513 یونی شاپنگ سینٹر عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

مزدور جدوجہد

ایڈیٹر: شعیب بھٹی

جدوجہد سینٹر 40 ایبٹ روڈ' لاہور

طبقاتی جدوجہد

ایڈیٹر: منظور احمد

105 منگل مینشن سیکنڈ فلور رائل پارک لکشمی چوک' لاہور

فون: 6316214

ماہانہ ادبی اخبار

روداد

نگران اعزازی: ڈاکٹر انعام الحق جاوید

734- اسٹریٹ 102- G-9/4 اسلام آباد

فون: 252899

فکشن ہاؤس کی تاریخ پر مستند کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ اور تحقیق	ڈاکٹر مبارک علی	180/-
تاریخ اور مورخ (ڈاکٹر کے ایم اشرف کی تحریریں)	ترتیب وتعارف: ڈاکٹر مبارک علی	100/-
جدید تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
یورپ کا عروج	ڈاکٹر مبارک علی	130/-
برطانوی راج (ایک تجزیہ)	ڈاکٹر مبارک علی	90/-
در در ٹھوکر کھائے	ڈاکٹر مبارک علی	100/-
تاریخ ٹھگ اور ڈاکو	ڈاکٹر مبارک علی	150/-
بدلتی ہوئی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	120/-
جاگیرداری	ڈاکٹر مبارک علی	150/-
مغل دربار	ڈاکٹر مبارک علی	100/-
تاریخ اور سیاست	ڈاکٹر مبارک علی	120/-
نجی زندگی کی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	90/-
تاریخ اور معاشرہ	ڈاکٹر مبارک علی	100/-
اکبر کا ہندوستان	ڈاکٹر مبارک علی	100/-
جہانگیر کا ہندوستان	ڈاکٹر مبارک علی	80/-
تاریخ اور دانشور	ڈاکٹر مبارک علی	150/-
تاریخ کھانا اور کھانے کے آداب	ڈاکٹر مبارک علی	80/-
سندھ: خاموشی کی آواز	ڈاکٹر مبارک علی	150/-
آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان	ڈاکٹر مبارک علی	90/-
برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ	ڈاکٹر مبارک علی	80/-
علماء اور سیاست	ڈاکٹر مبارک علی	90/-
تاریخ اور عورت	ڈاکٹر مبارک علی	90/-
تاریخ اور فلسفہ تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	150/-
تاریخ کی روشنی	ڈاکٹر مبارک علی	90/-

تاریخ شناسی	ڈاکٹر مبارک علی	125/-
شاہی محل	ڈاکٹر مبارک علی	150/-
المیہ تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	180/-
اچھوت لوگوں کا ادب	ڈاکٹر مبارک علی	80/-
تاریخ کے بدلتے نظریات	ڈاکٹر مبارک علی	100/-
تاریخ اور مذہبی تحریکیں	ڈاکٹر مبارک علی	90/-
غلامی اور نسل پرستی	ڈاکٹر مبارک علی	80/-
تاریخ کیا کہتی ہے	ڈاکٹر مبارک علی	90/-

بین الاقوامی شہرت یافتہ مصنف ہیرلڈلیم کی شاہکار کتابیں

صلاح الدین ایوبی	ہیرلڈلیم	300/-
عمر خیام	ہیرلڈلیم	200/-
منگول اوران کا سردار	ہیرلڈلیم	100/-
سلیمان عالی شان	ہیرلڈلیم	250/-
ہینی بال	ہیرلڈلیم	170/-
بابر	ہیرلڈلیم	160/-
نورمحل	ہیرلڈلیم	160/-
چنگیز خان	ہیرلڈلیم	100/-
سکندراعظم	ہیرلڈلیم	240/-
امیر تیمور	ہیرلڈلیم	180/-
تاتاریوں کی یلغار	ہیرلڈلیم	200/-
قسطنطنیہ	ہیرلڈلیم	160/-
تین عظیم فاتح	ہیرلڈلیم	500/-
تین عظیم جنگجو سپہ سالار	ہیرلڈلیم	500/-
تین عظیم ڈکٹیٹر	مرتب: اسلم کھوکھر	500/-

ڈیل کارنیگی کی شاہکار کتابیں

کلیات ڈیل کارنیگی	مرتب: اسلم کھوکھر	600/-
پریشان ہونا چھوڑیے جینا شروع کیجئے	ڈیل کارنیگی	200/-
میٹھے بول میں جادو ہے	ڈیل کارنیگی	150/-
39 بڑے آدمی	ڈیل کارنیگی	130/-
کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں	ڈیل کارنیگی	100/-
گفتگو اور تقریر کا فن	ڈیل کارنیگی	100/-
مانیں نہ مانیں	ڈیل کارنیگی	100/-
ابراہام لنکن	ڈیل کارنیگی	130/-

☆☆☆☆☆